علمی
تاجِ اُردو
ڈاکٹر علی محمد خاں
ڈاکٹر اختر شمار
ڈاکٹر نورین کھوکھر

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو

کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

یہ کتاب میں اپنے پیارے بھائی اور دوست

حسنین سیالوی

کو پیش کرتاہوں۔جو کہ اردو ادب کے طالب علموں کی پیاس بجھارہا ہے بغیر کسی اجرت کے۔اس کتاب کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ وٹس ایپ کے ایڈمن ہیں۔وہ یہ کتاب سب طالب علموں کو سینڈ کریں گے۔

اردو ادب کے دونام ایسے ہیں جو کہ پی پی ایس سی کے کمیٹی کے ممبر ہیں جو پیپر تیار کرتے ہیں۔ان کے نام ہیں ڈاکٹر علی محمد خاں اور دوسرا نام ہے ڈاکٹراشفاق احمد ورک ہے ان کی تین کتابیں ہیں جن سے زیادہ پیپر آتا ہے

۔کلید اردو

۔تاج اردو

۔میزان اردو

ان میں سے ایک سب کے پاس ہے کلید اردو باقی دو کسی کے پاس نہیں ہیں اور اب تاج اردو میں نے تیار کردی ہے میزان اردو بھی جلد تیار کردی جائے گی

عبدالرؤف کھوکھر

انتساب

پروفیسر ڈاکٹر پیٹر ایچ آرماکوسٹ

سابق ریکٹر ایف سی کالج، یونیورسٹی، لاہور

کے نام جنھوں نے انگریز (امریکن) ہوتے

کے باوجود یونیورسٹی میں بی ایس آنرز کورس کے لیے پاکستان کی

قومی زبان ہونے کے ناتے اردو کو لازمی کورس قرار دینے کے

علاوہ اردو کے مزید چند کورسز متعارف کرائے۔

قومی زبان

کہیں ریشم، کہیں اطلس، کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ نفاست، یہ ادا
جی میں آتا ہے، ترا نام میں اُردو رکھ دوں

(ڈاکٹر اشفاق احمد ورک)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔)

پیشِ لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو افضل ترین مخلوق بنایا اور اس کو بعض ایسی صلاحیتیں ودیعت کیں، جن سے دوسری مخلوقات محروم ہیں۔ انھی میں سے ایک صلاحیت قُوّتِ نُطق ہے، جو پُرمعنی آوازوں اور لفظوں کے ذریعے آزمائی جاتی ہے۔ انسانی تہذیب و معاشرت نے ترقی کے جتنے بھی زینے طے کیے ہیں، اس میں زبان نہ صرف ہر قدم اٹھانے میں مدد رہی ہے بلکہ اس نے رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ آج عہدِ پارینہ کا ایک ایک لمحہ زبان کے سہارے زندہ جاوید اور علم وفن کی قدم بہ قدم ترقی زبان کی محتاج ہے۔

انسانی فکر و احساس کی باریکیاں اور تخیل وتصور کی پیچیدگیاں زبان کا سہارا لیے بغیر حل نہیں ہوسکتیں۔ علم کے حصول و ابلاغ میں زبان نہایت مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم وتعلم کے تمام اقدامات کی یہ طریقِ احسن تکمیل کے لیے زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔ کسی طالب علم کو عالم ومحقق بننے کے لیے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ طلبِ صادق رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ اُسے زبان پر کامل عبور حاصل ہو۔

ہر آبرومند قوم کی کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے دوسری قوموں پر فوقیت دیتی اور مشرف وممتاز کرتی ہیں۔ ان خصوصیات کو قومی شعائر کا نام دیا جاتا ہے۔ زبان ایک بہت بڑا قومی شعار ہے۔ ہر قوم کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ جو اس کے مخصوص تہذیبی مزاج کی آئینہ دار اور قومی فکر و ذہن کی محافظ ہوتی ہے، چناں چہ قوم پر لازم آتا ہے کہ اپنی زبان کا احترام کرے۔ احترامِ زبان کا پہلا قرینہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے محبت اور اسے بولنے میں فخر محسوس کیا جائے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ زبان کی صحت وصفائی کا لحاظ رکھا جائے اور اسے سنوارنے نکھارنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ زبان کے علمی وادبی سرمائے میں قابلِ قدر تخلیقی اضافے کیے جائیں نیز زبان کی ترویج واشاعت کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، عربی، فارسی، ترکی، جاپانی اور چینی زبانوں کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان میں بعض زبانیں خاص طور پر جاپانی اور چینی بہت اُدق ہیں، اس کے باوجود آج انھی قوموں نے اپنی قومی زبان میں عروج کی بنا پر اقوامِ عالم سے اپنی لیاقت کا لوہا منوایا ہے۔

اردو کا یہ منصب ہے کہ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ حضرت قائداعظم ؒ نے، جن کی مساعی کی بنا پر آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، اردو کے اس منصب کا برملا اعتراف واعلان فرمایا تھا۔ آج اردو اپنی خصوصیات کی بنا پر زبردست ترقی کر چکی ہے۔ پاکستان کا تمام تہذیبی وعلمی وادبی ورثہ اردو میں محفوظ ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی سے اس کا قریبی رشتہ ہے اور یہ ان زبانوں سے مسلسل اخذ واستفادہ کر رہی ہے، اسی بنا پر اس وقت اردو کا، دنیا بھر میں انگریزی کے بعد، حلقۂ اثر سب سے زیادہ ہے اور آج اردو نہ صرف سارک کے ممالک بلکہ دنیا بھر میں انگریزی کے بعد ابلاغ اور رابطے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج دنیا کی ساڑھے چھے ارب آبادی میں سے ڈیڑھ ارب لوگوں کی زبان اردو ہے اور اس میں

تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

زندہ زبان کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت کی ضرورتوں کے مطابق لب و لہجے اور الفاظ و معانی کے استعمال میں لچک رکھتی ہے، دوسری زبانوں پر اثر ڈالتی اور خود بھی اثر قبول کرتی ہے۔ اس کلیے کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زمان و مکان کی تبدیلیوں کو بلا توقف اپنے اندر سمو لینے کی سکت رکھتی ہے، اس طرح اردو کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، چناں چہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔

ان سب عوامل کی وجہ سے ہمارے لیے اس زبان کا پڑھنا اور سیکھنا لازمی امر ہے۔ اردو نہ صرف پاکستان میں رابطے کی واحد زبان ہے بلکہ یہ ہماری شناخت ہے۔ ہم نے ان سب باتوں کے پیشِ نظر اپنے طلبہ کے لیے ''تاجِ اردو'' کی صورت میں یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ ''تاجِ اردو'' نہ صرف پنجاب یونیورسٹی، ایف سی کالج یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کالج برائے طالبات یونیورسٹی اور ان سے ملحقہ اداروں کے علاوہ پنجاب بھر کی تمام یونیورسٹیوں کے بی ایس آنرز کے طلبہ و طالبات کے لیے اردو نصاب بلکہ یہ ان کے جامع امتحان (Comprehensive Examination) کی بخوبی کفالت کرتی ہے بلکہ ایسے طلبہ کے لیے بھی جنھیں کسی نوعیت کا امتحان تو نہیں دینا بلکہ وہ اپنی گفت گو کو دل آویز بنانے کے لیے اردو سیکھنا چاہتے ہیں، اکسیر ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے: ''مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں: غالب، اردو اور تاج محل۔'' چناں چہ ہم نے اردو کی زیرِ ترتیب کتاب کا نام ''تاجِ اُردُو'' رکھا ہے۔ امید ہے ہماری اس کاوش کو سراہا جائے گا۔

اب جب کہ ''تاجِ اردو'' طباعت کے آخری مراحل میں ہے ہم پہلے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور پھر کچھ دوستوں کا شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتے ہیں، جن میں ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اور ڈاکٹر عتیق انور کے علاوہ ڈاکٹر محمد طاہر، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کے نام شامل ہیں۔ ان دوستوں نے ہمیں ہر مرحلے پر اپنے مفید مشوروں سے نوازا بلکہ قلمی معاونت بھی کی۔ اس موقع پر ہم علمی کتاب خانہ کے منتظمِ اعلیٰ جناب جاوید اختر کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں، جن کی دلچسپی سے یہ کتاب خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ طلبہ تک پہنچی۔ ان سب دوستوں سے ہماری گزارش ہے کہ:

آؤ اس کے شکریے میں مل کے سب شاد ہوں
تا کہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ڈاکٹر علی محمد خاں

پروفیسر آف اردو (ریٹائرڈ)، ایف سی کالج، یونیورسٹی، لاہور

15 اپریل 2021ء

اردو ہے جس کا نام

محققین نے اردو کی ابتدا، آغاز اور اس کے ماخذ و منبع کے بارے میں کئی دل چسپ اور متضاد نظریے پیش کیے ہیں جن سے اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ زبان برِصغیر میں، ہند آریائی زبانوں کے گروہ کے ارتقا، عمل و ردِعمل اور ان پر فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات سے وجود میں آئی۔ اردو کے اولین آثار دسویں صدی عیسوی میں اس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب مسلم فاتحین کو یہاں کے مقامی منتظمین، تجار، علما، صوفیہ، مبلغین، ان کے اہل و عیال اور دوسرے مقامی لوگوں سے ملنے جلنے اور حکومتی اور دیگر کاروبار چلانے کی ضرورت پیش آئی۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن بول چال اور روزمرہ کاروبار کے لیے یہ نئی زبان (جو بعد میں اردو کہلائی) ہی استعمال ہوتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آہستہ آہستہ نکھرتی اور سنورتی رہی اور دیگر زبانوں اور بولیوں کے الفاظ بھی جذب اور شامل کرتی رہی۔ اس طرح سے اس زبان میں وسعت اور لچک پیدا ہوئی اور یہ برِصغیر کے ایک بڑے علاقے میں جہاں پہلے صرف چند علاقائی بولیاں بولی جاتی تھیں، رابطے کی زبان بن گئی۔ یہ سب فطری اور خود کار طریقے سے ہوا، یہاں تک کہ مغلیہ عہد کے اختتام تک یہ زبان اس قدر ترقی کر چکی تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے عمال و حکام کو سکھانے اور امورِ مملکت میں استعمال کرنے کے لیے فارسی کی جگہ اسی زبان کا انتخاب کیا۔

''اردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں لشکر یا لشکر گاہ۔ مغلوں کے دور میں لشکر، اس سے متعلق آبادی اور بازار کو ''اردو'' کہا جاتا تھا اور بادشاہی قلعہ اور اس کے متعلقات کو ''اردوئے معلیٰ''۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک ایسے علاقوں میں بولی جانے والی زبان کو ''اردو زبان'' یا ''زبانِ اردو'' کہا جانے لگا تھا۔ اس سے پہلے یہی زبان مختلف علاقوں اور ادوار میں، ہندی، ہندوستانی، دکنی، گجراتی، ریختہ اور دوسرے ناموں سے بھی موسوم رہی۔ انیسویں صدی میں اس زبان کے لیے واضح طور پر ''اردو'' کا نام استعمال ہونا شروع ہوا، جب کہ یورپی مصنفوں میں سے کچھ اس کو ''ہندوستانی'' کے نام سے پکارتے رہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ: ''تشکیلِ ارضِ پاک میں اردو کا ہاتھ ہے''۔ ہندوؤں کی اکثریت سمجھتی تھی کہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی زبان اردو ہے۔ معمارِ پاکستان حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اردو کی اہمیت کا احساس تھا اور وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ جس قوم کی زبان ایک نہیں، اس کا دل بھی ایک نہیں اور یہ کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کی شیرازہ بندی اس زبان کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اردو زبان ہے جسے برِصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے، اسے پاکستان کے ایک سرے سے

دوسرے تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب ترین ہے۔ یہ بات بھی اردو کے حق میں جاتی ہے اور یہ بہت اہم ہے کہ بھارت نے اردو کو دیس نکالا دے دیا ہے اور حتیٰ کہ اردو رسم الخط کو بھی ممنوع قرار دیا ہے، البتہ پاکستان کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔''

(بحوالہ'' قائداعظم ؒ اور قومی زبان کا پس منظر'' ماہنامہ'' قومی زبان'' کراچی دسمبر 1976ء)

ان تمام تاریخی حوالوں کے بعد اردو زبان کی اہمیت اور اس کی افادیت بالکل واضح ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم قائداعظم ؒ کی اس دور اندیشی کو، جس میں انھوں نے اردو کی اہمیت کو اجاگر کیا، من حیث القوم اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی کوششوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، خاص طور پر ہماری نوجوان نسل پر یہ فرض اور بھی زیادہ عائد ہوتا ہے۔

بفضلِ تعالیٰ اردو اس وقت دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو (UNESCO) کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں چینی اور انگریزی کے بعد تیسری بڑی زبان اردو ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے لوگ دنیا کے تقریباً ہر خطے اور ہر ملک میں موجود ہیں اور اس کے حلقۂ اثر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ انگریزی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے اور یہ عملاً ملک بھر میں واحد رابطے کی زبان ہے جو قراقرم و طورخم کے پہاڑوں سے لے کر کراچی و گوادر کے ساحلوں تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بھارت، بنگلہ دیش اور سارک کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی مقبولیت کچھ کم نہیں۔ یہاں کے بیشتر باشندے بالخصوص شہری آبادیوں میں رہنے والے اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد بھی کروڑوں میں ہے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ و مشرق بعید کے تمام ممالک اور یورپ، امریکہ، کینیڈا، افریقہ اور آسٹریلیا کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دنیا کی بیشتر معروف یونیورسٹیوں میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں جن میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد نمایاں طور پر روز بروز بڑھ رہی ہے۔ لطف یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کی یونیورسٹیوں کے علاوہ دنیا میں کئی اور یونیورسٹیوں میں اردو میں پی ایچ۔ ڈی تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں دوسرے ملکوں سے طلبہ اردو پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی ساڑھے چھے ارب آبادی میں اردو جاننے اور بولنے والوں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ ارب سے متجاوز ہے جو اردو کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بی بی سی کی اردو سروس سے وابستہ معروف براڈ کاسٹر جناب رضا علی عابدی اپنی

کتاب "اردو کا حال" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے دور افتادہ علاقے دیکھے ہیں مگر ایک عجیب بات دیکھی۔ میں جہاں کہیں بھی پہنچا، اردو مجھ سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ ہمالیہ کے پچھواڑے لداخ میں ایک بڑے نالے جیسے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں وہاں پہنچا، جس کے آگے تبت ہے۔ میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچا جس کا نام "اُپسی" تھا۔ مجھے دیکھ کر گاؤں والے میرے گرد جمع ہو گئے۔ جی چاہا ان سے باتیں کروں مگر خیال آیا کہ خدا جانے کون سی زبان بولتے ہوں گے؟ مگر میرے "السلام علیکم" کہنے کی دیر تھی کہ اب جو وہ بولے تو بالکل میری ہی جیسی اردو بولے۔ ان میں سے کسی نے مدرسے کی صورت بھی نہیں دیکھی، لکھنا پڑھنا نام کو بھی نہیں آتا، مگر اردو روانی سے بول رہے تھے جیسے ان میدانوں میں عمر گزار کر آئے ہوں۔ اس گفت گو میں اردو روزمرہ اور محاورہ پوری آن بان سے کارفرما تھا۔ بات میں سلاست تھی، روانی تھی، لفظوں کی نشست و برخاست زبان دانی کے تمام اصولوں پر پوری اترتی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ چین کی سرحد پر رہنے والے یہ اَن پڑھ دیہاتی نہیں بول رہے ہیں، اردو کا اعجاز بول رہا ہے۔ یہ کیسا چمتکار ہے کہ ہمالیہ کے اس پار جہاں مون سون گھٹائیں بھی نہیں پہنچ پاتیں، وہاں اردو کی جھڑی لگی ہے۔"

عام بول چال کی زبان ہونے کے علاوہ آج پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور سائنسی اور علمی و ادبی شعبوں میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ صحافتی میدان میں اردو کا سکہ چلتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کا گراف تیزی سے اوپر کی جانب جا رہا ہے۔ آج اردو نہ صرف دنیا بھر میں ہماری شناخت اور آبرو ہے بلکہ قوم کے شیرازے کو مضبوط کیے ہوئے ہے اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان میں مقابلے کے تمام امتحانات کے لیے اور عدالتی زبان بھی اردو ہو گی۔

پروفیسر ڈاکٹر علی محمد خاں
پروفیسر آف اردو (ریٹائرڈ)، ایف سی کالج، یونیورسٹی لاہور
15۔ اپریل 2021ء

❀❀

پہلا باب

اُردو شاعری کا ارتقا

حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق اُردو شاعری کا آغاز غزنوی عہد میں فارسی کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان سے ہوا جو لاہور کے رہنے والے تھے۔ اگرچہ اُن کا نہ تو کوئی شعر ملتا ہے، نہ اس زبان کو اُس زمانے میں اُردو کہا جاتا تھا تاہم یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسعود سعد کے دَور کے کچھ ہی مدت بعد امیر خسرو کے کلام کا کچھ حصہ ایسا ملتا ہے جو فارسی اور ہندی سے مل کر ترتیب پاتا ہے۔ امیر خسرو کے بعد شمالی ہند میں کوئی قابلِ ذکر شاعر تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ اُدھر دکن میں وہاں کے مسلمان بادشاہوں نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مقامی زبان کی حوصلہ افزائی کی اور اس شاعری کی پرورش کی جسے دکنی کہا جاتا تھا اور آج جسے ہم اُردو شاعری کا نقشِ اوّل کہتے ہیں۔ دکن میں شاعروں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جس میں بادشاہ بھی ہیں، صوفی بھی اور عام شہری بھی۔ قلی قطب شاہ نہ صرف قطب شاہی خاندان کے اہم بادشاہ تھے بلکہ انھوں نے اردو میں پچاس ہزار اشعار چھوڑے ہیں اور تمام محققین کے مطابق اردو غزل کے باوا آدم قرار پاتے ہیں۔ اُس زمانے میں اور بھی بہت سے شعرا معروف ہوئے۔ ان میں سب سے اہم نام ولی دکنی کا ہے جس کی شاعری نے شمالی ہند میں اردو غزل کی تحریک کا آغاز کیا جس نے مختلف مرحلوں سے گزر کر اُردو زبان کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے اسی لیے ولی کو آدم الشعرا کہا ہے۔ ولی پہلے دکن میں مقیم تھے۔ مغل حکمران محمد شاہ کے زمانے میں انھوں نے دلّی کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران میں انھوں نے بقول بعض، ایک صوفی بزرگ سعد اللہ گلشن کی فرمائش پر اپنی شاعری کو شمالی ہند کی زبان کے محاورے کے مطابق تخلیق کرنا شروع کیا۔ اب تک شمالی ہند میں فارسی شاعری کا رواج تھا۔ دلّی کے لوگوں نے ولی کی شاعری سُنی تو گویا پہلی مرتبہ انھوں نے اس زبان میں اپنے جذبات کی عکاسی دیکھی جسے وہ کئی سو سال سے بول رہے تھے۔ چنانچہ نوجوان شاعروں کی ایک بڑی تعداد فارسی سے کنارہ کش ہو کر اُردو کی طرف متوجہ ہوئی جسے اس زمانے میں عام طور سے ریختہ کا نام دیا گیا۔ نوجوانوں سے قطع نظر پرانے اور عمر رسیدہ اساتذہ نے بھی ریختہ میں طبع آزمائی کی کوشش کی جن میں خان آرزو اور میرزا مظہر جانِ جاناں کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

خان آرزو (سراج الدین علی خاں المعروف بہ خان آرزو، میر تقی میر کے خالو تھے۔) مظہر جانِ جاناں اور ان کے دیگر ہم عصر خود تو فارسی کو خیر باد نہ کہہ سکے مگر اپنے عقیدت مندوں اور شاگردوں کی نئی نسل میں ریختہ گوئی کا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ اس نئی نسل میں جن شاعروں نے آگے چل کر استادوں کا مرتبہ پایا، ان میں شاہ حاتم اور شاہ مبارک آبرو بہت مشہور ہوئے۔ شمالی ہند میں اُردو شاعری کا یہ پہلا دَور تھا۔ اس دَور کو ایہام گوئی کا دور بھی کہتے ہیں۔ ''ایہام گوئی'' شاعری کا ایک ایسا انداز ہے جس میں شاعر لفظوں کی بازی گری سے اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب شاعری لفظوں کا کھیل بن جائے تو ظاہر ہے جذبہ اور تاثیر

مفقود ہو جاتا ہے۔ ایہام گوئی وبا کی طرح اُردو شاعری میں پھیل گئی مگر شاہ حاتم اور میرزا مظہر جانِ جاناں کے ایک ہونہار مگر جواں مرگ شاگرد انعام اللہ خاں یقین نے بروقت اس کی روک تھام کی جرأت کی۔ شاہ حاتم نے اپنے ضخیم دیوان میں سے ایسے تمام اشعار خارج کر دیے جو ایہام کی ذیل میں آتے تھے اور ایک مختصر دیوان مرتب کیا جس کا نام ''دیوان زادہ'' رکھا۔

اُردو شاعری کا دوسرا دَور ہر اعتبار سے سنہری دَور کہلایا جا سکتا ہے۔ اِس دَور میں فارسی کی تمام مروجہ اصناف اُردو میں منتقل ہو گئیں اور اس ہنرمندی کے ساتھ کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کام اس زبان میں پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ غزل اور مثنوی کی روایت دکن میں پہلے بھی موجود تھی، اس لیے ان دونوں اصناف نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ یہ دَور دیگر شاعروں کے علاوہ خاص پہچان سے تین شاعروں کے سبب بڑا اہم تسلیم کیا گیا ہے: خواجہ میر درد، میرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر۔

خواجہ میر درد ایک باعمل صوفی تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری تصوّف کی شاعری کا بہترین نمونہ ثابت ہوئی۔ میرزا محمد رفیع سودا نے غزل کے ساتھ قصیدے (مدحیہ و ہجویہ) اور مرثیے پر خاص توجہ کی۔ میر تقی میر نے غزل اور مثنوی کو آگے بڑھایا۔ غزل تو میر صاحب کی خاص چیز ہے۔ غزل کے دامن کو انھوں نے اتنا وسیع کیا کہ آج تک غزل کہنے والے شاعران کی خوشہ چینی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میر صاحب کی پیروی پر فخر کرتے ہیں۔

ادھر دلّی کے گلی کوچے درد، سودا، میر اور ان کے دیگر معاصرین کے کلام سے گونج رہے تھے، اُدھر سیاسی اعتبار سے دلّی کی مرکزی حکومت روز بہ روز انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ پورے ملک میں مختلف طاقتوں نے زور پکڑ لیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی جڑیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ لوگوں نے شہر سے نکلنا شروع کر دیا تھا۔ جو صوبے خود مختار ہو رہے تھے، اُن میں سے اودھ کا صوبہ اہلِ دہلی کے لیے خاص طور سے جائے پناہ ثابت ہو رہا تھا۔ فیض آباد اس نئی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ دلّی کے اکثر و بیشتر شاعر فیض آباد منتقل ہونے لگے۔ کچھ مدّت کے بعد لکھنؤ دارالحکومت ہوا تو مزید شاعر دلّی سے آ کر لکھنؤ میں آباد ہو گئے۔ سودا اور میر بھی لکھنؤ میں آ بسے۔ ان کا دَور ختم ہو رہا تھا اور اب شاعری نوجوان نسل کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں میر حسن، مصحفی، انشا اور جرأت خاص طور سے مشہور ہوئے۔ یہ فضا نئی تھی، یہاں زندگی پُرسکون تھی۔ قنوطیت کی جگہ رجائیت نے لے لی۔ شاعری بھی ان عناصر سے متاثر ہو رہی تھی۔ سیّد انشا اور جرأت اس دَور کے خاص نمائندے ہیں۔ مصحفی کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی تقریباً نصف زندگی دلّی میں بسر ہوئی تھی اور ان کی شاعری کی بُنیاد دلّی کی فضا میں اٹھی تھی تاہم وہ نئے زمانوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں نظیر اکبر آبادی نے عوامی شاعری میں الگ سماں باندھ رکھا تھا۔ ایک طویل عرصے تک ان کے عوامی لب و لہجے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا لیکن آج انھیں اردو کا پہلا حقیقت شناس اور ترقی پسند شاعر گردانا جاتا ہے۔

انشا، جرأت اور مصحفی غزل میں اپنے ہُنر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میر حسن نے غزل کے بجائے مثنوی کی طرف خاص توجہ کی۔ گیارہ مثنویاں کہیں جن میں سے ان کی ایک مثنوی، جس پر انھوں نے خاص محنت کی، ''سحر البیان'' ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے سحر البیان اب تک اُردو کی بہترین مثنوی تسلیم کی گئی ہے۔

انسان فطرتاً ہر وقت ہشاش بشاش رہنا بھی تو پسند نہیں کرتا۔ غزل اور مثنوی اس وقت لوگوں کی کامرانیوں اور مسرتوں کی ترجمان بن رہی تھیں تو زندگی کی بے ثباتی اور اجاڑ پن کی طرف بعض ایسے شاعروں کی توجہ مبذول ہوئی جنھوں نے اہلِ بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مصائب کو اپنے مصائب جانا اور مرثیے کی طرف دھیان دیا۔ اگرچہ مرثیہ اُردو شاعری کے آغاز سے ایک اہم صنف کی حیثیت رکھتا تھا اور مختلف مرحلوں سے گزر کر سودا تک پہنچا تھا۔ سودا نے مرثیے کو ایک واضح شکل دینے کی کوشش کی اور مجالسِ عزا سے باہر کے سامعین کا ایک حلقہ پیدا کر لیا۔ سودا کے بعد کچھ مدّت تک قابلِ ذکر شاعروں کی توجہ عام طور سے غزل کی طرف رہی ہے۔ میر حسن، جرأت اور مصحفی کے بعد کی نسل نے اس رشتے کو، جو ذرا کمزور ہو چلا تھا، مضبوطی کے ساتھ پکڑا اور پھر اس میں وہ تمام صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جو کسی بڑی شاعری میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ میر حسن کے صاحبزادے میر مستحسن خلیق، میر ضمیر، فصیح اور میاں دلگیر نے ہر طرح سے مرثیے کی زمین ہموار کر دی تھی۔

لکھنؤ کا یہ زمانہ، جس کا آغاز فیض آباد سے ہوتا ہے، نہ صرف اردو شاعری کے لیے بلکہ اردو زبان کے لیے بھی نہایت مبارک زمانہ تھا۔ انشا، مصحفی، جرأت، میر حسن بزم سے رخصت ہو رہے تھے اور نئی نسل محفل میں اپنے قدم جما رہی تھی، جس کی نمائندگی آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کر رہے تھے۔

ہر چند امام بخش ناسخ لاہور سے لکھنؤ گئے تھے مگر انھوں نے زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ ان کی زبان سے نکلا ہر لفظ مستند مانا جاتا تھا۔ زبان کو بنانے سنوارنے میں جتنا شعوری کام ناسخ نے کیا کسی اور سے نہ ہو سکا۔ وہ ایک شاعر سے بڑھ کر فنِ شعر کے استاد تھے۔ ان کے ایک ہم عصر، مصحفی کے قابلِ فخر شاگرد خواجہ حیدر علی آتش ہیں۔ آتش، علم میں تو ناسخ کے مقابلے میں کم تھے مگر شاعری میں ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ لکھنؤ کے دبستان کے واحد نمائندہ شاعر ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ زبان کی تراش خراش شعر کو نقصان پہنچا رہی تھی مگر ناسخ اور ان کے مقلدین کی پوری توجہ اصلاحِ زبان پر مرکوز تھی۔ آتش نے نہایت پامردی سے شاعری کا وقار بحال کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے مگر ساتھ ہی ساتھ اصلاحِ زبان کی تحریک سے بھی غافل نہ رہے۔ دوسری طرف مرثیے کی روایت زیادہ روشن ہو رہی تھی۔ انیس و دبیر اس میدان کے شہسوار ہیں۔ ان دونوں نے مرثیے کے تمام امکانات کو جو پوری انسانی زندگی پر محیط تھے، اپنی شاعری میں سمو دیا اور مرثیے کے بارے میں اس الزام کی ہمیشہ کے لیے تردید کر دی کہ مرثیہ محض کسی مذہبی عقیدے کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ انیس و دبیر نے شاعری کی اعلیٰ ترین نزاکتوں کو استعمال میں لاتے ہوئے مرثیے کو اس کے ارفع ترین مقام پر پہنچا دیا۔ مرثیے کے ساتھ سلام اور رُباعی کو بھی اس دَور میں فروغ حاصل ہوا۔

آتش و ناسخ اور انیس و دبیر نے اُردو شاعری کو اس جگہ پہنچا دیا تھا کہ لکھنؤ میں اب مزید استعداد نہ رہی تھی کہ کوئی نیا رخ اختیار کرتا۔ ان باکمال شاعروں کے شاگردوں نے اساتذہ کی پیروی ہی پر قناعت کی۔ البتہ آتش کے ایک ہونہار اور جواں مرگ شاگرد نے قصۂ گل بکاؤلی کو ''گلزارِ نسیم'' کے نام سے اس عمدگی سے رقم کیا کہ مثنوی کی تاریخ میں وہ بھی میر حسن کے ہم رکاب ہو گئے۔ اُردو شاعری میں غزل کے بعد سب سے بڑا ذخیرہ مثنوی کا ہے۔ دکنی عہد میں دُور نہ جائیں تو بھی سراج اورنگ آبادی اور دلی

میں خواجہ میر اثر کے نام میر حسن سے پہلے اور نواب میرزا شوق لکھنوی اور حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے نام نسیم لکھنوی کے بعد ایسے نہیں کہ آسانی سے نظر انداز کیے جاسکیں۔

1856ء میں اودھ کی سلطنت ختم ہوگئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس سلطنت کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو کلکتے میں مٹیا برج میں نظر بند کر دیا اور لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ لکھنؤ اُجڑ گیا۔ اربابِ ہنر اسی طرح سے پناہ تلاش کرنے کے لیے شہر شہر پھرنے لگے جس طرح کبھی دہلی کے اربابِ ہنر در بہ در ہوئے تھے۔

ادھر جب لکھنؤ میں آتش و ناسخ کے چراغ روشن تھے، ادھر دِلّی میں بھی ادب کی آخری محفل سجائی جارہی تھی۔ بہادر شاہ ظفر، ذوق، غالب اور مومن کا ظہور ہو چکا تھا۔ سودا نے اردو قصیدے کو فارسی قصیدے کے برابر لانے کی سعی کی تھی۔ ذوق نے ان کی اس کوشش کو مزید اعتبار بخشا۔ مومن خاں حُسن پرست اور عشق پیشہ انسان تھے۔ ان کی غزل انسانی نفسیات کا ایک نہایت خوبصورت اظہار ہے۔ معاملہ بندی، کہ شمالی ہند میں جس کے سب سے بڑے علمبردار جرأت تھے، مومن خاں کے یہاں آ کر مہذب ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ تھے۔ وہ درویش مزاج انسان تھے، ان کی شاعری اُردو کی اخلاقی شاعری اور شعری ہُنر مندی کے بہترین نمونوں میں شامل ہوسکتی ہے۔ ذوق اور مومن کے اُستاد شاہ نصیر اپنے زمانے کے بڑے اُستاد تھے۔ وہ اُستاد ناسخ اور لکھنوی اندازِ شعر سے متأثر تھے۔ شاہ نصیر کے ذریعے لکھنؤ کا انداز دلّی میں آیا۔ دلّی میں ان کے شاگردوں نے اس انداز کو آگے بڑھایا مگر غالب نے ناسخ کے طرز کو پسند کرنے اور گاہے گاہے اس طرز کو اختیار کرنے کے باوجود اپنی فطری صلاحیتوں کے بل بوتے پر شعری ادب میں جدت اور ندرت کی بنیاد ڈالی:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب نے اُردو شاعری کے قدیم انداز کو ختم کر دیا اور نئے طرز کو اختیار کرلیا۔ اُردو کی جدید شاعری کے چشمے غالب کی شاعری سے پھوٹتے ہیں اور انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل بلکہ خود انسانی زندگی کی رنگارنگی، ہما ہمی اور بوقلمونی ان کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔

1857ء کا سال بَرِصغیر کے لیے ایک ایسا حادثہ لے کر آیا جس نے یہاں کی ہزار سالہ تہذیب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لکھنؤ پہلے ہی ویران ہو چکا تھا، اب دِلّی بھی اُجڑ گئی مگر قدرت نے رام پور اور حیدر آباد دکن کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے دروازے ان شاعروں پر کھول دیے خصوصاً رام پور، یہاں کے نواب یوسف علی خاں ناظم شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے لکھنو اور دِلّی سے نکلنے والے اکثر بے سروسامان شاعروں کو پناہ دی۔ ان شاعروں میں داغ، امیر مینائی اور جلال لکھنوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

یہ دَور دراصل نواب میرزا داغ کا دَور ہے، داغ نے معاملہ بندی کو مومن کی ثقاہت اور دردمندی سے نکال کر شوخی اور بانکپن

عطا کیا۔ داغ کی زبان خالص اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ امیر مینائی پہلے قدیم طرز میں شعر کہہ رہے تھے۔ داغ کے اثرات سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ اپنا انداز بھول گئے۔ جلال نے اپنا سارا زور، زبان وقواعدِ زبان کی پابندی پر صرف کر دیا۔ ان کا کلام ممکن ہے قواعد کے اعتبار سے بے عیب ہو مگر شاعری کی رمق اس میں بہت کمزور ہے۔

یہ طرزِ غزل گوئی ابھی جاری تھی کہ لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نئے طرز کے مشاعروں کی بُنیاد ڈالی۔ یہ زوال پذیر غزل کے خلاف بغاوت تھی۔ آزاد نے اس تحریک کے حق میں اور اپنے مقصد کی وضاحت کے سلسلے میں کئی لیکچر بھی دیے۔ انھوں نے اس زمانے کی شاعری کو ایک قومی سانحہ قرار دیا اور شاعروں کو خیالی اور داخلی زندگی سے نکل کر خارجی دُنیا کے مسائل سے آنکھیں چار کرنے کی تلقین کی۔ تقریباً اسی زمانے میں خواجہ الطاف حسین حالی بھی ملازمت کے سلسلے میں لاہور آ گئے۔ حالی غالب کے شاگرد، شیفتہ سے تربیت یافتہ اور کلاسیکی غزل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ اُس زمانے کے واحد قابلِ ذکر شاعر تھے جو داغ کے اثرات سے محفوظ رہ گئے تھے۔ یقیناً اس کا باعث کچھ اُن کی سلامتیِ طبع، شیفتہ کی صحبت اور کچھ غالب کی شاگردی تھا۔ یوں بھی حالی کے مزاج میں ایک ایسی لچک تھی کہ وہ خیر کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتے تھے۔ آزاد کی باتیں بہت جلد حالی کی سمجھ میں آ گئیں اور انھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس غزل کو یکسر ترک کر دیا جس سے کبھی درد کی خوشبو آتی تھی کبھی میر کی، جس میں کبھی مصحفی کا رنگ جھلکتا تھا اور کبھی غالب کا۔ حالی نے آزاد کے مشوروں کی روشنی میں موضوعاتی نظمیں کہنا شروع کیں جو مثنوی کے انداز میں تھیں۔ آزاد اپنے زمانے کے بڑے دانشور اور نثر نگار تھے۔ ان کی نثر میں شاعری کی شان تھی مگر ان کی شاعری شعریت سے محروم تھی۔ حالی ان کے مقابلے میں ایک فطری شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل پر جتنا اثر حالی کا ہوا، آزاد کا نہ ہو سکا۔ ان دونوں کے معاصرین میں اور کوئی قابلِ ذکر شاعر اس وقت تک ایسا نہ تھا جو اس تحریک سے متاثر ہوتا۔ حالی کچھ دیر بعد لاہور سے دِلّی چلے گئے۔ یہاں سرسیّد احمد خاں کی تعلیمی و اصلاحی تحریک سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کی فرمائش پر ایک طویل نظم ''مدّ وجزرِ اسلام'' لکھی جو 'مسدّسِ حالی'' کے نام سے مشہور ہے اور اُردو شاعری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں یہیں سے مقصدی اور ملّی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نظم کا اثر کسی نہ کسی شکل میں آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اُردو شاعری کا دامن اگرچہ نظم سے خالی نہ تھا اور دکن کے دَور میں بھی نظموں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا مگر یہ نظمیں اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے غزل ہی کی ایک شکل تھیں۔ البتہ نظیر اکبر آبادی مستثنیٰ تھے۔ نظیر اکبر آبادی، حالی کے زمانے تک واحد نظم گو شاعر تھے۔ وہ طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے طبقے کے وفادار تھے۔ انھیں کی زندگی ان کے پیشِ نظر رہتی تھی اور انھیں کے مسائل ان کی شاعری کا موضوع تھے۔ نظیر کے موضوعات اور اُن کی زبان چونکہ عوامی تھی اور شعر کی عام روش سے ہٹی ہوئی تھی، اس لیے انھیں اس تمام عرصے میں شاعر تسلیم نہ کیا گیا۔ نظیر، میر وسودا کے ہم عصر تھے مگر ان کی شاعری کا رشتہ آزاد اور حالی سے جوڑا جا سکتا ہے۔ حالی نے مسدّس کے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھیں۔ انھوں نے غزل کو بھی نظم سے قریب تر کر دیا۔

مولانا حالی کا انتقال 31۔ دسمبر 1914ء کو ہوا۔ اس وقت تک سرسید احمد خاں کی تحریک نہ صرف اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی بلکہ یہ پودا درخت بن چکا تھا اور پھل پھول رہا تھا۔ داغ کا اندازِ شعر دم توڑ چکا تھا۔ سرسید کی تحریک اور آزاد و حالی کی شعری تحریک اسمٰعیل میرٹھی اور اکبرالہ آبادی ایسے شاعروں کو بھی منظرِ عام پر لائی۔ یہ دونوں آزاد اور حالی کے ہم عصر تھے مگر نئی شاعری کے قافلے میں بعد میں شریک ہوئے۔ اسمٰعیل میرٹھی بچوں کی شاعری کے لیے بہت مشہور ہوئے۔ ہر چند یہ انداز بھی نیا تھا تاہم اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی بہت سی نظمیں کہیں۔ حتیٰ کہ آزاد نظمیں بھی کہیں اور یوں سمجھنا چاہیے کہ اسمٰعیل میرٹھی آزاد شاعری کے بانی ہیں اگرچہ اس سلسلے میں مولانا عبدالحلیم شرر کا نام بھی لیا جاتا ہے مگر ناول نگاری میں ان کے شعری کارنامے یوں دب گئے ہیں کہ اب اس طرف توجہ بھی نہیں جاتی۔ اکبرالہ آبادی پہلے قدیم طرز کے غزل گو تھے، پھر کچھ نئی شاعری اور کچھ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنا انداز بدل لیا اور مقصدی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اکبر نے محسوس کیا کہ سرسید کی تحریک کی انتہا پسندی مضر ثابت ہو سکتی ہے، چنانچہ اس کی روک تھام کا عزم کیا اور ایک نرالا اندازِ سخن ایجاد کیا۔ انھوں نے سنجیدہ مسائل کا علاج مزاح کی شیرینی اور طنز کی نشتریت کے ذریعے کرنے کی ٹھانی۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ ہنسی ہنسی میں جو بات کہی جاتی ہے، وہ زیادہ کام کر جاتی ہے، چنانچہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ طنز و مزاح پر مشتمل ہے اور یہی حصہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

آزاد اور حالی کے لگائے ہوئے درخت کا سب سے اہم پھل اقبال کی شاعری ہے۔ آزادی کی تحریکیں زور و شور سے چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ قوم پرستی کا چرچا تھا۔ انگریز کے خلاف سیاست زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اقبال بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے اور دیگر سیاسی رہنماؤں کی طرح انھوں نے بھی ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قومیت کے ترانے لکھے مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انھوں نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ اس دوران میں اُن پر یہ انکشاف ہوا کہ قوم پرستی کا مغربی تصور، انسانیت کے لیے ہلاکت آفرین ہے اور یہ کہ اسلام انسانی معاشرے کا جو ایک عالمگیر تصور دے چکا ہے (جس کی بنیاد مساوات پر ہے) اگر اسے دوبارہ نافذ کیا جائے، تو انسان تباہی سے محفوظ رہ سکتا ہے، چنانچہ واپسی پر اقبال نے اپنے بدلے ہوئے نظریے کی تلقین بڑے شد و مد سے شروع کی۔ اقبال میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو کسی بھی عظیم شاعر میں ہونا ضروری ہیں۔ بڑے بڑے خشک مسائل میں اتنی شیرینی پیدا کی کہ باید و شاید۔ اردو ادب کی اب تک کی تاریخ میں وہ سب سے مؤثر شاعر گزرے ہیں۔

اقبال کے نوجوان ہم عصر شاعروں میں سے جو شاعر ان سے متاثر ہو رہے تھے ان میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، اسد ملتانی، امین حزیں سیالکوٹی، محمد دین فوق، اثر صہبائی اور احسان دانش خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب پر اقبال کی چھاپ بہت گہری ہے۔ البتہ اختر شیرانی کی آواز قدرے مختلف تھی۔ اختر شیرانی رومانی شاعر تھے اور انگریزی کی رومانی شاعری سے متاثر تھے۔

یہ سب نظم کے شاعر تھے اور نئی نظم اقبال کے ہاتھوں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ غزل پر اقبال کا اثر کچھ کم نہ تھا۔ اقبال نے غزل کا پورا تصور ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے غزل کے آفاق میں وسعت و دانائی شامل کر دی۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

بالِ جبریل کی غزلیں شاہد ہیں کہ اس زمانے کے دیگر شعرا کے ہاں بھی کہیں کہیں نئے زمانے کے تقاضے بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ ان میں حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، عابد علی عابد، عبدالحمید عدم، فراق گورکھپوری اور حفیظ ہوشیار پوری قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال کا انتقال 1938ء میں ہوا۔ اس سے دو سال پہلے 1936ء میں ایک نئی تحریک سامنے آئی، جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کا پس منظر خالص سیاسی اور معاشی تھا۔ اقبال گم شدہ اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کو تلاش کرنے اور جوڑنے میں مصروف رہے، یہ تحریک اپنی تمام اقدار کو ان قدروں سے تبدیل کرنا چاہتی تھی جو انقلابِ رُوس (1917ء) نے دُنیا کو دی تھیں۔ اگرچہ ان کے نقوش بھی اقبال کی شاعری میں مل جاتے ہیں مگر باندازِ دیگر۔ پُرانے شاعروں میں سے، جنھوں نے اپنے آپ کو اس تحریک میں شامل کر لیا، جوش ملیح آبادی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

وہ نوجوان شاعر جنھوں نے اس تحریک کی روشنی میں اپنے فن کو جلا بخشی ان میں فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، مصطفیٰ زیدی اور عارف عبدالمتین کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اس تحریک نے اُردو شاعری کو نئے زاویوں سے روشناس کیا اور نئے نئے اسالیب متعارف کرائے۔

ترقی پسند تحریک کے متوازی 1939ء میں ایک اور تحریک نے جنم لیا جسے حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ بھی نئی شاعری کی دعوے دار تھی مگر اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ موضوع خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، جب تک اس کے ابلاغ میں فن کی بُنیادی قدروں کا لحاظ نہ رکھا جائے، بے اثر ہو جاتا ہے۔ یہ تحریک بھی خالص نظم کی تحریک تھی اور اس میں مواد کے ساتھ ہیئت کے تجربے خاص طور سے کیے گئے۔ اس تحریک سے جو شاعر وابستہ تھے ان میں تصدق حسین خالد، ن م راشد، میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، باقی صدیقی، مجید امجد، اختر الایمان، تابش صدیقی، عزیز حامد مدنی، ضیا جالندھری، ظہیر کاشمیری، حبیب جالب اور رئیس امروہوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غزل کو ابتدا میں ترقی پسند اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں تحریکیں رد کرتی رہیں مگر قیامِ پاکستان کے بعد کچھ ایسے حالات اور ایسی فضا پیدا ہوگئی کہ غزل کو پھر سے اپنی سخت جانی کا ثبوت فراہم کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ غزل پھر شاعری کی فضا پر چھا گئی۔ سوائے ن م راشد کے سبھی شاعر، خواہ کسی بھی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، غزل کی طرف مائل ہوئے۔ میراجی اور مجید امجد خالص نظم کے شاعر تھے مگر وہ بھی غزل کی زلفوں کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

قیامِ پاکستان کے بعد غزل کو پھر سے قارئینِ ادب کے دلوں کی دھڑکن بنانے میں جن شعرا نے اس صنف کی خونِ جگر سے آبیاری کی، ان میں انجم رومانی، ناصر کاظمی، ابنِ انشا، احمد مشتاق، شہرت بخاری، سلیم احمد، نعیم صدیقی، سیف الدین سیف، سجاد باقر

رضوی، صوفی تبسم، منیر نیازی، شہزاد احمد، قتیل شفائی، ظفر اقبال، محسن بھوپالی، سحر انصاری، ادا جعفری، طفیل ہوشیار پوری، ساغر صدیقی، محسن احسان، بیدل حیدری، تنویر سپرا، شکیب جلالی، جون ایلیا، جمال احسانی، نذیر قیصر اور مظفر وارثی شامل ہیں۔ غزل و نظم کے اس قافلے میں قدرے بعد میں شامل ہو کر اس سلسلے کو استقامت سے مزید آگے بڑھانے والوں میں اختر حسین جعفری، ظہور نظر، احمد فراز، منیر سیفی، جمیل یوسف، شبنم شکیل، کشور ناہید، افتخار عارف، غلام محمد قاصر، عطا شاد، توصیف تبسم، ریاض مجید، پروفیسر صدیق شاہد، خورشید بیگ میلسوی، مرتضیٰ برلاس، حفیظ الرحمٰن احسن، عطاء الحق قاسمی، خالد احمد، امجد الام امجد، خالد شریف، ڈاکٹر خورشید رضوی، محسن نقوی، نجیب احمد، اسلم کولسری، جعفر بلوچ، علی اکبر عباس، ایوب خاور، محمود غزنی، گلزار بخاری، ڈاکٹر تحسین فراقی، لطیف ساحل، پروین شاکر اور ممتاز ہاشمی کے نام اہم ہیں۔

بیسویں صدی کے آخری ربع میں جس طرح الیکٹرانک میڈیا کے بے محابا پھیلاؤ نے چیزوں کی اہمیت اور معنویت کو تبدیل کر دیا، اسی طرح اردو ادب میں بھی ایسی شاعری وجود میں آنے لگی، جو تہہ دار یا دھار دار ہے۔ اس شاعری کی بنیاد Intlact پر ہے۔ یہ شاعری اسی طرح سے تخلیق ہو رہی ہے، جس کے بارے میں کبھی غالب نے فرمایا تھا:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اس شاعری کا محرک محض مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ شاعری حیرت، حسرت اور حسیت کے امتزاج سے وجود پاتی ہے۔ اس نئی کھیپ کے غزل گو شعرا میں سعود عثمانی، عباس تابش، شاہین عباس، اکبر معصوم، ادریس بابر، مقصود وفا، نوید رضا، شناور اسحاق، آفتاب حسین، اختر شمار، افشاں نوید، ضیاء الحسن، احمد نوید، اختر عثمان، انجم سلیمی، یاسمین حمید، حسن عباسی، شاہد ذکی، قمر رضا شہزاد، لیاقت علی عاصم، اجمل سراج، واجد امیر، احمد حسین مجاہد، نوشی گیلانی، افضل گوہر، اظہر عباس، اشرف نقوی، افضل خاں اور علی زریون وغیرہ کے نام پورے اعتماد کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں، جنھوں نے غزل جیسی دو مصرعی اور محدود صنفِ سخن کے آفاق پھیلا دیے ہیں۔ اسی طرح جدید نظم نگاروں کے قافلے میں رفیق سندیلوی، حمیدہ شاہین، ارشد نعیم، نصیر احمد ناصر، انوار فطرت، معین نظامی، علی محمد فرشی، ابرار احمد، وحید احمد، جاوید انور، ثمینہ راجا، ستیہ پال آنند، ذیشان ساحل، حارث خلیق، سعید احمد اور زاہد امروز وغیرہ شامل ہیں، جو ''آدمی نامہ''، ''برسات کی بہاریں''، ''ہنسل کا لنڈو'' اور ''ریچھ کا بچہ'' جیسی نظموں سے آغاز پانے والی انسان کی ظاہری تصویر کشی کے سلسلے کو آدمیت کی تاریخ، اساطیر، تقاسیر اور باطنی تفاصیل تک کھینچ لائے ہیں۔ جس طرح آج یک ننھا سا موبائل فون اپنے دامن میں دنیا جہان کا تفریحی و معلوماتی ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے، بعینہٖ جدید دور میں نمو پانے والی نظم بھی اپنے باطن میں ایک جہانِ معنی آباد کیے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خاں

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

❀❀

دوسرا باب

اُردو نثر کا ارتقا

اردو شاعری کی طرح اُردو نثر کے قدیم نمونے بھی دکن ہی میں ملتے ہیں جن میں سے بعض خاصے مشہور ہوئے۔ یہ عموماً مذہب اور تصوف کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ البتہ ادبی نثر کا باقاعدہ آغاز ملاوجہی (م:1659ء) کی ''سب رس'' (1635ء) سے ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ نثر کا مشکل نمونہ ہے لیکن اس نے اردو زبان میں باقاعدہ نثر نگاری کی راہ ہموار کر دی۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ (1800ء) نے اردو نثر کو عوامی سطح تک عام کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازمین کو برِصغیر کی مختلف زبانوں اور یہاں کے مخصوص تہذیبی و معاشرتی حالات سے آگاہ کرنے کے لیے کلکتے میں (جو کمپنی کا مرکز تھا) قائم کیا تھا۔ اس کالج میں ایک شعبہ اُردو اور ہندی کے لیے مخصوص تھا۔ نثر کی کتابیں فراہم نہ ہونے کی بنا پر اس کالج کو ایک دارالترجمہ اور شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کرنا پڑا جس کے نگران ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے۔ یہ پیشہ کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر تھے۔ زبانیں سیکھنے سے خاص شغف تھا۔ 1782ء میں ہندوستان آئے۔ مقامی زبان وتہذیب سے مکمل آشنائی حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی لباس و اندازِ سکونت اختیار کیا۔ اردو زبان میں مکمل استعداد حاصل کرنے کے بعد اس زبان کا اوّلین لغت مرتب کیا اور بعد ازاں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ اس شعبے سے متعدد ایسے ادیب منسلک رہے ہیں جو اُردو نثر کی تاریخ میں زندہ جاوید ہو گئے۔ مثلاً میر امّن اور حیدر بخش حیدری۔

میر امّن کی داستان ''باغ و بہار'' اُردو نثر کا سب سے قیمتی سرمایہ تسلیم کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ داستان اپنے قصّے کے اعتبار سے نئی نہ تھی۔ اس قصّے کو پہلے بھی عطا حسین خان تحسین نے ''نوطرزِ مرصّع'' کے نام سے تصنیف کیا تھا، مگر میر امّن نے اسے نئے سرے سے ترتیب دیا اور پھر دلّی کی خاص ٹکسالی زبان میں یوں بیان کیا کہ تقریباً دوسو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ اپنی دلچسپی قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی طرح حیدر بخش حیدری نے حاتم طائی کے قصّے کو ''آرائشِ محفل'' کے نام سے مرتب کیا اور اپنے طرزِ بیان سے ہر دلعزیز بنایا۔ میر امّن کی ''باغ و بہار'' 1802ء میں لکھی گئی۔ 1803ء میں سیّد انشا نے جو لکھنؤ میں تھے اور مشہور و معروف شاعر تھے، فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے بے خبر ہونے کے باوجود ''کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی'' کے نام سے ایک قصہ تصنیف کیا جس کا کمال یہ ہے کہ اس میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ خالص اُردو کے ہیں، اس میں عربی اور فارسی کے بجائے ہندی اور مقامی زبانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

میر امّن کی ''باغ و بہار'' اُردو نثر میں ایک تحریک کا کام کر گئی جس کے بعد داستانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں سب سے نمایاں ''فسانۂ عجائب'' ہے جو 1825ء میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف لکھنؤ کے ایک صاحبِ طرز ادیب مرزا رجب

علی بیگ سرور ہیں۔ اس کتاب کا ''باغ و بہار'' سے مقابلہ کیا جاتا ہے، ان معنوں میں کہ ان دونوں کا انداز تحریر ایک دوسرے کی ضد ہے۔ ''باغ و بہار'' اپنی سادگی کے سبب، فسانۂ عجائب اپنی آراستگی کے باعث۔ ان داستانوں کے علاوہ ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''طلسمِ ہوش ربا'' بھی بہت مشہور ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے دیگر لکھنے والوں میں بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان، خلیل خاں اشک، شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، مرزا لطف علی، مظہر علی ولا، للولال کوی، شیخ حفیظ الدین اور امانت علی شیدا وغیرہ اہم ہیں۔ اردو نثر پہ فورٹ ولیم کالج کا جادو ایسا سر چڑھ کے بولا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں اردو نثر کا چرچا ہونے لگا۔ 1822ء میں کلکتہ سے منشی سدا سکھ کی ادارت میں اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' جاری ہو گیا۔ 1830ء میں چارلس مٹکاف نے ہندوستان میں صحافت کو تمام پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ 1835ء میں اردو کو پہلی اور آخری بار ہندوستان کی سرکاری و عدالتی زبان قرار دے دیا گیا۔ 1836ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے ''دہلی اردو اخبار'' اور 1837ء میں سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ''سید الاخبار'' جاری کر دیا۔ 1850ء میں پنجاب سے پہلا اردو اخبار ''کوہ نور'' شروع ہو گیا۔ گویا اردو نثر پہ دیکھتے ہی دیکھتے دھوم دھام سے بہار آ گئی۔

داستانی ادب کے ساتھ ساتھ اگر ایک طرف 1842ء میں قائم شدہ دہلی کالج کی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے مختلف علوم اور مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرائیں تو دوسری طرف مسیحی مشنری اپنا کام کرتے رہے۔ انھوں نے بھی اپنے مذہبی لٹریچر کو اُردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں اُردو زبان میں دھڑا دھڑ اخبار شائع ہونا شروع ہو گئے اور ہوتے ہوتے ہندوستان میں اخبارات کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب میرزا غالب ہر تحریک سے علیحدہ رہ کر اور کسی شعوری مقصد کے بغیر اپنے دوستوں اور شاگردوں کے نام خطوط لکھ رہے تھے۔ 1827ء میں وہ اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتہ گئے جہاں آسان اردو کا سکہ چل رہا تھا۔ داستانیں اور اخبار عوام الناس کا دل جیت چکے تھے۔ میرزا کا بعد کا کلام اور خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر کا کچھ نہ کچھ اثر انھوں نے ضرور قبول کیا ہوگا۔ وہ شروع شروع میں نہیں جانتے تھے کہ ان کے خطوط اُردو نثر کا بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوں گے۔ لیکن ہمارے تمام ناقدین نے انھی خطوط کو جدید اردو نثر کا سنگ میل قرار دیا۔ پروفیسر آ سی ضیائی کے بقول غالب نے اردو نثر میں پہلی بار اظہار ذات کا دروازہ کھولا۔

1857ء میں پاک و ہند کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی اور جس کرب میں یہ قوم مبتلا ہوئی تھی، اس سے نجات دلانے کے لیے قدرت نے سرسید احمد خاں کو منتخب کیا۔ سرسید نے اپنی جد و جہد مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے سے شروع کی تھی مگر رفتہ رفتہ یہ تعلیمی تحریک مسلمانوں کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوئی۔ سرسید خود صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تحریر کی ابتدا روایتی قسم

• کی آراستہ و پیراستہ نثر سے ہوئی مگر حالات کے تقاضے نے انھیں ایسی نثر لکھنے کی طرف مائل کیا جو کم سے کم وقت میں لکھی جائے اور جسے زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ بلکہ غیر تعلیم یافتہ بھی یکساں طور پر سمجھ سکیں۔ سرسیّد نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ متعدد کتابیں مع تفسیرِ قرآن مجید، ان کی یادگار ہیں نیز ان کے مضامین کی سولہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُنھوں نے ایک رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' (اجرا: 1870ء) کے نام سے بھی جاری کیا۔ مضمون اور انشائیہ جسے انگریزی میں (Essay) کہا جاتا ہے اُردو میں سب سے پہلے سرسیّد ہی نے لکھا۔

سرسیّد کی تحریک اور اُن کی تحریروں نے نہ صرف برِّصغیر کے مسلمانوں میں بیداری اور ذمے داری کی لہر دوڑا دی بلکہ ادب خصوصاً نثر میں ایسا انقلاب برپا کیا کہ اس کی مثال کم ملے گی۔ انھوں نے اردو نثر کو ہر طرح کے علمی و تحقیقی موضوعات سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنا دیا۔ سرسیّد کی شخصیت، جو ان کی تحریروں میں واضح طور سے نمایاں ہے، اس جدید نثر پر چھائی ہوئی ہے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اُس زمانے کے ہر لکھنے والے نے اپنے طور پر اپنی صلاحیتوں کے مطابق سرسیّد کا اثر قبول کیا۔ ان میں خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں اور یوں سرسیّد احمد خاں سمیت ان بزرگوں کو جدید اُردو نثر کا بانی سمجھنا چاہیے۔

مولانا حالی بُنیادی طور پر شاعر تھے۔ انھوں نے پہلے کلاسیکی انداز کی غزل کہی پھر نئی نظم کہی اور اس سے آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ نثر کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اردو میں تنقید اور سوانح نگاری کا آغاز مولانا حالی ہی سے ہوتا ہے۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اُردو تنقید کی اوّلین کتاب ہے۔ دراصل یہ دیباچہ تھا جو انھوں نے اپنے دیوان کی اشاعت کے وقت لکھا تھا جسے بعد میں اس کی افادیت کے پیشِ نظر کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اس کتاب میں شاعری کی بنیادی ضرورتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ باتیں اتنی اہم ہیں کہ جزوی اختلاف کے سوا بحیثیت مجموعی ان سے انکار نہیں ہو سکا۔ تنقید کی اس کتاب نے بعد کے آنے والے ادیبوں کو تنقید کی اہمیت کا احساس دلایا اور یوں رفتہ رفتہ اُردو تنقید کا ایک قابلِ قدر سرمایہ فراہم ہو گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اب تک قدیم طرزِ فکر کے نقاد بھی موجود رہے جو عربی اور فارسی تنقید کے قدیم اصولوں کی پیروی کرتے رہے۔ مثلاً مولانا شبلی نعمانی، وحید الدین سلیم، پنڈت دتا تریہ کیفی، شمس العلما امداد امام اثر، نیاز فتح پوری اور مولوی عبدالحق وغیرہم۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اُنھوں نے ''انڈین پینل کوڈ'' کا ترجمہ ''تعزیراتِ ہند'' کے نام سے کیا مگر ان کی اہمیت ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ اُردو میں سب سے پہلے انھوں نے ناول لکھنا شروع کیے۔ ان کے ناول اصلاحی ہیں۔ وہ مسلمانانِ برصغیر کی گھریلو زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی ساری خرابی کا سبب یہ ہے کہ ان کی گھریلو زندگی سے مذہب کا اثر ختم ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے متعدد ناول لکھے جن میں سے ''مرآۃ العروس'' (1869ء) اردو کا پہلا ناول قرار پایا۔ بعد ازاں بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت خصوصاً بہت مقبول ہوئے۔ نذیر احمد کی زبان اور ان کا محاورہ

سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

نذیر احمد کے ناول جدید تنقید کی روشنی میں کامیاب قرار نہ بھی دیے جائیں تو بھی اس سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے لکھنے والوں کو ناول کی طرف متوجہ کیا۔ نذیر احمد نے چونکہ مقصدی ناول لکھے تھے لہٰذا صنفِ افسانہ کے لیے بھی مقصدیت کا راستہ کھل گیا یعنی یہ بات ثابت ہوگئی کہ مقصدی افسانوی ادب بھی اتنا ہی موثر ہو سکتا ہے جتنا کہ تفریحی ادب، بشرطیکہ لکھنے والے کے قلم میں صلاحیت موجود ہو۔

نذیر احمد کے بعد جن ناول نگاروں نے مختلف زمانوں میں اس فن کو آگے بڑھایا ان میں چند ایک نام یہ ہیں: رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا۔ مرزا ہادی رسوا نے فنی لحاظ سے ناول کی صنف کو بہت چمکایا۔ ان کا ناول "امراؤ جان ادا" اُردو کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو ناول میں کمال حاصل کرنے والوں میں پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، عزیز احمد، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، ممتاز مفتی، نسیم حجازی، ممتاز مفتی، مستنصر حسین تارڑ، رحیم گل، رضیہ بٹ، یونس جاوید، بشریٰ رحمن اور عمیرہ احمد کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں اسلوب کے حوالے سے سب سے زیادہ موثر قلم رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور و معروف تصنیف "آبِ حیات" قدیم تذکروں اور جدید ادبی تنقید کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب میں آزاد نے نثر نگاری کا وہ ہنر دکھایا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ تاریخ ادب ایسے خشک موضوع پر اس قدر دلچسپ اور دل کش کتاب کا لکھا جانا دشوار کام تھا۔ اسی طرح "دربارِ اکبری" میں کہ خالص تاریخی موضوع سے تعلق رکھتی ہے، آزاد نے نثر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں، پھر "سخن دانِ فارس" ہے، جو فارسی اور سنسکرت کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہے، اُردو زبان میں علم لسانیات پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس سے آزاد کا زبانوں کے مطالعے سے گہرا لگاؤ ثابت ہوتا ہے اور ان کے ساتھ "نیرنگِ خیال" ہے جس میں شامل مضامین کو "Essay" یعنی انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔ انھی میں سے بعض مضامین اردو میں فینٹیسی کا نقطۂ آغاز ہیں۔

آزاد کا اسلوب انھی سے مخصوص ہے جس کی پیروی کرنا ہمیشہ دشوار رہا ہے تاہم چند لکھنے والے ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے آزاد کے رنگ کو نکھارا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا صلاح الدین احمد خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

شبلی بنیادی طور پر مورخ تھے۔ ان کی اکثر تصانیف اسی پس منظر میں ہیں۔ ان کا بیان رنگین اور ان کی زبان سادہ و سلیس مگر موثر ہے۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شعر العجم اور الفاروق جیسی ان کی معرکے کی تصانیف ہیں۔ لوگ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ادبی زندگی کا حاصل جانتے ہیں۔ ۔۔۔ کتاب ۔۔۔ بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے جمع کیے ہوئے

مواد سے ان کے لائق شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ ''شعر العجم'' فارسی شاعری کی تاریخ ہے جو اُردو میں فارسی شاعری کی تاریخ پر بہترین کتاب ہے۔ ''الفاروق ﷜'' حضرت عمر فاروق ﷜ کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مستند کتاب ہے۔ شبلی نے یہ کتاب بڑی دل سوزی اور کاوش سے لکھی ہے جو سوانح نگاری کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اس زمانے میں مولانا حالی نے بھی تین قابلِ ذکر سوانح عمریاں تحریر کیں، ان میں پہلی ''حیاتِ سعدی'' ہے جس میں فارسی کے مشہور شاعر اور نثر نگار شیخ سعدی کے حالات اور ان کی تحریروں سے بحث کی گئی ہے۔ ''یادگارِ غالب'' ہے جو انھوں نے اپنے اُستاد مرزا غالب کے حالاتِ زندگی اور ان کی تحریروں کے بارے میں لکھی ہے۔ تیسری ''حیاتِ جاوید'' ہے جو سرسیّد کے حالات اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔

غرض یہ کہ سرسیّد اور ان کے زمانے کے ادیبوں نے اُردو نثر کو ایک باوقار مقام عطا کیا اور اب لکھنے والوں کو نثر میں اظہارِ مطالب میں کوئی دُشواری نہ رہی۔

1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس نے ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا۔ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ نثر میں تنقید بھی تھی اور افسانوی ادب بھی۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے ہی ایک ایسا افسانہ نگار سامنے آ چکا تھا جس نے اپنے آپ کو منوا لیا تھا اور جو نذیر احمد کی طرح تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کا ادبی مقام ہمیشہ قابلِ احترام رہا ہے اور اس نے میر امّن کی طرح بے مثال مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ پریم چند ہیں جنھوں نے ناول بھی لکھے مگر مختصر افسانے کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ پریم چند کے ناول اور افسانے سماجی اور معاشی مسائل سے خصوصاً متعلق ہیں اور مقصدی افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ترقی پسند افسانوی ادب کے لیے پریم چند نے زمین ہموار کر رکھی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ناول نگار اور افسانہ نویس، جو اس تحریک سے خصوصاً متاثر ہوئے اور وابستہ رہے، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: علی عباس حسینی، کرشن چندر، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللّٰہ انصاری اور راجندر سنگھ بیدی۔ ترقی پسند تحریک سے جن ادیبوں کو اتفاق نہ تھا۔ ان میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی ایک انفرادی مقام کے حامل تھے۔ علاوہ ازیں حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، انتظار حسین، بلونت سنگھ، مسعود مفتی، ممتاز مفتی، مظہر الاسلام، منشا یاد، رفیق حسین، میرزا ادیب کا شمار بھی معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جب کہ اصغرِ علی جاوید، طاہرہ اقبال، جمیل احمد عدیل، نیلم احمد بشیر اور حامد سراج کا شمار بیسویں صدی کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

افسانوی ادب کے ساتھ تنقید کا کام بھی بڑے زور شور سے جاری رہا۔ وہ نقاد جنھوں نے جدید نقدِ ادب میں نام پیدا کیا ان میں مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، سیّد احتشام حسین، سیّد عابد علی عابد، ڈاکٹر سیّد عبداللّٰہ، محمد حسن عسکری، اختر حسین رائے پوری، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ممتاز حسین [illegible] شامل ہیں۔

ڈراما نگاری کا آغاز یوں تو بہت پہلے واجد علی شاہ کے عہد میں ہوا اور اس زمانے کے ایک مشہور شاعر امانت لکھنوی کی ''اندر سبھا'' کو پہلا ڈراما قرار دیا جاتا ہے مگر دیگر اصناف کے مقابلے میں ڈرامے کے ارتقا کی رفتار بہت سُست رہی۔ سب سے جان دار ڈراما نگار جو سامنے آئے وہ آغا حشر تھے۔ آغا حشر شہر شہر اپنا تھیٹر لے کر پھرے۔ انھوں نے نثر و شعر سے اپنے ڈرامے کو آراستہ کیا اور ملک گیر شہرت حاصل کی مگر بعض وجوہ کی بنا پر سٹیج ڈراما مسلمان معاشرے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ لہٰذا اکثر ڈرامے صرف کتابی شکل اختیار کر سکے۔ جن ڈراما نگاروں نے اس صنف میں مقبولیت حاصل کی ان میں سیّد امتیاز علی تاج، محمد مجیب، نورالٰہی، محمد عمر، سیّد عابد علی عابد، حکیم احمد شجاع اور میرزا ادیب شامل ہیں۔ موجودہ دور ٹی وی ڈرامے کا دور ہے۔ اس طرز کے اہم ڈراما نگاروں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، فاطمہ ثریا بجیا، حسینہ معین، اطہر شاہ خاں، انصار عبد العلی، کمال احمد رضوی، منو بھائی، نورالہدیٰ شاہ، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، یونس جاوید، اصغر ندیم سید، اوریا مقبول جان، ڈاکٹر ڈینس آئزک اور ڈاکٹر یونس بٹ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

تحقیق بھی نثری ادب کا ایک اہم شعبہ ہے۔ تنقید سے ہم کسی زمانے کے مزاج اور رویّوں کو معلوم کرتے ہیں اور تحقیق سے ان نقوش کو تلاش کرتے ہیں جن پر چل کر زندگی اور اَدب ارتقائی منازل طے کر لیتے ہیں۔ اُردو ادب میں جن محققین نے نام پیدا کیا ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: حافظ محمود شیرانی، وحید الدین سلیم، مولوی عبد الحق، ڈاکٹر سیّد عبد اللّٰہ، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، قاضی عبد الودود، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شیام لال کالڑا، مالک رام، عبد اللّٰہ قریشی، کالی داس گپتا، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، حامد حسن قادری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں، مسعود حسن رضوی ادیب، مختار الدین احمد، معین الدین عقیل، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، عطش درانی، ڈاکٹر علی محمد خاں، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور ڈاکٹر رفاقت علی شاہد۔

طنز و مزاح بھی ادب کا لازمی جز و رہا ہے۔ اردو میں اس کا آغاز جعفر زٹلی سے ہوتا ہے، جسے ایک طنزیہ پیروڈی کی پاداش میں فرخ سیر نے پھانسی دے دی۔ اس کے بعد نثری مزاح کی بعض جھلکیاں ہمیں رتن ناتھ سرشار اور ڈپٹی نذیر احمد کے کرداروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اودھ پنچ (آغاز: 1877ء) نے اسے عوامی مزاح عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں اسے معیار اور اعتبار عطا کرنے والوں میں فرحت اللّٰہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق، عبد المجید سالک اور شفیق الرحمٰن کے نام اہم ہیں جب کہ قیامِ پاکستان کے بعد اسے بامِ عروج تک پہنچانے والوں میں محمد خالد اختر، مشتاق احمد یوسفی، سید ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں، مشفق خواجہ، صدیق سالک، یوسف ناظم، کنہیا لال کپور، دلیپ سنگھ، مجتبیٰ حسین، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر یونس بٹ، تنویر حسین، ڈاکٹر وحید الرحمٰن، گل نوخیز اختر اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں نثری ادب کی مقبول ترین اصناف میں آپ بیتی، خاکہ اور سفرنامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ بیتی، جس کا آغاز مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' سے ہوا تھا، آج اردو ادب میں اس کا بیش قرار ذخیرہ موجود ہے۔ چند اہم آپ بیتیوں میں سر رضا علی کی ''اعمال نامہ''، عبدالمجید سالک اور زیڈ اے بخاری کی ہم نام ''سرگزشت'' قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، ادا جعفری کی ''میں ساز ڈھونڈتی رہی''، ڈاکٹر وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے'' اور جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' شامل ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے ''آشفتہ بیانی میری'' اور مشتاق احمد یوسفی نے ''زرگزشت'' کے عنوان سے شگفتہ آپ بیتیاں تحریر کیں، جبکہ ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر اور مستنصر حسین تارڑ نے ناول اور آپ بیتی کو ہم آمیز کر کے قارئین ادب کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کیا۔

اردو میں خاکہ نگاری کا بیج فرحت اللہ بیگ نے ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے ذریعے بویا۔ قیامِ ملک کے بعد اس صنف کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ اہم خاکہ نگاروں میں رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، سید ضمیر جعفری، ممتاز مفتی، محمد طفیل، ڈاکٹر علی محمد خاں، عطاء الحق قاسمی، مجتبیٰ حسین، احمد عقیل روبی، احمد بشیر، آفتاب احمد، شاہد حنائی، ڈاکٹر یونس بٹ، ضیا ساجد، اعجاز رضوی، کبیر خاں اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک شامل ہیں۔

اردو ادب میں سفرنامے کی نیو یوسف خاں کمبل پوش نے ''عجائباتِ فرنگ'' (اوّل: 1847ء) کے ذریعے رکھی تھی۔ طویل عرصے تک یہ صنف روزنامچہ یا سفری مصروفیات کے بیان تک محدود رہی۔ 1954ء میں منظرِ عام پہ آنے والے محمود نظامی کے سفرنامے ''نظر نامہ'' کو اس صنف کا مجدد قرار دیا جاتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد اس صنف کو رفعت عطا کرنے والوں میں ابنِ انشا، بیگم اختر ریاض الدین، محمد خالد اختر، ممتاز مفتی، کرنل محمد خاں، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، اختر ممونکا، پروفیسر افضل علوی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے اسمائے گرامی قابلِ قدر ہیں۔

مذکورہ بالا تمام اصناف کے ساتھ ساتھ اردو صحافت نے بھی نثری دنیا کو نئے نئے ذائقوں سے آشنا کیا ہے۔ کالم، اداریہ، فیچر، انٹرویو، خبریں، ان سب کی اپنی اپنی حدود اور اپنا اپنا مزاج ہے لیکن ان سب کا مشترکہ کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو خواص کے دائرے سے نکال کر عوام کی محفل میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ یہ جملہ اقسامِ صحافت اردو نثر کے آفاق پھیلانے میں ہمیشہ سے ممد و معاون ہیں۔

ڈاکٹر علی محمد خاں

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

تیسرا باب

چند شعری اصطلاحات

مصرع: لفظی معنی کواڑ (دروازے) کا ایک پٹ مراد ہے، آدھا شعر یا نصف بیت، مصرع با معنی الفاظ پر مشتمل وہ سطر ہے کہ اگر نثر میں ہو تو فقرہ کہلائے، اور نظم میں ہو تو مصرع۔ شعر کے پہلے مصرعے کو مصرع اوّل جب کہ دوسرے کو مصرع ثانی کہتے ہیں۔ مثلاً:

ع یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

ع ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شعر یا بیت: لفظیِ معنی سخنِ موزوں، دو مصرعے جو ایک وزن کے ہوں اور ایک خیال ظاہر کریں تو وہ شعر یا بیت ہے۔ مثلاً:

یارانِ تیزگام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

قافیہ: ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز و ہم وزن الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ ایک خاص ترتیب سے اصناف نظم میں مکرر آتے ہیں مگر معنوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے مرزا غالب کی یہ معروف غزل ملاحظہ کیجیے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور دَرویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اس غزل میں ہُوا، دوا، ماجرا، مدّعا، وفا، صدا اور بُرا کے الفاظ قافیے کے طور پر آئے ہیں۔

ردیف: لغوی معنی ہیں ''گھوڑے پر سوار کے پیچھے بیٹھنے والا آدمی'' مگر اصطلاحِ شعر میں قافیے کے بعد آنے والے وہ لفظ یا الفاظ جو جوں کے توں بار بار دہرائے جائیں، ردیف کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ مرزا غالب کی متذکرہ بالا غزل کی ردیف ہے ''کیا ہے۔''

مطلع: لغوی معنی ''طلوع ہونے کی جگہ'' کے ہیں مگر شعری اصطلاح میں کسی قصیدے یا غزل کے پہلے شعر کو، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوں، مطلع کہتے ہیں۔ ردیف کی موجودگی ضروری شرط نہیں ہے۔ مرزا غالب کی ایک زبان زدِ خاص وعام غزل کا مطلع ہے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

مقطع: لغوی معنی ہیں ''قطع ہونے کی جگہ'' مگر شعری اصطلاح میں کسی قصیدے یا غزل کے آخری شعر کو، جس میں شاعر اپنا تخلص بھی لاتا ہے، مقطع کہتے ہیں۔ مثلاً:

مال ہے نایاب اور گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

تاہم اگر آخری شعر میں تخلص استعمال نہ ہو تو وہ صرف آخری شعر کہلائے گا، مقطع نہیں ہوگا۔

بند: کسی مسلسل نظم کا وہ حصہ جس میں کسی خیال یا واقعے کو ارادی طور پر بیان کیا گیا ہو اور جس کے آخری مصرعے یا شعر، قبل ازیں کہے گئے، اشعار اور مصرعوں سے مختلف ہوں۔ ایسے ہر بند میں، نظم کی نوعیت کے مطابق تین سے لے کر دس مصرعوں تک ہو سکتے ہیں مثلاً مربع کا ہر بند چار مصرعوں، مخمس کا ہر بند پانچ مصرعوں اور مسدس کا ہر بند چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سات سات، آٹھ آٹھ اور دس دس مصرعوں کے بند بھی ہوتے ہیں مگر ان کی روایت کم رہی ہے۔

تخلص: تخلص اس مختصر نام کو کہتے ہیں جسے شعرا اس غرض سے اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے اپنے اشعار میں استعمال کیا جائے۔ جب غزل کے آخری شعر میں مختصر سا نام استعمال کیا جاتا ہے تو اسے مقطع کہتے ہیں بصورت دیگر وہ آخری شعر ہی کہلاتا ہے۔ لغوی معنی رہائی پانے کے ہیں۔ تخلص مختصر ہونا چاہیے تاکہ آسانی سے شعر میں کھپ سکے۔ بسا اوقات شاعر اپنے نام کے اس مختصر سے حصے کو تخلص کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جیسے اقبال، امیر، فیض، عابد وغیرہ۔

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

بیاض: کسی شاعر کی شاعری کی ذاتی ڈائری یا نوٹ بک بیاض کہلاتی ہے یعنی شاعر اپنے اشعار جس کاپی یا ڈائری پر نوٹ کرتا جاتا ہے، اس غیر مطبوعہ شعری مجموعے کو بیاض قرار دیا جاتا ہے۔

دیوان: بیاض کو دیوان بھی کہہ لیا جاتا ہے۔ دیوان شعری مجموعہ ہوتا ہے جس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے غزلیات شامل

ہیں اور دیگر کلام بھی۔ قدیم شعرا کے ہاں دیوان پائے جاتے تھے جیسے دیوانِ غالب، دیوانِ آتش، دیوانِ میر۔ اس دور میں غزلوں کو ایک مجموعے کی صورت میں ترتیب دیا جاتا ہے اور شعری دیوان بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ممتاز شاعر منصور آفاق نے اپنی غزلیات الف سے یے تک یکجا کر کے شائع کی ہیں اور اسے ''دیوانِ منصور'' کا نام دیا ہے۔

کلیات: کسی بھی شاعر کے ''کل کلام'' کو یکجا کر کے شائع ہونے والی ضخیم کتاب کو ''کلیات'' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ عموماً شعرا کی تمام شاعری یا شعری مجموعے کلیات میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ عموماً وفات پانے والوں کی شاعری پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان دنوں زندہ شعرا بھی اپنی کتابوں کو اکٹھا چھاپ کر اسے کلیات قرار دیتے ہیں۔ مشہور کلیات میں فیض احمد فیض کا ''نسخہ ہائے وفا'' پروین شاکر کا ''ماہِ تمام'' کلیاتِ ناصر کاظمی وغیرہ شامل ہیں۔

آمد: آمد، آمدن مصدر سے حاصل مصدر ہے، معنی ہیں آنے کے آثار یا آنے کی خبر۔ بے ساختگی، بے تکلفی اور بناوٹ سے پاک بغیر تکلف اور بناوٹ کے جو بات خود بہ خود دل میں پیدا ہو، اسے اصطلاح میں آمد کہتے ہیں جیسے: ''ان کی شاعری کا عجب حال تھا، جہاں آنکھ بند کی اور آمد شروع ہوگئی، مضامین برس پڑے۔''

آورد: آورد، آمد کی ضد ہے۔ مفہوم ہے محنت اور کوشش سے بات کرنا اور تکلف سے شعر کہنا۔ جب شاعر ارادی طور پر فکرِ سخن کرے اور شعر کہنے کے بعد اس کے لفظ و بیان اور ترتیب و تنظیم پر خوب غور و خوض اور اسے صاف، رواں اور بہتر پیرائے میں ڈھالنے کی سعی کرے تو یہ آورد ہے۔ روایت کے برخلاف مولانا حالی نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد آورد کو آمد پر ترجیح دی ہے۔

تحت اللفظ: گانے کے غنائی انداز سے دور تر اور باتیں کرنے کے تکلمی انداز سے قریب تر شعر خوانی کی یہ ایک تیسری صورت ہے جس میں وزن اور آہنگ کا پورا تاثر بھی موجود ہوتا ہے اور گفتگو کے محتاط تکلمی انداز میں قطعیتِ ابلاغ کی جو خصوصیت موجود ہے وہ بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اکثر پاکستانی شعرا مشاعروں میں اپنا کلام تحت اللفظ ہی سناتے ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ابتدا میں اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے بعد میں انھوں نے لوگوں کے اصرار پر ترنم سے سنانا شروع کر دیا تھا۔

تغزل: شعر کے عام اوصاف کے علاوہ غزل کے اشعار میں خاص عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ جیسے نفاست و نزاکت، نکتہ سنجی، رمز و ایما، تعمیم، گداز، بے ساختگی اور جذبے کا سوز و گداز۔ ان عناصر کے مجموعے کو ''تغزل'' قرار دیا جاتا ہے مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ناسخ کی غزلیات تغزل سے عاری ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بھلے امام بخش ناسخ نے غزل کا سانچا استعمال کیا ہے مگر ان کے اشعار اس مخصوص لطافتِ شیرینی، شعریت، رمزیت اور تاثیر سے محروم ہیں

جن کا شمول غزل کے ایک شعر کو حقیقی طور پر غزل کا شعر بنا تا ہے۔

فی البدیہہ گوئی: کسی موقع کی مناسبت سے اور پیش از وقت غور و فکر کے بغیر شعر کہنے کو بدیہہ گوئی کہتے ہیں۔ بدیہہ گوئی میں شاہ نصیر اور مولانا ظفر علی خاں نے زیادہ شہرت پائی۔ فی البدیہہ شعر کہتے ہوئے کبھی کبھار کوئی بہت اچھا شعر بھی ہو جاتا ہے۔ عموماً فی البدیہہ گوئی میں شعرا ہزل گوئی کی طرف نکل جاتے ہیں۔

ہزل گوئی: غیر سنجیدہ کلام جس میں پھکڑ پن نمایاں ہو اور یہ محض ہنسنے ہنسانے کی کوشش دکھائی دے، ہزل گوئی کے زمرے میں آتا ہے اور جو بیہودہ باتیں کرتا ہے، اسے ہزل گو کہتے ہیں۔

پنڈت کیفی کے مطابق:

"جب مزاح میں عوامیت اور فحش داخل ہو جائے تو وہ ہزل ہے۔ اصل میں ہزل زندگی سے عاری رویہ ہے۔"

ابتذال: ذلیل و خوار بے قدر الفاظ کا استعمال کرنا اور محاورۂ عوام لانا جس سے خواص پرہیز کریں۔ ابتذال کہلاتا ہے مثلاً شبرات کی رات، چاہِ زم زم کا کنواں، پھولوں کا گلدستہ وغیرہ گویا غیر ثقہ اور سوقیانہ یا بازاری الفاظ و مضامین کلام میں لانا عوامیت اور رکاکت پیدا کرتا ہے، اس سے کلام مبتذل ہو جاتا ہے۔

ابہام: سعی ابلاغ کی ناکامی کو ادبی اصطلاح میں ابہام کہا جاتا ہے۔ شاعر یا ادیب ایک خاص بات (اپنا ما فی الضمیر) قارئین یا سامعین تک پہنچاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ الفاظ کا سہارا لیتا ہے اگر اس کے تخلیق کردہ الفاظ، اشعار یا جملے، قاری یا سامع تک ان خاص معنوں کے ابلاغ میں کامیاب نہ ہو سکیں تو کہا جائے گا کہ شعر یا عبارت میں ابہام ہے۔ مبہم شعر یا جملوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

بلاغت: کلام کا فصیح ہونے کے علاوہ مقتضائے حال کے مطابق ہونا بلاغت قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی لکھتے وقت کرداروں کی نفسیات اور زندگی کے مطابق زبان استعمال کرنا بلاغت کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً ایک تانگے والا اپنی سوچ اور ماحول کے مطابق ہی گفتگو کرتا ہے اگر اس کی زبان کو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی سمجھیں گے تو یہ خلاف فطرت ہوگا۔

سہل ممتنع: سہل کے معنی آسان کے ہیں جب کہ ممتنع دشوار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح میں ایسے شعر کو کہتے ہیں جس کی مثال بنانا دشوار ہو اگرچہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہو۔ سہل ممتنع کا کمال یہ ہے کہ مصرعوں کو اگر بول چال کی نثر میں تبدیل کیا جائے تو ترتیب الفاظ تک میں کوئی فرق نہ پڑے۔ مثلاً میر کا شعر ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

آفاقیت: آفاقیت کا لفظ آفاق سے نکلا ہے۔ اچھے ادب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک خاص دور اور ایک خاص ملک میں

پیدا ہونے کے باوجود، ہر ملک اور ہر دور کے لیے قابلِ قبول اور باعثِ تحسین سمجھا جاتا ہے۔ اسی خصوصیت کو آفاقیت کہتے ہیں۔ آفاقیت کی معنوی حدود میں ابدیت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ گویا آفاقیت کے دو جزو ہیں:

1۔ کسی ادب پارے میں ہر ملک و دیار کے لوگوں کو متاثر اور محظوظ کرنے کی صلاحیت۔

2۔ کسی ادب پارے میں ہر دور کے لوگوں کو متاثر و محظوظ کرنے کی صلاحیت۔

اسے ابدیت بھی قرار دیا جاتا ہے۔

ایمائیت: ایما کے معنی رمز و اشارہ، عندیہ یا غمزہ کے لیے جاتے ہیں۔ شعری اصطلاح میں کلام میں وارداتِ قلبی پر محض فکری اشارے نمایاں کرنا ایمائیت کہلاتا ہے لیکن یہ اشارے کنائے ایسی تخلیقی توانائی سے مرقع ہوتے ہیں کہ قاری کے سامنے بیان کا سارا منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔ دنیا میں بہترین اور عظیم شاعری ایمائیت کی تخلیقی توانائی سے بھری ہوئی ہے۔

خارجیت: خارج کی اصطلاح میں شاعر جذبات و احساسات اور کیفیات کی جگہ صرف خارجی لوازم اور متعلقات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ صرف ظاہری ماحول اور صورت اور اس کے لوازمات کو موضوع بناتا ہے۔ خارج داخل کی ضد ہے۔ شاعر اپنے کلام میں ظاہری حسن و جمال، سراپا اور محبوب کے خدوخال کی عکاسی پر توجہ دیتا ہے۔ گویا خارجیت بیرون بینی ہے۔

داخلیت: انسانی باطن اور اندرونی کیفیات و احساسات، قلبی واردات اور لطیف جذبوں اور نزاکتوں کو اشعار میں نمایاں کرنا داخلیت کہلاتا ہے۔ شعری دبستانوں میں داخلیت دلی کے دبستان کی خصوصیت قرار دی جاتی ہے۔ بقول استاد مکرم پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا:

''داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اپنے دل کی دنیا میں جھانک کر اس کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔''

رجائیت: شعر و ادب میں اشیا اور واقعات کا روشن پہلو دیکھنا اور مستقبل کے بارے میں پُر امید نقطۂ نظر رکھنا رجائیت کہلاتا ہے۔ اور ایسے شخص کو جس کے افکار میں رجائیت ہو رجائی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائیہ ہونا ضروری ہے۔''

گویا رجائیت امید پروری، امید پرستی اور خوش امیدی کا رویہ اور طبیعت کا یہ رجحان کہ ہر معاملے کا انجام اچھا خیال کرنا ہے۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے سوتے اسی رویے سے پھوٹتے ہیں۔

قنوطیت: بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مطابق:

''یہ نظریہ کہ دنیا بدترین مقام ہے اور ہر شے مائل بہ شر ہے، قنوطیت اور یاس کہلاتا ہے۔''

جہاں تک شعروادب کا تعلق ہے اشیاو واقعات کا تاریک پہلو دیکھنا، زندگی کو ناقابل زیست قرار دینا اور مستقبل کے بارے میں یاس و نومیدی کا شکار ہونا، قنوطیت کہلاتا ہے۔ فلسفے میں قنوطیت کا سب سے بڑا مبلغ شوپن ہار ہے جس کے نزدیک زندگی تمام تر شر اور شکست انسان کا مقدر ہے۔

کلاسیکیت: کلاسیکیت کا لفظ آغاز میں یونانی اور رومی اسالیب اور فن پاروں کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب ایسے ہر ادب پارے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو اپنی عظمتِ فن اور پائیدار خصوصیات کے باعث زمانے کی کسوٹی پر پورا اترا ہو۔ جب ایک فن پارے کو کلاسیکی قرار دیا جاتا ہے تو اس کے معنی بالعموم یہ لیے جاتے ہیں کہ اس میں مواد پر ہیئت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہیئت پرستی، قدامت پسندی، عقلیت، تنظیم، اصول پسندی اور اعتدال کلاسیکیت کے نمایاں خدوخال ہیں۔

رومانویت: رومانویت دراصل کلاسیکیت کی ضد ہے۔ وفورِ جذبات، آزادروی، نرگسیت، انانیت، انفرادیت پسندی، وسعت جنبش، فطرت پرستی، جدت طرازی، جوش و ہیجان، قرونِ وسطیٰ سے دلچسپی، فلسفیانہ تصوریت و مثالیت، ادبی، معاشرتی اور سیاسی قیود کے خلاف بغاوت، مافوق الفطرت، تحیر افروز اور پر اسرار امور سے دلچسپی، تصوف سے شغف غیر متمدن فطری زندگی کی طرف مراجعت، ہیئت پر مواد کی ترجیح رومانیت کے نمایاں خدوخال ہیں۔

غرابت: نظم ونثر میں نامانوس اور اجنبی الفاظ و محاورات اور تراکیب کا استعمال غرابت کے زمرے میں آتا ہے۔ جسے زبان دانی میں ایک نقص خیال کیا جاتا ہے۔

نرگسیت: نرگس ایک پھول کا نام بھی ہے جس کی مشابہت آنکھ سے دی جاتی ہے۔ اپنی اداؤں اور خدوخال پر عاشق ہونا نرگسیت کہلاتا ہے۔ یعنی اپنی ذات میں کھوئے رہنا اور خود سے محبت کرنا اور دوسروں کو خاطر میں نہ لانا نرگسیت ہے اور اسے ایک مریضانہ کیفیت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نفسیاتی بیماری میں کئی شعرا بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ خود پسندی حد سے گزر جائے تو وہ نرگسیت میں ڈھل جاتی ہے۔

ماورایت: ہماری سوچ اور فہم و ادراک سے ماورا حقیقت کو ماورائیت کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی ذہن اور تجربات کی حدوں سے ماورا ہو کر ان تجربوں کو بیان کرنا ماورائیت ہے یعنی اپنے آس پاس کے ماحول اور مادی حقائق سے ماورا ایک اعلیٰ حقیقت کو موضوع بنانا ماورایت کہلاتا ہے۔

حقیقت نگاری: شعروادب میں اشیا اشخاص اور واقعات کو کسی بھی قسم کے تعصب، عینیت، موضوعیت اور رومانیت سے آلودہ کیے بغیر دیانت اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش حقیقت پسندی یا حقیقت نگاری کہلاتی ہے۔ پریم چند کا افسانہ کفن حقیقت نگاری کی روایت میں ایک اہم سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ بقول روسی مصنف میکسم گورکی:

''بغیر کسی رنگ وروغن کے آدمیوں اور ان کی زندگی کا سچا بیان حقیقت نگاری کہلاتا ہے۔''

معاملہ بندی: عاشقانہ راز و نیاز کی تمام باتیں اور گھاتیں، محب اور محبوب کے آپس کے تمام معاملات کا بیان ''معاملہ بندی'' کے زمرے میں آتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں عشق کے نجی واقعات کو شعر میں ڈھالنا معاملہ بندی کہلاتا ہے۔ اردو شاعری کے لکھنوی دبستان میں جرأت وانشا اور دہلوی دبستان میں مومن، داغ اور حسرت موہانی کی غزلوں میں معاملہ بندی کے نقوش نمایاں ہیں۔ واضح ہو کہ معاملہ بندی کا تعلق عشقِ مجازی سے ہوتا ہے۔

علامتیت: علامت سے مراد، کسی شے، کردار یا واقعہ کا بطور مجاز اپنے سے ماورا کسی اور شے کی نمائندگی کرنا ہے۔ فیض احمد فیض کے مطابق علامت سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنھیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ شاعری کے لیے علامتی زبان کا استعمال بنیادی ضرورت ہے۔ ہر دور میں شعرا نے علامتی اظہار سے کام لیا ہے۔ ہر استعارہ ایک علامت ہے کیونکہ وہ اپنی لغوی حدود سے ماورا کسی اور چیز کی نشان دہی کرتا ہے۔

غیر منقوط: شاعری میں ایسے حروف کا استعمال کرنا جن میں نقطے نہ آئیں، غیر منقوط شاعری کہلاتا ہے۔ بہت سے شعرا نے ایسی شاعری کی ہے جن کے تمام الفاظ نقاط سے محروم ہیں۔ راقم الحروف نے بچشم خود دیکھا تو نہیں لیکن شنید ہے کہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ایک نورتن شیخ ابو الفیض فیضی (1547ء-1595ء) نے ''سواطع الکلام'' کے نام سے فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی جو امتدادِ زمانہ سے ناپید ہے۔ مثلاً میر انیس کی یہ بے نقط رباعی ملاحظہ کیجیے:

اعدا کو حرام کا مال ملا حُر کو اسد اللہ کا لال ملا
واللہ سرِ سرور ہوئے حُر حلہ ملا، معصومہ کا رومال ملا

تاریخ گوئی: علم الاعداد کی رو سے بعض الفاظ وتراکیب سے مادۂ تاریخ نکالنا تاریخ گوئی کہلاتا ہے۔ عموماً شعرا کسی شعر میں ایک مصرع یا دو تین لفظوں کے مجموعے سے مادۂ تاریخ نکالتے ہیں مثلاً:

تاریخِ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ''ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا''
1328 ہجری

اس شعر میں مولانا الطاف حسین حالی نے مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخِ وفات نکالی ہے جن کا انتقال 1328 ہجری بمطابق 1910ء کو ہوا تھا۔

بیت الغزل: غزل کے بہترین شعر کو بیت الغزل قرار دیا جاتا ہے تاہم اس کا انحصار قاری یا سامع کے ذوقِ سلیم پر ہوتا ہے۔

چوتھا باب

چند نثری اصطلاحات

ہر زبان کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں، جن کے پیش نظر اس زبان کو صحیح طور پر سیکھا، سمجھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔
اردو زبان کے بھی کچھ مسلّمہ اصول اور ضابطے ہیں جنھیں قواعد یا گرامر کہا جاتا ہے۔ قواعد کے دو حصے ہیں: صرف اور نحو۔

صرف: قواعد کا وہ حصہ جس میں مفرد الفاظ و حروف سے متعلق اس نوعیت کی بحث کی جاتی ہے کہ یہ لفظ واحد ہے یا جمع، مذکر ہے یا مؤنث، فعل ہے یا حرف، صرف کہلاتا ہے۔

نحو. قواعد کا وہ حصہ جس میں مرکب جملوں اور عبارتوں سے بحث کی جاتی ہے، نحو کہلاتا ہے مگر کہتے ہیں کہ:

صرف آتی ہے نہ بے عقل کو نحو آتی ہے

اداریہ: کسی اخبار یا رسالے کے مدیر یا مدیر اعلیٰ کا خاص مضمون ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے ایڈیٹوریل (Editorial) کہتے ہیں۔ یہ وہ تحریر ہے جو حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں کسی ہنگامی یا فوری پیش آمدہ مسئلے کے حوالے سے لکھی جاتی ہے تاکہ حکام اس پر توجہ دیں۔ اداریہ پر بالعموم مدیر کا نام نہیں ہوتا مگر یہ عموماً اخبار یا رسالے کی پالیسی کے تناظر میں لکھا جاتا ہے۔

اقتباس: اقتباس کے لغوی معنی ہیں روشنی لینا مگر ادب کی نثری اصطلاح میں کسی اور مصنف کی تحریر میں سے کوئی منتخب حصہ کسی خاص مقصد کے لیے اپنی تحریر میں درج کرنا اقتباس کہلاتا ہے۔ جسے واوین میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے مصنف کا مدعا و مقصد اپنی رائے یا مؤقف کی تائید ہوتا ہے۔

تصنیف: تصنیف کے لغوی معنی جدا کرنا یا جمع کرنا کے ہیں مگر نثری اصطلاح میں اس کے معنی مضمون یا کتاب لکھنا کے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی طبیعت سے کوئی نئی بات نکالتا یا کتاب لکھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ مصنف ہے اور اس نے یہ مضمون یا کتاب تصنیف کی ہے۔

تالیف: تالیف کے لغوی معنی ہیں الفت ڈالنا، دو چیزوں کو باہم ملانا جمع کرنا یا دوستی پیدا کرنا یا ترتیب دینا مگر ادب کی اصطلاح میں کسی ایک کتاب یا مختلف کتابوں کے مضامین کا نئے پرانے میں ترتیب دینا تالیف ہے اور تالیف دینے والا مؤلف کہلاتا ہے۔ تالیف، ترتیب اور تدوین مترادف الفاظ ہیں۔

تبصرہ: تبصرہ کے لغوی معنی ہیں بصارت دینا مگر اصطلاح میں کسی بات کے بارے میں روشنی ڈالنا یا اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا یا اس کی وضاحت یا تفصیل بیان کرنا تبصرہ کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اسے ریویو (Review) کہتے ہیں۔

اساطیر: اساطیر عربی میں اسطورہ کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی ہیں قصّے، کہانیاں یا کہاوتیں۔ اس طرح "اساطیر الاولین" کے معنی ہیں: برائے لوگوں کے قصّے کہانیاں۔ ادب کی اصطلاح میں نظم ونثر میں پرانی داستانوں یا قصّے کہانیوں کا بیان اساطیر کہلاتا ہے۔

اشاریہ: اشاریہ کا لفظ اشارہ سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی کنایہ یا ہاتھ یا آنکھ کی حرکت سے کوئی بات سمجھانا کے ہیں مگر ادب کی اصطلاح میں کسی کتاب کے مضامین یا مندرجات کی الف بائی ترتیب سے تفصیلی فہرست درج کرنا اشاریہ کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اسے انڈیکس (Index) کہتے ہیں۔

فرہنگ: فرہنگ، فارسی کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی عقل ودانش اور سمجھ بوجھ کے ہیں۔ فرہنگ کو عربی میں لغت اور انگریزی میں ڈکشنری کہتے ہیں۔

کسی کتاب میں طلبہ اور نئے قارئین کی سہولت کے لیے دقیق اور نا مانوس الفاظ ومحاورات اور تراکیب واصطلاحات کی تشریح کی غرض سے کتاب کے آخر میں فرہنگ ترتیب دی جاتی ہے۔ علمی، ادبی اور خاص طور پر کلاسیکی کتب میں فرہنگ کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ: ضمیمہ کا مادہ "ضم" ہے جس کے لغوی معنی ہیں ملانا یا شامل کرنا۔ چنانچہ وہ شے جو کسی اور شے پر بڑھا کر لگا دیں "ضمیمہ" کہلاتی ہے۔ تتمہ یا تکملہ اس کے مترادف الفاظ ہیں۔ جیسے کسی اخبار کا ضمیمہ جو اصل اخبار کے ساتھ شامل کر دیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں کسی کتاب یا مقالے کے آخر میں مصنف کوئی عکسی تحریر، خط، مخطوطہ یا مصاحبہ (انٹرویو) اس لیے شامل کر دیتا ہے تا کہ اس کے موقف کی تائید ہو سکے۔

مصاحبہ: مصاحبہ کو انگریزی میں انٹرویو (Interview) کہتے ہیں جو عام لفظ ہے۔ بیشتر لوگ چاہتے ہیں کہ انھیں ان کی پسندیدہ شخصیات کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملے۔ اس ضمن میں مصاحبہ بڑا کارگر ہوتا ہے۔ مصاحبہ کرنے والا کسی بڑی شخصیت سے اس کے خیالات وافکار معلوم کرنے کے لیے کچھ سوالات کرتا ہے۔ جن کے جوابات سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخصیت کو یہ مقام ومرتبہ کیسے حاصل ہوا۔ فی زمانہ تحریری شکل کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی آئے دن بڑے بڑے سیاست والوں یا عظیم شخصیات کے مصاحبے نشر ہوتے رہتے ہیں۔

سابقہ: سابقہ کے معنی پہلا یا اوّلین کے ہیں مگر اصطلاح میں سابقہ سے مراد وہ کلمہ یا علامت ہے جو نیا لفظ یا ترکیب بنانے کے لیے کسی لفظ کے شروع میں اس طرح لگائی جائے کہ اس لفظ کے معنی یا کیفیت کو کسی حد تک یا کسی طور پر تبدیل کر دے جیسے خوش اخلاق میں "خوش" اور شہسواروں میں "شہ" سابقہ ہے۔

لاحقہ: لاحقہ سے مراد وہ کلمہ یا علامت ہے جو نیا لفظ یا نئی ترکیب بنانے کے لیے کسی لفظ کے آخر میں اس طرح لگائی جاتی ہے

کہ اس لفظ کے معنی میں کوئی اضافہ یا تبدیلی کر دے جیسے نامہ بر، دلبر، راہبر، پیام بر، مفت بر وغیرہ میں "بر" لاحقہ ہے۔

مخطوطہ: مخطوطہ کو انگریزی میں Manuscript کہتے ہیں۔ مخطوطہ کے معنی ہیں قلمی نسخہ، دستاویز یا غیر مطبوعہ قلمی کتاب۔ اس میں نثری اور شعری دونوں طرح کا مواد شامل ہے۔ دنیا بھر کی لائبریریوں میں قیمتی مخطوطے موجود ہیں لیکن ان تک رسائی آسان نہیں۔ برصغیر کے سرکاری اور نجی کتب خانوں میں بھی بے شمار قیمتی مخطوطے محفوظ ہیں جن میں غیاث الدین بلبن اور اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے بھی شامل ہیں۔

تصوف: تصوف کا مادہ صوف ہے۔ جو عربی میں اُون سے کاتے ہوئے موٹے جھوٹے لباس کو کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ لباس مسیحی راہب پہنتے تھے، ان کی تقلید میں مسلمان زہاد بھی یہی لباس پہننے لگے۔ جو لوگ یہ لباس زیب تن کرتے تھے وہ "صوفی" کہلاتے تھے۔ اس کے پس منظر میں "تصوف" ایک اصطلاح بن گئی جس کا مفہوم دل سے نفسیاتی آلائشوں اور جسمانی خواہشوں کو دور کر کے اشیائے عالم کو خدا کا مظہر سمجھنا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک تصوف کے معنی کنارہ کرنا یا منہ پھیرنا کے ہیں۔

ترقی پسندی: اصطلاحی معنوں میں ترقی پسندی رجعت یا قدامت پرستی کا متضاد رویہ اور ادب برائے ادب کے نظریے سے بغاوت کی تحریک ہے۔ ترقی پسند تحریک جدید معاشی اور سائنسی نظریات کے حامل اور ترقی کے خواہاں افراد کی تحریک ہے۔ برصغیر میں اس کا آغاز 1936ء میں ہوا۔ یہ انگریزی لفظ Progressive کا ترجمہ ہے اور اس کا منشور سبع تر فلسفیانہ اور سائنسی تشریحات کا متقاضی ہے۔ ترقی پسند لوگ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ادب کو زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں سے الگ کر کے ان گوشوں سے ہم کنار کریں جن میں زندگی رہتی اور رواں دواں ہوتی ہے۔

جدیدیت: جدیدیت کے معنی نیا پن یا جدید ہونے کی کیفیت کے ہیں۔ یہ دراصل ماڈرنزم (Modernism) کا اردو ترجمہ ہے۔ ادب کی اصلاح میں جدت قامت کا متضاد لفظ ہے اور یہ قامت پسندی کے رویوں کا برعکس رویہ ہے یعنی ماضی پرستی سے گریز جدیدیت کی تعریف میں شامل ہے۔ زیادہ تفصیل میں جائیں تو جدیدیت عقلی، علمی اور منطقی طور پر دنیا کو رجائیت اور ایقان کے ساتھ خوش خرامی اور خوش انجامی کی طرف دیکھنے اور اس کے لیے تگ و دو کا نام ہے۔

تذکرہ: تذکرہ کے معنی ہیں: ذکر یا بیان مگر ادب کی اصطلاح میں تذکرہ اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں شاعروں کے حالات و واقعات کا مختصر حال اور ان کا نمونہ کلام درج ہو۔ انگریزی میں اسے (Reminiscence) کہتے ہیں۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا فروغ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

پانچواں باب

چند اصنافِ نظم

مفہوم اور تعارف

نظم عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ''موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا'' کے ہیں لیکن ادب کی اصطلاح میں لفظوں کا معینہ ضابطوں کے مطابق استعمال ''نظم'' کہلاتا ہے اور یہ لفظ ''نثر'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اصنافِ نظم کو عام طور پر دو حیثیتوں سے تقسیم کیا جاتا ہے:

(الف) موضوعاتی لحاظ سے (ب) ہیئتی اعتبار سے

موضوعاتی لحاظ سے شاعری کی اہم اقسام درج ذیل ہیں:

حمد، مناجات، نعت، منقبت، قصیدہ، غزل، مرثیہ، شہرآشوب، تحریف (پیروڈی) تضمین، گیت اور کافی

اور ہیئتی لحاظ سے اہم اقسام درج ذیل ہیں:

مثنوی، رباعی، قطعہ، مخمس، مسدس، نظم معرٰی، سانیٹ، آزاد نظم، دوہا، بارہ ماسہ، ہائیکو، ماہیا اور مستزاد وغیرہ

اصنافِ نظم بہ لحاظ موضوع

حمد

حمد ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں خداتعالیٰ کی شان، بزرگی اور عظمت کو بیان کیا جاتا ہے۔ حمد کا لفظ باری تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے جب کہ ثنا کا لفظ انسان کے لیے ہے۔ حمد کے لیے کوئی خاص بحر یا ہیئت مقرر نہیں مگر اردو شاعری میں حمد کو ایک خاص تقدس اور مقام حاصل ہے۔ ماضی کے بیشتر اردو شعرا جب بھی اپنا دیوان تیار کرتے تھے تو اس کا آغاز حمد سے کرتے تھے۔ حوالے کے طور پر بعض حمدوں کے ابتدائی شعر ملاحظہ کیجیے:

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے (میر درد)

کامل ہے جو ازل سے، وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک، وہ ہے جلال تیرا (حالی)

دوسرا کون ہے، جہاں تُو ہے
کون جانے تجھے، کہاں تُو ہے (امیر مینائی)

یہاں بھی تُو، وہاں بھی تُو، زمیں تیری، فلک تیرا
کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا (داغ)

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تُو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے (ظفر علی خاں)

نعت

نعت کے لغوی معنی وصف کے ہیں لیکن اس کا استعمال آنحضرت ﷺ کی ستائش وثنا کے لیے مخصوص ہے۔ گویا نعت وہ صنفِ نظم ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔ حمد کی طرح نعت کی بھی کوئی مخصوص بحر یا وزن مقرر نہیں ہوتا مگر نعت کو بھی ہماری اردو شاعری میں ایک تقدس اور بلند درجہ حاصل ہے۔ قدیم و جدید اردو شاعری نے نعت گوئی میں عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ شاید ہی کوئی طالب علم ہوگا جس نے نعت رسول ﷺ کے یہ شعر نہ سنے ہوں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ (مولانا حالی)

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تمھی تو ہو ہم جس میں بس رہے ہیں، وہ دنیا تمھی تو ہو
سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمھی تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے اے تاجدار یثرب و بطحا تمھی تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاںؐ اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو (ظفر علی خاں)

حمد کی طرح نعت بھی قدیم صنفِ شاعری ہے اور تقریباً ہر شاعر نے اپنی بساط کے مطابق نعت کہنے کا اہتمام ضرور کیا ہے، یہاں تک کہ کچھ ہندو اور مسیحی شعرا نے بھی کثرت سے نعتیں کہی ہیں مگر اس ضمن میں مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، امیر مینائی، محسن کاکوروی، احمد رضا خاں بریلوی، ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، مظفر وارثی اور حفیظ تائب کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔

❁

مناجات

مناجات کے لغوی معنی ''باہم راز و نیاز کہنا'' کے ہیں مگر اصطلاح میں مناجات ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں خدا کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنی عاجزی و فروتنی ظاہر کر کے دعا اور التجا کی جائے۔ حمد اور مناجات میں معنوی طور پر یہ فرق ہے کہ حمد میں خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کی جاتی ہے لیکن مناجات میں عام طور پر دعائیہ یا التجائیہ انداز ہوتا ہے یعنی مناجات میں بندہ اپنے پروردگار سے کچھ طلب کرتا ہے۔ جیسے: اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی مناجات کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

یا رب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم ''بچے کی دعا'' تمام طلبہ کو ازبر ہے۔ یہ نظم بھی مناجات ہے۔ اس مناجات کا پہلا اور آخری شعر ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو، اُس راہ پہ چلانا مجھ کو

مولانا ظفر علی خاں کے کلام سے مناجات کے یہ دو شعر اور ملاحظہ کیجیے:

الٰہی برقِ غیرت کی تڑپ مجھ کو عطا کر دے!
مجھ آتش زیرِ پا کو ساتھ ہی آتش نوا کر دے!

دیا ہے علم اگر تو نے تو ساتھ اس کے عمل بھی ہو
کہ شرحِ لیسَ لِلا انسانِ اِلّا ما سعیٰ کر دے!

❁

منقبت

منقبت بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تعریف و توصیف، صفت و ثنا، ذاتی خوبی اور خاندانی فضیلت و برتری وغیرہ کے ہیں مگر اصطلاحِ شعر میں منقبت سے مراد ایسی صنفِ نظم ہے جس میں صحابہ کرام، اولیائے عظام اور بزرگانِ دین کے اوصاف و مناقب بیان کیے جاتے ہیں۔ محسن کاکوروی کی ایک منقبت بہ عنوان: ''آل واصحاب خیر الانام'' سے یہ چند شعر دیکھیے:

ابوبکر رضی اللہ عنہ ، لاثانیِ روزگار — کہ تھا ثانی، اثنینِ یارانِ غار

عمر رضی اللہ عنہ ، نام و ناموسِ آدم آوری — معمائے اسرارِ پیغمبری

تجلی جلوہ عثمان رضی اللہ عنہ عالی مقام — انیسِ پیمبر علیہ السلام

علی رضی اللہ عنہ ، شیرِ یزدان و عالی وقار — ید اللہ اور قبضے میں ذوالفقار

قصیدہ

قصیدہ عربی مصدر ''قصد'' سے بنا ہے جس کے لغوی معنی قصد (ارادہ) کرنے کے ہیں جس سے ثابت ہے کہ یہ وہ صنفِ نظم ہے جو ارادی طور پر وجود میں آتی ہے اور شاعر ارادتاً کسی کی مدح و ستائش کرتا ہے اور اس ضمن میں وہ بعض اوقات زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔

قصیدہ بہت پرانی صنفِ سخن ہے اور یہ عربی کے علاوہ فارسی میں بھی وافر ذخیرے کی صورت میں موجود ہے۔ قصیدے اور غزل کی ہیئت ایک ہی ہے۔ وہی مطلع و مقطع اور وہی آغاز سے اختتام تک ردیف اور قافیے کا اہتمام۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کسی زمانے میں غزل بھی قصیدے ہی کا حصہ ہوتی تھی جسے نشیب یا تشبیب یا تمہید کہا جاتا ہے۔

قصیدے کو عام طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1- تشبیب: یہ قصیدے کا ابتدائی حصہ ہے جس میں شاعر جذباتِ محبت یا خوبصورت فطری مناظر کا ذکر کرتا ہے اور جس کی انتہا سے ممدوح کی مدح کا آغاز ہوتا ہے۔

2- گریز: اس حصے میں ایک دو ایسے شعر ہوتے ہیں جو تشبیب کو مدح سے ملاتے ہیں۔

3- مدح: یہ وہ حصہ ہے جس کی خاطر شاعر قصیدہ لکھتا ہے۔ اس حصے میں شاعر اپنے ممدوح کی خوب تعریف و توصیف کرتا ہے اور اپنی فصاحت و بلاغت اور چرب زبانی کے دریا بہا دیتا ہے۔

4- دعا: یہ قصیدے کا آخری حصہ ہے، اس میں شاعر اپنے ممدوح کو دعائیں دیتا ہے اور بعض اوقات حسنِ گفتار کے ذریعے اپنا صلہ بھی طلب کرتا ہے مثلاً مرزا غالب کے قصیدے کے یہ دو دعائیہ شعر دیکھیے جو انھوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کیے تھے:

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام   شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اردو قصیدہ گوئی کے حوالے سے مرزا محمد رفیع سودا اور ابراہیم ذوق کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مومن خان مومن، مرزا غالب اور مولانا حالی کے قصیدے بھی بہت معروف ہیں۔ مگر اب قصیدہ گوئی پر ایک قسم کا زوال آ چکا ہے کیوں کہ نہ وہ مدح و ستائش کے خواہش مند بادشاہ رہے، نہ ان کے درباری شعرا اور نہ ہی مربی و محسن قسم کے لوگ اور نہ ہی اس نوعیت کے شاعر جو حکمرانوں کے دستِ نگر رہتے تھے۔ اس لیے اب کوئی شاعر شاذ و نادر ہی قصیدہ گوئی کی طرف مائل ہوتا ہے۔

❁

ہجو

ہجو کے لغوی معنی ہیں برائی کرنا [illegible] کسی کو برا بھلا کہنا۔ جن اوصاف پر قصیدے کی بنیاد قائم ہوتی ہے، انھی کے سلب کرنے کا نام ہجو ہے۔ چنانچہ ہجو قصیدے کا متضاد لفظ ہے۔ اہلِ عرب میں [illegible] قصیدے کا دستور تھا، وہاں ہجو بھی کہی جاتی تھی۔ عرب شعرا جب کسی کی مدح کرنے پر آتے تو ممدوح کو آسمان پر چڑھا دیتے اور جب کسی کی ذم کرنے پر آتے تو اسے زمین پر گرا دیتے لیکن عربوں کے ہاں مدح و ذم کے کچھ اصول تھے جن کی پیروی کرنا وہ لازم سمجھتے تھے۔ مثلاً وہ ہجو میں فحاشی و بدزبانی نہیں کرتے تھے مگر ہجو فارسی کے راستے اردو میں آ گئی تو اردو شعرا نے فارسی شعرا کی دیکھا دیکھی اردو میں جو ہجویں لکھیں، اُن میں فحاشی اور بدزبانی سے اس قدر کام لیا گیا ہے کہ ان کو مہذب لوگوں کی مجلس میں نہیں پڑھا جا سکتا۔

اردو غزلوں میں واعظ، زاہد، محتسب اور شیخ وغیرہ کی شان میں جو اشعار کہے گئے ہیں، وہ بھی ہجو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اساتذہ کی غزلیات میں سے درج شعر ملاحظہ کیجیے، یہ تمام اشعار ہجویہ ہیں۔

درد: ہم نے کہا بہت اسے پر نہ ہوا یہ آدمی   زاہدِ خشک بھی کوئی سخت خر دماغ ہے

حالی: دیکھیے شیخ! مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے   صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے   یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

گھر میں برکت ہے مگر تیغ سے چاری شیخ [illegible]   کچھ نہ کہا شیخ، مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ   ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

❁

غزل

غزل چونکہ اہم ترین صنفِ شاعری ہے اس لیے اس کا بیان قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

مفہوم اور تعارف: اصنافِ سخن میں غزل اہم ترین صنفِ شاعری ہے۔ اردو شعری ادب میں سب سے زیادہ سرمایہ بھی غزل ہی کا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں عشق و محبت کا ذکر ہوتا ہے اور شاعر اپنے فکر و خیال کا اظہار علائم و رموز کے ذریعے نہایت لطیف پیرائے میں کرتا ہے۔

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا کے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب غزال (ملک عرب کا نہایت خوبصورت آہو) کو شکاری کتے دبوچنے کو ہوں تو اس کے مُنھ سے اس وقت جو دردناک چیخ نکلتی ہے، اسے غزل کہتے ہیں۔ گویا غزل میں عشق و محبت اور سوز و درد کا بہت نمایاں ہونا ضروری ہے مگر بقول فیض:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا

آہستہ آہستہ غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اب غزل میں ہر موضوع لایا جانے لگا ہے بلکہ کچھ قد آور شاعروں مثلاً علامہ اقبال ؒ، مولانا ظفر علی خاں اور فیض احمد فیض وغیرہ نے غزل کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور غزل میں ہر قسم کے افکار و خیالات اور مشاہدات و تجربات کو پیش کیا جاتا ہے۔

ہیئتِ ترکیبی: تعداد میں غزل کے اشعار کم از کم پانچ اور کثرت میں بیس پچیس بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو سکتے ہیں مگر اشعار کی تعداد کا طاق ہونا ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ (قافیے کا ہونا ضروری ہے، ردیف کا ہونا ضروری نہیں) اگر تیسرا اور چوتھا مصرع بھی ہم قافیہ و ہم ردیف ہو تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے بعد غزل کا ہر دوسرا مصرع ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ پوری غزل ایک ہی بحر میں کہی جاتی ہے۔ بحر چھوٹی ہو یا بڑی البتہ غزل کے لیے بالعموم مترنم بحروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں اور اس میں شاعر بالعموم اپنا تخلص بھی استعمال کرتا ہے۔ کسی زمانے میں غزل قصیدے ہی کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک قصیدے اور غزل کی ہیئت ایک ہے۔

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ جداگانہ مفہوم کا حامل ہوتا اور ایک علیحدہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے، جو قافیہ اور ردیف کے ذریعے پوری غزل سے منسلک ہوتا ہے لیکن اساتذہ کے یہاں مسلسل مضمون کی حامل غزلیں بھی مل جاتی ہیں۔ عوام و خواص میں صنفِ غزل سب سے زیادہ مقبول ہے۔

دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل کی زبان بالعموم سادہ، سلیس، شستہ اور رواں ہوتی ہے اور اس میں ایک بانکپن ہوتا ہے۔تشبیہ اور استعارہ اور صنائع بدائع کا موزوں اور مناسب استعمال غزل میں حسن اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مرنے والے کا ذکرِ خیر کرنا۔ اصطلاح میں مرثیہ ایسی صنفِ نظم ہے جس میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اور اس کے مصائب و آلام کا ذکر ہو خصوصاً ایسی نظم جس میں شہدائے کربلا کی شہادت کے واقعات اور حادثات کا دردانگیز بیان کیا جائے۔

علامہ اقبال ؒ نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے عنوان سے اس وقت مرثیہ لکھا جب وہ حصولِ تعلیم کی غرض سے جرمنی میں مقیم تھے۔ یہ اردو کا ایک یادگار مرثیہ ہے۔ دو ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ! میرا انتظار　　کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا　　اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

اور اسی مرثیے کا آخری شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا وہ بھی بڑا دلآویز اور اردو شعری ادب میں بڑا معروف ہے۔

اس کا ایک شعر ہے:

ایک روشن دماغ تھا ، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا ، نہ رہا

ایک لحاظ سے مرثیے کی صنف شہدائے کربلا کے مناقب و مصائب بیان کرنے کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نوعیت کے مرثیے کے مندرجہ ذیل نو حصے ہوتے ہیں:

1- تمہید 2- سراپا 3- رخصت 4- آمد 5- رجز 6- جنگ 7- شہادت 8- بین 9- دعا

آسمانِ مرثیہ کے سب سے درخشندہ ستارے میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔ ان دونوں شاعروں کا زمانہ بھی ایک ہے اور یہی

زمانہ مرثیے کا سنہری دور تھا۔ ان دونوں شاعروں نے اپنی افتادِ طبع سے اردو مرثیے کو اس قدر بلند سطح پر پہنچا دیا کہ اردو مرثیہ بیانیہ شاعری کا بہترین نمونہ قرار پایا۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے خاندان نے، خاص طور پر میر انیس نے، جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں اُس وقت تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ میر انیس کے خاندان نے جس طرح پانچ پشتوں تک مرثیے کے پودے کی آبیاری کی اور اسے ایک شجرِ سایہ دار بنایا، یہ اسی کا کام تھا۔ میر انیس اس بات پر فخر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؓ کی مداحی میں

اور اسی حوالے سے انھوں نے ایک قطعے میں اپنے بارے میں جو تعلّی کا اظہار کیا ہے، وہ بجا ہے:

میری قدر کر اے زمینِ سخن! تجھے بات میں آسماں کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

❁

شہرآشوب

آشوب کے لغوی معنی ہیں ''بربادی، بگاڑ یا فتنہ وفساد'' اصطلاحِ شاعری میں شہرآشوب ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی پریشانی، گردشِ آسمانی اور زمانے کی ناقدری کا بیان ہو۔

کسی زمانے میں اردو میں بڑی کثرت سے شہرآشوب لکھے گئے۔ مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر کے شہرآشوب، جن میں عوام کی بے روزگاری، اقتصادی بدحالی اور دلّی کی تباہی و بربادی کا ذکر ہے، اردو کے یادگار شہرآشوب ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے شہرآشوبوں میں آگرے کی معاشی بدحالی، فوج کی حالتِ زار اور شرفا کی ناقدری کے خوب صورت مرقعے پیش کیے ہیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد دلّی پر جو قیامت ٹوٹی، اسے بھی دلّی کے بیشتر شعرا نے اپنا موضوع بنایا ہے، جن میں بطورِ خاص مرزا غالب، داغ دہلوی اور مولانا حالی شامل ہیں۔

مرزا محمد رفیع سودا کے ''مخمس شہرآشوب'' کا یہ پہلا بند ملاحظہ کیجیے جس میں ناقدریِ زمانہ اور دلّی میں بے روزگاری کا گلہ کیا گیا ہے:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو، لے کے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تُو کہ ہے یہ ٹھٹھول

بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

شہرآشوب کے حوالے سے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم ''صِقلیہ'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ صِقلیہ (جزیرۂ سسلی) بحرِ روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے پر پانچ سو سال تک مسلمان حکمران رہے مگر پھر یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا گزر یورپ جاتے ہوئے یہاں سے ہوا تو اس جزیرے کو دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو رو دیا۔ اس شہرآشوب کے چند ابتدائی شعر ملاحظہ کیجیے:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

❁

تحریف (پیروڈی)

تحریف عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''کسی چیز کو اس کی اصل حالت سے تبدیل کرنا یا بدل کر کچھ کا کچھ کر دینا۔'' انگریزی میں اسے پیروڈی (Parody) کہتے ہیں۔ پیروڈی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ شعر میں اس طرح کی کتر بیونت کرنا جس سے اصل معنی بدل جائیں اور کچھ دل چسپ مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اصطلاحِ شعر میں تحریف وہ صنفِ نظم ہے جو کسی کے طرزِ نگارش کی نقل میں اس طرح لکھی گئی ہو کہ الفاظ و خیالات کا اس انداز سے دھارا بدل دیا جائے کہ مزاحیہ تاثرات پیدا ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں تحریف کو مضحکہ خیز تصرف بھی کہا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ تحریف نثر میں بھی کی جاتی ہے مگر اس وقت ہمارا رُوئے سخن نظم کی طرف ہے۔ اردو شعرا میں اکبر الہ آبادی، سیّد محمد جعفری، مجید لاہوری، راجا مہدی علی خاں، سیّد ضمیر جعفری وغیرہ نے کامیاب پیروڈیاں کہی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

اصل شعر: کہا اُس بت سے مرتا ہوں، تو مومن کہا میں کیا کروں، مرضی خدا کی (مومن)

پیروڈی: کہا جب ان سے کہ مرتا ہے اکبر کہا ہم کیا کریں، مرضی ہماری (اکبر)

اصل شعر: دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں (درد)

پیروڈی: لڑنے بھڑنے کے لیے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں (اکبر الہ آبادی)

علامہ اقبال ؒ کی نظم "جواب شکوہ" کے دو شعر اور ان کی پیروڈیاں دیکھیے:

اصل شعر: فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (علامہ اقبال ؒ)

پیروڈی: فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
جن سے جیتیں گے الیکشن یہ وہی گھاتیں ہیں (سیّد محمد جعفری)

اصل شعر: یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو! (علامہ اقبال ؒ)

پیروڈی: ہم میں سیّد بھی ہیں، مرزا بھی ہیں، افغان بھی ہیں
ہم سبھی کچھ ہیں، یہاں تک کہ مسلمان بھی ہیں (سیّد محمد جعفری)

تضمین

تضمین کا لفظ "ضمن" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ضمن میں لیا ہوا، شامل کرنا یا چسپاں کرنا مگر اصطلاحِ شعر میں کسی دوسرے شاعر کے شعر کو اپنی نظم میں داخل کر لینے کو "تضمین" کہتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں لیکن بالعموم دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر اپنے کلام میں کسی اور شاعر کا ایک آدھ ہم قافیہ مصرع، یا شعر، واوین کی علامت لگا کر شامل کر لیتا ہے، اس طرح شاعر کا کلام مزید موقر و معتبر ہو جاتا ہے کہ اس کے خیالات کی توثیق ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال کو تضمین کا فن بڑا مرعوب ہے اور ان کا عمومی انداز یہ ہے کہ کسی قدیم شاعر کا ایک آدھ شعر منتخب کر کے اس پر اپنی نظم کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔ اس حوالے سے صرف "بانگِ درا" میں ان کی متعدد نظمیں موجود ہیں۔ مثلاً تصویرِ درد، نالہ فراق، عبدالقادر کے نام، شبلی و حالی، ارتقا، دنیائے اسلام وغیرہ۔

علامہ اقبال کی ایک نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں جس کا پہلا شعر ہے:

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

غنی کاشمیری کے اس شعر کو تضمین کیا ہے:

"غنی روزِ سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

تضمین کی ایک دو مزید مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سید محمد جعفری: "یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے" — ہر شخص مجھ کو آنکھ دکھاتا ہے کس لیے

یہ امتحان مچھلی پھنسانے کا جال ہے ''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے''

انور مسعود: ہر ایک عہد میں زندہ ہے میر کا مصرع کسی سے جس کی صداقت ڈھکی چھپی نہ رہی
نظام برق لیا واپڈا نے ہاتھوں میں ''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''

گیت

گیت ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''تعریف'' کے ہیں۔ یہیں سے ''گیت گانا'' محاورہ بن گیا ہے جس کا مفہوم ہے تعریف وتوصیف کرنا۔ اصطلاح میں گیت وہ صنفِ نظم ہے جس میں ایک عورت، مرد کو مخاطب کر کے جذباتِ محبت کا اظہار کرتی ہے۔ گیت میں بالعموم ہجر وفراق کی کیفیت کو والہانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ بعض گیتوں میں محبت کا اظہار مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے مگر گیت کا بنیادی طور پر مزاج یہ ہے کہ عورت کی جانب سے اظہارِ محبت ہوتا ہے۔

اردو میں گیت کی صنف ہندی سے آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو گیتوں میں ہندی کے کومل الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اردو ڈراموں اور فلموں میں عوام الناس کی پسند ناپسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے گیت کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ گیت یا گانا ہندی فلموں کا تو جزوِ لاینفک ہے، چنانچہ لوگوں کی طلب کے پیشِ نظر شاعر اس صنف کی طرف بھی راغب ہوئے۔ اردو میں اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، میراجی، ساحر لدھیانوی، قیوم نظر، مجروح سلطان پوری، وقار انبالوی، شکیل بدایوانی، قتیل شفائی، منیر نیازی اور جمیل الدین عالی نے فلموں کے لیے گیت لکھ کر بڑا نام کمایا ہے۔

''میراجی کے گیت'' کتاب سے گیتوں کے دو مختصر بند ملاحظہ کیجیے:

(1) پھر آس بندھی ہے من کی پھر جلی جوت جیون کی
لو! جلی جوت جیون کی
اب دور ہوا اندھیارا اب رُوپ نیا ہے سارا
اب جھلمل جھلمل تارے اب جگمگ چاند ہے پیارا
پھر آس بندھی ہے من کی پھر جلی جوت جیون کی

(2) پیا پیا رٹے جائے پپیہا، بَیری بول سنائے کیسے کروں پیا آئے، کیسے سُونا آنگن بھائے
پیا پیا رٹے جائے پپیہا ......
داتا سے جب مانگے بھکاری، جو مانگے سو پائے مانگ مانگ کر بول تھکی میں، اب ہے اکیلی ہائے

کافی

کافی پنجابی، سرائیکی اور سندھی کی بڑی مقبول صنفِ نظم ہے۔ اس میں وحدت الوجود، فنا و بقا، دنیا سے بے تعلقی، دنیا کی بے ثباتی اور عرفان و مستی جیسے صوفیانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں، چنانچہ یہ صوفیہ کی پسندیدہ صنفِ نظم ہے۔ پنجابی اور سرائیکی ادب میں شاہ حسین، بابا بلھے شاہ اور خواجہ غلام فرید کی کافیاں بڑی مشہور ہیں جنھیں لوگ جھوم جھوم کر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔

کافی کی کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں لیکن یہ بالعموم مترنم بحروں میں کہی جاتی ہے۔ کافی کی ایجاد کا سہرا شاہ حسین (1538ء-1599ء) کے سر ہے۔ جن کی یاد میں آج بھی شالامار باغ کے باہر میلہ چراغاں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ شاہ حسین کی یہ ایک کافی ملاحظہ کیجیے۔

کر کر سمجھ نداناں گھر بجھے ای نداناں — آپ کمینہ، تیری عقل کمینی، کون کہے تو داناں

انہیں راہیں جاندے ڈٹھڑے میر ملک سلطاناں — اپے مارے مارے اپے جیوانے، عزرائیل بہاناں

کہے حسین فقیر سائیں دا، بن مصلحت اٹھ جاناں

اسی طرح بابا بلھے شاہ (1680ء۔1757ء) کی کافیاں بھی بڑی معروف اور زبانِ زدِ خاص و عام ہیں۔ ان کی کافی کا یہ ایک شعر بڑا دلآویز ہے:

بلھے شاہ تے شاہاں مکھڑا گھونگھٹ کھول دکھائیں
اپنے سنگ رلائیں پیارے، اپنے سنگ رلائیں

اسی طرح خواجہ غلام فرید (1845ء۔1901ء) کی کافیاں بھی بڑی مشہور ہیں اور لوگ انھیں عقیدت سے وجد میں آ کر پڑھتے ہیں اور یہ کافیاں سرائیکی خطے کے لوگوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں مثلاً ان کی کافی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کیا حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ مل دا

❀❀

اصنافِ نظم بہ لحاظ ہیئت ترکیبی

مثنوی

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے جو "مثنیٰ" سے نکلا ہے جس کے معنی "دو دو" کے ہیں۔ اصطلاح میں مثنوی ایسی صنفِ سخن ہے جس میں کوئی مسلسل بات بیان کی جائے مگر تمام اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ ہر شعر کا قافیہ جدا اور ہر دو مصرعے ہم قافیہ یا قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اردو غزل کے برعکس اس میں ہر شعر کے بعد قافیہ یا قافیہ اور ردیف بدل جاتی ہے مگر کل مثنوی ایک ہی وزن میں ہوتی ہے۔ یہ صنف بالعموم طویل داستانیں یا قصے کہانیاں بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے اشعار کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں۔

فارسی میں مثنوی کی صنف سے بڑے بڑے مقاصد حاصل کیے گئے ہیں بلکہ مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ تو فارسی میں قرآن کا درجہ رکھتی ہے:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اردو میں بعض دیگر اصناف کی طرح مثنوی کا آغاز بھی دکن سے ہوا مگر اس نے جلد ہی شمالی ہندوستان میں مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے۔ اردو مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، خواجہ میر اثر، میر حسن، نسیم لکھنوی، مرزا شوق، مولانا حالی اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ اس صنفِ سخن کے سلسلے میں جو شہرت میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور نسیم لکھنوی کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کو حاصل ہے وہ دوسروں کے حصے میں کم آئی ہے۔ مولانا حالی کے خیال میں مثنوی تمام اصنافِ سخن میں سب سے کارآمد صنفِ سخن ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مثنویاں، مناجاتِ بیوہ، برکھا رُت، نشاطِ امید، حبِ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف اردو شعری ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

مثنوی کی افادیت کے پیشِ نظر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سب سے زیادہ اسی صنف کو برتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی معروف نظم "ساقی نامہ" بھی، جسے اُن کی شاعری کا ماحاصل کہا جاتا ہے، مثنوی کی ہیئت میں ہے۔

"ساقی نامہ" سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شراب کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا!

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا مری خاک جگنو بنا کر اڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے دلِ مرتضیٰ ؓ، سوزِ صدیق ؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

رباعی

رباعی کا لفظ عربی مصدر ''ربع'' سے نکلا ہے، جس کے معنی ''چار چار'' کے ہیں۔ اصطلاحِ سخن میں رباعی اس مختصر نظم کو کہا جاتا ہے جو فقط چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ چوتھا مصرع حاصلِ رباعی (حاصلِ گفت گو) کہلاتا ہے اور شاعر پہلے تین مصرعوں کا تانا بانا چوتھے مصرعے کے لیے بُنتا ہے۔ رباعی میں موضوع کی کوئی قید نہیں لیکن عام طور پر اس صنفِ سخن کو صوفیانہ اور اخلاقی مضامین بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اصنافِ سخن میں رباعی ایک مختصر مگر بڑی موقر و ممتاز اور دل آویز صنفِ سخن اور اخلاقی شاعری کا سب سے عمدہ نمونہ ہے۔ رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے اور صرف ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنفِ نظم اردو شاعری کے کلاسیکی دور سے لے کر جدید دورِ شاعری تک شاعر کے قدرتِ کلام کو پرکھنے کی کسوٹی رہی ہے۔

اردو کے رباعی گو شعرا میں میر درد، مرزا غالب، میر انیس، مولانا حالی، اکبر الٰہ آبادی علامہ اقبال ؒ، امجد حیدر آبادی، جوش ملیح آبادی اور عمر فیضی کے نام بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ یہ دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے بلبل کی زباں پہ گفت گو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا جس پھول کو سونگھتا ہوں، بُو تیری ہے (میر انیس)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو، اپنی کرن سے! (اقبالؒ)

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑا یا جزو کے ہیں مگر اصطلاحِ سخن میں دو یا دو سے زیادہ شعروں کو، جو موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متعلق ہوں، قطعہ کہتے ہیں۔ قطعہ دو شعر سے کم کا نہیں ہوتا اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں مگر قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا بلکہ قطعہ کے پہلے مصرعے میں قافیہ لانا معیوب ہے۔ قطعہ کو قطعہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ مطلع چھوڑ کر قصیدے یا غزل کا ٹکڑا ہوتا ہے۔

قطعہ کے لیے موضوع یا وزن کی کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ قطعہ نگار ہر طرح کے واقعات اور جذبات و احساسات کو نظم کر سکتا ہے بشرطیکہ قطعے کے تمام مصرعے مل کر ایک مفہوم دیں۔

اردو کے بیشتر شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی اور میر و سودا کو یہ صنف بڑی مرغوب تھی۔ علاوہ ازیں اس صنف کے حوالے سے ذوق، مومن، غالب، شیفتہ، مولانا حالی، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، احمد ندیم قاسمی اور موجودہ دور کے ہر دل عزیز شاعر انور مسعود کے نام بڑے اہم ہیں۔ دو قطعے ملاحظہ کیجیے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہِ بے خبر! — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا (میر تقی میر)

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ (اقبالؒ)

مُسَمّط

مُسَمّط عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "پروئی ہوئی چیز یا موتیوں کو لڑی میں پرونا" مگر اصطلاح میں مسمط ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں تین سے لے کر دس مصرعے تک ہوں۔ اگر نظم تین تین مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہے تو اسے مثلث، چار چار مصرعوں والی نظم کو مربع، پانچ پانچ مصرعوں کے بندوں پر مشتمل نظم کو مخمس اور چھے چھے مصرعوں والی نظم کو مسدس کہتے ہیں۔ سات

سات، آٹھ آٹھ، نو نو اور دس دس مصرعوں کے بندوں پر مشتمل نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔

اردو شعری ادب میں مخمس اور مسدس لکھنے کا رواج چونکہ کلاسیکی دور ہی سے چلا آ رہا ہے اس لیے ان دو ہیئتوں کے بارے میں ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

❁

مخمس

مخمس کا لفظ خَمس سے نکلا ہے جس کے معنی ''پانچ'' کے ہیں مگر اصطلاحِ شاعری میں مخمس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی بالعموم دو صورتیں ہوتی ہیں:

(i) پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتے ہیں اور اس کے بعد ہر بند کا پانچواں مصرع پہلے بند کے ہر مصرعے کا ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔

(ii) ہر بند کا پانچواں مصرع بار بار دہرایا جاتا ہے جس سے شاعر کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے پانچویں مصرعے میں جو بات کہی ہے وہی اصل بات ہے اور وہی نظم کا مرکزی خیال ہے۔ کسی بھی طرح کی مخمس نظم میں بندوں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ اس صنف کو بہت سے شعرا نے برتا ہے اور نظیر اکبر آبادی نے تو اس صنف سے بہت کام لیا ہے۔ ان کی نظموں ''برسات کی بہاریں'' اور ''مفلسی'' سے یہ دو بند ملاحظہ کیجیے:

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھم جھماوٹ، قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی — کس کس طرح سے اُس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی — بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

❁

مُسدّس

مُسدّس کا لفظ عربی کے مصدر ''سُدُس'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''چھے'' کے ہیں مگر اصطلاحِ شعر میں مُسدّس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس طرح کہ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں جب کہ پانچواں اور چھٹا مصرع الگ ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف کا حامل ہوتا ہے۔ مخمس کی طرح مسدس میں بھی بندوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں۔

کلاسیکی دورِ شاعری سے لے کر جدید دورِ شاعری تک اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے اس صنف کو بہت استعمال کیا ہے اور اس صنف میں تمام طرح کے مضامین بیان کیے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی بیشتر زبان زدِ خاص و عام نظمیں ''آدمی نامہ''، ''تندرستی''، ''بڑھاپے کی سواری''، اور ''دنیا دارالمکافات ہے'' وغیرہ اسی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مولانا حالی کی معروف نظم ''مدّ وجزرِ اسلام'' مسدّس کی ہیئت میں ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق نظمیں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' بھی مُسدّس کی ہیئت میں ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنے مرثیوں کے لیے بھی اسی ہیئت کو پسند کیا ہے بلکہ میر انیس کے بعد بھی تمام مرثیہ نگاروں کو مسدّس کی ہیئت ہی مرغوب رہی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم ''شکوہ'' کا یہ بند، جو شاید سب طلبہ کو ازبر ہوگا، ملاحظہ کیجیے:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اور ''مسدّسِ حالی'' کا یہ ایک بند بھی ملاحظہ کیجیے:

ہر اک علم کے، فن کے جویا ہوئے وہ   ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ   سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

نظم مُعرّیٰ

معرّیٰ یا مُعرّا کے لغوی معنی برہنہ یا خالی کے ہیں مگر شاعری کی اصطلاح میں ایسی صنفِ نظم کو نظمِ مُعرّیٰ کہتے ہیں جس کے تمام مصرعوں کے ارکان تو یکساں ہوں مگر اُن میں قافیے کا التزام نہ رکھا گیا ہو۔ انگریزی میں نظمِ مُعرّیٰ کو بلینک ورس (Blank Verse) کہا جاتا ہے یعنی قافیے سے عاری نظم۔ دراصل قدیم شعرا کے ہاں قافیے کی شرط ضروری تھی لیکن جدید شعرا میں کچھ ایک نے قافیے کی پابندی کو رفعتِ تخیّل کی راہ میں سدِّ راہ سمجھ کر اسے غیر ضروری قرار دیا جن میں مولانا حالی جیسے بلند رتبہ شاعر بھی شامل ہیں۔ ہر چند مولانا حالی کی تمام شاعری پابند شاعری ہے اور انھوں نے ہمیشہ قافیے اور ردیف کو ملحوظ رکھا ہے مگر ان کا خیال ہے کہ اگرچہ قافیہ بھی شعر کے وزن کی طرح اس کا حسن بڑھا دیتا ہے مگر'' قافیے کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔''اس لیے قافیے کے بغیر بھی شعر کہا جا سکتا ہے۔ اس احساس کے تحت اردو کے کچھ شعرا کے ہاں قافیے سے چھٹکارا پانے کا رجحان پیدا ہوا چنانچہ اردو میں نظم معرّیٰ کہی جانے لگی ہے۔ اردو میں نظم معرّیٰ کا ابتدائی تجربہ مولانا عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی نے کیا، بعد میں جدید شعرا نے بھی اس طرف توجہ دی جن میں سے تصدق حسین خالد، مجید امجد، میرا جی اور ن م راشد کے نام اہم ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی ایک نظمِ معرّیٰ بہ عنوان: ''تاروں بھری رات'' ملاحظہ کیجیے:

اے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے — مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

❁

سانیٹ

سانیٹ (Sonnet) کی صنف انگریزی ادب سے اردو میں آئی ہے۔ ولیم شیکسپیئر، ولیم ورڈز ورتھ، کولرج، ٹینی سن اور کچھ دوسرے معروف انگریزی شعرا نے بہتات سے سانیٹ لکھے ہیں۔ انگریزی شعرا کی دیکھا دیکھی اردو کے کچھ جدید شعرا نے بھی سانیٹ لکھے اور بعض نے تو بہت اچھے سانیٹ کہے ہیں۔

سانیٹ ایک مقفّیٰ نظم ہے جس میں کل چودہ مصرعے ہوتے ہیں۔ انگریزی کی طرح اردو میں بھی سانیٹ کے دو حصے

ہوتے ہیں: پہلا حصہ آٹھ مصرعوں پر اور دوسرا حصہ چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ سانیٹ کے تمام مصرعے مل کر کسی ایک خیال یا جذبہ واحساس کو پیش کرتے ہیں۔ ہر چند سانیٹ کسی بھی بحر یا وزن میں لکھی جا سکتی ہے تاہم فنی لحاظ سے یہ ایک مشکل صنفِ نظم ہے۔ اس میں قافیہ یا قافیہ ورد یف کی خاص ترتیب کے ساتھ تسلسلِ بیان کا خیال رکھا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں سانیٹ کے دو حصے ہوتے ہیں: پہلے حصے کا، جو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، پہلا، چوتھا، پانچواں اور آٹھواں مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جب کہ دوسرے حصے کا، جو چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، نواں، دسواں، گیارھواں، چودھواں اور بارھواں تیرھواں مصرع ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوتا ہے۔ ن م راشد کا ایک سانیٹ بہ عنوان ''ستارے'' ملاحظہ کیجیے:

نکل کر جوئے نغمہ خلد زارِ ماہ و انجم سے
فضا کی وسعتوں میں ہے، رواں آہستہ آہستہ
بہ سوئے نغمہ آبادِ جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آ رہی ہے اک گلستانِ ترنم سے!
ستارے اپنے میٹھے دھیمے ہلکے تبسم سے
کیے جاتے ہیں فطرت کو جواں آہستہ آہستہ
سناتے ہیں اسے اک داستاں آہستہ آہستہ
دیارِ زندگی مدہوش ہے، اُن کے تکلم سے
یہی عادت ہے روزِ اولیں سے، ان ستاروں کی
چمکتے ہیں کہ دنیا میں مسرت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انسان فکرِ ہستی کو بھلا ڈالے
لیے ہے تمنا، ہر کرن ان نور پاروں کی
کبھی یہ خاک داں، گہوارۂ حسن و لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پا لے!

آزاد نظم

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، آزاد نظم ہر قسم کی عروضی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ اسے انگریزی میں Free Verse کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کا رواج ازمنہ قدیم ہی سے ہے جب کہ انگریزی زبان کی دیکھا دیکھی دورِ جدید میں اس نے اردو میں بھی اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے ہیں۔

آزاد نظم میں ایک ہی بحر ہوتی ہے مگر بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی مرضی پر منحصر ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصرعوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا ہوتا ہے۔ بعض شعرا صوتی تاثرات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی نظم کے کچھ مصرعوں میں قافیے اور ردیف کا بھی التزام کر لیتے ہیں۔

اردو میں بعض نقاد ن م راشد اور بعض تصدق حسین خالد اور بعض میرا جی کو آزاد نظم کا بانی شمار کرتے ہیں۔ بہر حال ان تینوں شاعروں کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ ان کے بعد سردار جعفری، فیض احمد فیض، مصطفیٰ زیدی، مختار صدیقی، یوسف ظفر، مجید امجد، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ دورِ حاضر کے شعرا امجد اسلام امجد، خورشید رضوی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، تبسم کاشمیری، عبیداللہ علیم، تحسین فراقی اور اجمل نیازی نے بھی آزاد نظمیں کہی ہیں۔

آزاد نظم کی سب سے بڑی خوبی رفعتِ تخیل ہے۔ اگر نظم میں فکر و خیال کی بلندی اور جدت نہیں تو پھر اس صنف میں طبع آزمائی کرنا بھی بیکار اور لاحاصل ہے۔

مجید امجد کی نظم "لوحِ دل" ملاحظہ کیجیے۔ اس نظم میں آزاد نظم کی تمام نمایاں خوبیاں موجود ہیں:

میں اجنبی ...... میں بے نشاں

میں پابہ گِل

نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے

یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل

نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے

❁

دوہا

ہندی صنفِ نظم ہے۔ ہندی میں دوہے کا رواج صدیوں سے ہے اور اردو میں بھی کلاسیکی دورِ شاعری ہی سے دوہے کہے جاتے ہیں چنانچہ بھگت کبیر اور اکبر اعظم کے نورتن کے اہم رکن عبدالرحیم خانِ خاناں کے دوہے آج تک مشہور چلے آ رہے ہیں۔

دوہے میں فقط دو مصرعے ہوتے ہیں جو ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں مگر ان دو مصرعوں میں جہانِ معنی آباد ہوتا ہے یا تو زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے یا پھر ایسا مشاہدہ بیان کیا جاتا ہے جو عین حقیقت یا عالم گیر سچائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو شاعروں میں سے جمیل الدین عالی اور عمر فیضی کے دوہے خاص و عام سے داد وصول کر چکے ہیں۔ چند دوہے ملاحظہ کیجیے:

رنگی کو نارنگی کہیں، بنے ہوئے کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں، دیکھ کبیرا رویا (بھگت کبیر)

تن اجلا من کارا بگلے کا سا بھیس
توَ سے تو کاگا بھلا، باہر بھیتر ایک (بھگت کبیر)

کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، پیا ملن کی آس (بھگت کبیر)

تن ایندھن شمشان کا، من موتی اَن مول
تن کا موتی جہان ہے اور من کا ہے من مول (عمر فیضی)

سندرتا کی چاندنی یا برہا کی آگ
سب پریتم کے رُوپ ہیں، رنگت ہو یا راگ (عمر فیضی)

❁

بارہ ماسہ

ایسی صنفِ نظم ہے جس کا اردو میں تو فروغ نہیں ہو سکا مگر ہندی میں بہت مقبول ہے۔ یہ دراصل بارہ بندوں پر مشتمل ایسی نظم ہوتی ہے جس میں عورت کی زبان سے بکرمی سال کے بارہوں مہینوں کا نام لے لے کر ہجر و فراق کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ ہم اپنے طلبہ کی سہولت کے لیے بارہ کے بارہ مہینوں کے نام اور ان کی خصوصیات درج کیے جاتے ہیں:

1۔ بیساکھ: یہ بکرمی سال کا پہلا مہینا ہے جو اپریل کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ بیساکھ کی پہلی تاریخ کو بیساکھی منائی جاتی ہے۔

2۔ جیٹھ: یہ بکرمی سال کا دوسرا مہینا ہے جو وسط مئی سے لے کر وسط جون تک ہے۔ اس مہینے میں خوب گرمی پڑتی ہے۔

3۔ اساڑھ: بکرمی سمت کے حساب سے تیسرا مہینا ہے۔ اس مہینے میں برسات کا آغاز ہو جاتا ہے اور جوار باجرے کی فصل بوئی جاتی ہے۔

4۔ ساون: اس مہینے میں کالی کالی گھٹائیں امنڈی آتی ہیں اور بارش ہونے کے قوی امکان ہوتے ہیں۔

5۔ بھادوں: بکرمی سال کے حساب سے وسط اگست سے وسط ستمبر تک رہتا ہے۔ اس مہینے میں بارشیں خوب ہوتی ہیں اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے۔

6۔ اسوج: 15 ر ستمبر سے 15 ر اکتوبر تک رہتا ہے۔ گرمی کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔

7۔ کاتک: کاتک کی پندرہ تاریخ کو دیوالی مناتے ہیں۔ رات کو خوب چراغاں اور لکشمی پوجا کرتے ہیں۔ یہ رام چندر جی کے بن باس سے واپس آنے کی خوشی کا دن ہے۔

8۔ منگسر (مگھر): اس ماہ سے سردیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔

9۔ پوس: وسط دسمبر تا وسط جنوری رہتا ہے، خوب سردی پڑتی ہے۔

10۔ ماگھ: اس ماہ میں سردی بالعموم کم ہو جاتی ہے۔ سرسوں پھولتی ہے اور لوگ بسنت مناتے ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہوتی ہے اور لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔

11۔ پھاگن: اِس مہینے میں ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے جس میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے اور خوب خوشیاں مناتے ہیں۔

12۔ چیت: یہ بکرمی سال کا بارھواں مہینا ہے جو وسط مارچ سے لے کر وسط اپریل تک رہتا ہے۔

❁

ہائیکو

ہائیکو جاپانی صنفِ سخن ہے۔ جاپان میں یہ عموماً سترہ اوزان پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن اردو میں تین مصرعوں پر مشتمل یہ صنف پانچ سات پانچ کی تقسیم کے ساتھ مقبول ہوئی۔ جاپان میں اِس صنف کا بانی بھاشو کو قرار دیا جاتا ہے۔ جاپان میں بھی اس کی ہیئت اور موضوعات میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ جاپان کا جب دیگر ممالک سے رابطہ ہوا تو ہائیکو کے انگریزی اور دیگر زبانوں میں تراجم ہوئے۔ کئی زبانوں میں طبع زاد ہائیکو بھی لکھے گئے۔ یہ صنف امریکہ میں بھی مقبول ہوئی بلکہ وہاں سے تو ''ہائیکو'' کے نام سے رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں تخلیق ہونے والے ہائیکو میں بھی تین مصرعوں اور کہیں کہیں چار مصرعوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ہر

زبان کا اپنا الگ وزن اور عروض ہوتا ہے۔سو ہائیکو ہر زبان میں مختلف آہنگ اور اوزان کے ساتھ لکھے گئے۔

پاکستان میں پہلی بار ڈاکٹر محمد امین کی وساطت سے ہائیکو کی صنف متعارف ہوئی۔انھوں نے اگرچہ اپنے جاپان میں قیام کے دوران بھی طبع زاد ہائیکو تخلیق کیے مگر ان کا پہلا باقاعدہ مجموعہ ''ہائیکو'' کے نام سے ملتان سے 1981ء میں شائع ہوا۔ہائیکو کی تحریک ڈاکٹر محمد امین کی کاوشوں سے ملتان میں بہت مقبول ہوئی اور یہیں سے ہائیکو کے ابتدائی مجموعے سامنے آئے۔1984ء میں حیدر گردیزی کا مجموعہ ''چاندنی کے ورق'' اور 1985ء میں اختر شمار کا ''روشنی کے پھول'' اولین ہائیکو مجموعے قرار دیے جاتے ہیں۔1987ء میں ساہیوال سے اکرم کلیم کا مجموعہ ''طاقچے'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔1984ء میں ڈاکٹر بشیر سیفی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدے ''اردو ادب'' کا ہائیکو نمبر شائع کیا گیا۔پنجاب میں اور خاص طور پر ڈاکٹر محمد امین ہائیکو کے اوزان کے لیے بحر خفیف کو موزوں قرار دیتے ہیں جو ہائیکو کے اوزان پانچ سات پانچ کے قریب تر ہے۔البتہ کراچی میں ہائیکو مشاعروں کے سبب ہائیکو لکھنے والوں میں بہت اضافہ ہوا مگر کراچی کے شعرا نے ''فعلن فعلن فا'' کے اوزان میں ہائیکو لکھے جو بڑے پسند کیے گئے لیکن اس حوالے جاپان کے ناقدین بھی متفق ہیں کہ جاپان کے اوزان کو من وعن اپنانا دیگر زبانوں کے لیے قدرے دشوار ہے۔تاہم پاکستان میں بہت شعرا نے ''ہائیکو'' لکھے ہیں۔اب تو کئی شعرا کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔اہم ہائیکو نگاروں میں ڈاکٹر محمد امین گردیزی، اختر شمار، اکرم کلیم کے علاوہ بشیر سیفی، ممتاز اطہر، رضی الدین رضی، حمایت علی شاعر، نسیم سحر، محسن بھوپالی، حیدر قریشی، اقبال حیدر، اکبر حمیدی، ناصر بشیر، علی محمد فرشی، اظہر ادیب، خواجہ نوید اسلم، ڈاکٹر پرویز پروازی، خاور اعجاز، نصیر احمد ناصر، سعید اقبال سعدی، شوکت مہدی، دل نواز دل، امین راحت چغتائی، قاضی اعجاز محور شامل ہیں نمونے کے طور پر چند ہائیکو ملاحظہ ہوں:

فلسفے کی کتاب کھولی تو
ساوتر کے حروف پر تتلی
اپنی ہستی کی سوچ میں گم تھی (محمد امین)

بچھڑی پھر مل کر
آخر کب تک رہ سکتی
شبنم پتوں پر (محسن بھوپالی)

اس کو کھو کر میں اس طرح رویا
جیسے بچہ کوئی سرِ ساحل
سیپیاں ریت میں گنوا بیٹھے (اختر شمار)

رات کے پچھلے پہر چپکے سے
ایک تصویر مجھ سے کہتی ہے
اب تو اختر شمار سو جاؤ (اختر شمار)

❀

ماہیا

''ماہیا'' سرزمین پنجاب کی معروف پنجابی صنف ہے اور یہ صنف سیکڑوں سال سے مروج ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ صنف سینہ در سینہ چلتی ہے اور آج بھی پنجاب کے چھوٹے بڑے سب دیہاتوں میں مرغوب خاص و عام ہے۔ پنجاب کا کوئی گبھرو جوان ہو یا الھڑ مٹیار، ہر کسی کو دو چار ماہیے ضرور ازبر ہیں جنھیں وہ ہر دم گنگناتے یا ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں۔

پنجابی کی یہ ہر دل عزیز صنف اردو میں بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اس صنف کے شہرت عام پانے کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ یہ صنف پنجاب کے کلچر سے ہم آہنگ ہے اور اس میں پنجاب کے دیہات کی خوب صورت زندگی کے رنگ نظر آتے ہیں دوسرے یہ صنف فقط تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن ان تین مصرعوں میں ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ اگرچہ ہائیکو میں بھی صرف تین مصرعے ہوتے ہیں اور کچھ اردو شاعروں نے ہائیکو کو اردو میں بھی رواج دینے کی کوشش کی ہے مگر ہائیکو جاپانی صنفِ نظم ہے اور اپنی بناوٹ کے اعتبار سے دلوں پر وہ تاثر نہیں چھوڑتی جو ''ماہیا'' چھوڑتا ہے۔ ماہیے کا پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے اور تینوں مصرعوں کے ارکان کی تعداد یکساں ہوتی ہے اور یہ ہمیشہ ایک ہی بحر میں کہا جاتا ہے۔

پنجاب کے قدیم و جدید تمام صوفی شعرا نے پنجابی میں ماہیے ضرور کہے ہیں جو پنجاب کے عوام کے مزاج سے ہم آہنگ اور سرزمینِ وطن کی رعنائیوں سے محبت کا والہانہ اظہار ہیں۔ ماہیا ایک مقامی تخلیق ہے۔ ہر چند اس کے موضوع میں بڑی وسعت ہے تاہم اس میں زیادہ تر انتظار اور ہجر و فراق کی گھڑیوں کے موضوع ہی کو نظم کیا جاتا ہے۔ اردو میں پہلے پہل اختر شیرانی اور چراغ حسن حسرت نے ماہیے کہے، پھر کچھ اردو شاعروں نے بھی اس طرف توجہ کی جن میں سے علی محمد فرشی، حیدر قریشی اور نثار ترابی کے ماہیوں کو پسند کیا گیا۔

موقع کی مناسبت سے چراغ حسن حسرت کا ایک زبان زدِ خاص و عام ماہیا ملاحظہ کیجیے۔

ساون میں پڑے جھُولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

اور ذیل میں نثار ترابی کی کتاب ''بارات گلابوں کی'' سے بطورِ نمونہ یہ دو تین ماہیے دیکھیے:

اُلجھے ہوئے دھاگے ہیں
جس یاد میں سوئے تھے
اُس یاد میں جاگے ہیں

موسم کی دُعا لینا
بجھتے ہوئے کچھ منظر
پلکوں میں چھپا لینا

بستی ہے جزیروں میں | چُنری مری دھرتی کی
کیوں بٹ گئی لیروں میں
جب تُو ہے نگاہوں میں | آ جائے گی خود چل کر
منزل مری راہوں میں

مستزاد

مستزاد کے لغوی معنی ہیں ''زیادہ کیا گیا'' یا ''بڑھایا گیا'' مگر اصطلاحِ شاعری میں عروض کی رُو سے مستزاد سے مراد وہ شعر ہے جس میں ایک مصرعے پر مزید نصف مصرعے کا اس طرح اضافہ کیا جائے کہ اضافہ شدہ مصرع اسی مصرعے کے رکنِ اول یا رکن آخر کے برابر نظر آئے۔

اردو میں ''مستزاد'' کوئی مستقل ہیئت نہیں اور نہ ہی اسے مستقل صنفِ نظم کی حیثیت حاصل ہے بلکہ یہ کسی بھی صنفِ سخن کے شعر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، چاہے وہ کسی عام نظم کا شعر ہو یا کسی غزل یا رباعی کا۔ دورِ قدیم سے لے کر جدید دورِ شاعری کے اساتذہ نے اسے روا رکھا ہے۔ مثلاً: کلیاتِ حسرت سے زیرِ عنوان ''ہم ان کے وہ ہمارے'' یہ مستزاد ملاحظہ کیجیے جو حسرت نے 1948ء میں لکھا تھا:

جیتے رہے تسکین محبت کے سہارے | ہم شوق کے مارے
مونس رہے اس پرستشِ پنہاں کے اشارے | ہر حال میں بارے
دل کر نہ سکا حوصلۂ ترکِ تمنا | اس شوخ سے اصلا
ہم کو بھی یہی ضد تھی مگر اس کا نتیجہ | نکلا یہ کہ ہارے

❀❀
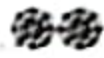
چھٹا باب

چند اہم اصنافِ نثر

''نثر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''پراگندہ یا بکھرا ہوا'' مگر اصطلاح میں الفاظ کا معینہ ضابطوں کے تحت استعمال ''نظم'' کہلاتا ہے جب کہ اس کے متضاد کے طور پر ''نثر'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح ہم نے اصنافِ نظم کو موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اسی طرح ہم اصنافِ نثر کو بھی مزاج کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں

(الف) افسانوی ادب (Fiction) (ب) غیر افسانوی ادب (Non Fiction)

افسانوی اور غیر افسانوی ادب کی متعدد قسمیں ہیں جن کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

افسانوی ادب (Fiction)

1- داستان 2- ناول 3- افسانہ 4- ڈراما

داستان (Story)

کہنے کی چیز کو کہانی کہتے ہیں۔ کہانی کا مترادف لفظ قصہ یا حکایت ہے اور داستان قصے کہانی کی قدیم ترین قسم ہے۔ کسی زمانے میں قصہ خوانی یا داستان گوئی باضابطہ ایک فن ہوا کرتا تھا جو عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ برصغیر میں اس کا آغاز دکنی دور سے ہوا جو ازاں بعد برِصغیر کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ بڑے بڑے شہروں میں داستان سننے سنانے کے لیے باقاعدہ جگہیں اور وقت مقرر ہوا کرتے تھے، جہاں لوگ کشاں کشاں آتے اور بڑے انہماک سے داستان سنتے تھے۔ کچھ قدیم شہروں خصوصاً حیدر آباد (دکن)، دلّی، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں ایسی جگہوں کی نشان دہی آج بھی بآسانی کی جا سکتی ہے۔ انشا اللہ خاں انشا کا یہ شعر:

سنایا رات کو قِصّہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا

اسی ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور پشاور کا قصہ خوانی بازار آج بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔

بغداد کے عباسیہ خاندان کے مشہور بادشاہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کو داستان سننے کا بڑا شوق تھا اور اس کے دربار میں

داستان گوؤں کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ''الف لیلہ'' قصے کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے۔ اس کتاب کی کل داستانیں سمرقند کی شہزاد وزیرزادی نے اپنی بہن سے جس کا نام دنیا زاد تھا، ایک ہزار ایک راتوں میں بیان کی تھیں۔ بعد میں یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوگیا۔

روایت ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیا ایک دفعہ بیمار پڑ گئے۔ بیماری نے طول کھینچا تو ان کے مرید خاص امیر خسرو نے اپنے مرشد کے پاؤں دبانے میں انھیں ایک دلچسپ داستان ''قصہ چہار درویش'' فارسی میں سنانی شروع کی۔ یہ داستان کئی دنوں کے بعد ان کی صحت یابی پر ختم ہوئی تو حضرت نظام الدین اولیا نے دُعا کی کہ جس کسی بیمار کو یہ قصہ سنایا جائے گا تو وہ ضرور صحت یاب ہوگا۔ اس قصے کو میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' کے تاریخی نام سے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ایما سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پلیٹ فارم سے 1802ء میں اردو میں لکھا۔ اردو نثر کا باقاعدہ آغاز بھی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوتا ہے۔ جہاں میر امن کے علاوہ حیدر بخش حیدری نے ''آرائشِ محفل'' اور ''توتا کہانی''، خلیل خاں اشک نے ''داستانِ امیر حمزہ'' اور مظہر علی ولا نے ''ہفت گلشن'' 1801ء میں لکھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی داستانیں لکھی گئیں مگر ان سب داستانوں میں اپنے منفرد انداز بیان اور سلیس و برجستہ زبان کے سبب ''باغ و بہار'' کو سب سے زیادہ قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔ ''باغ و بہار'' میں دلّی کی معاشرت بیان ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے ''فسانۂ عجائب'' (1825ء) لکھی، جو لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔

اردو میں داستان نویسی کا دور تقریباً ایک صدی تک قائم رہا۔ قدیم داستانیں اپنی گوناگوں خوبیوں کی بدولت نہ صرف انتہائی دل چسپ ہوا کرتی تھیں بلکہ یہ اخلاقی اقدار اور زبان کے اعتبار سے بھی خوب صورت مرقعے تھے مگر پھر بقول ثاقب لکھنوی یہ ہوا کہ:

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

انگریزی زبان و ادب کے فروغ نے ہمیں داستان سے بیگانہ کر دیا اور ہمیں ایک نئی صنفِ نثر سے متعارف کرایا جسے ناول کہتے ہیں۔

ناول(Novel)

ناول (Novel) انگریزی کا لفظ ہے جو اطالوی زبان کے لفظ ناولا (Novella) سے ماخوذ ہے۔ناول کے معنی ''نیا، انوکھا یا اچھوتا'' کے ہیں مگر ادب کی اصطلاح میں ناول سے مراد وہ قصہ لیا جاتا ہے جس میں واقعات خلافِ قیاس نہ ہوں۔ داستان کے برعکس ناول کی بنیاد حقیقت اور فطرت پر اٹھائی جاتی ہے اور فرضی، خیالی اور مافوق الفطرت باتوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ناول کا موضوع ''انسان'' ہے۔آج کا انسان طرح طرح کے حالات و واقعات سے دوچار ہوتا اور متنوع مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ناول ان سب موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔گویا ناول نے انسان کو تخیل اور تصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔اس بنا پر ناول کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

1- اصلاحی ناول 2- سماجی ناول 3- سیاسی ناول 4- تاریخی ناول 5- مہماتی ناول 6- جاسوسی ناول 7- نظریاتی ناول

مربوط قصہ ناول کی بنیاد ہے جب کہ سلاست اور روانی ناول کی ضرورت ہوتی ہے۔قصے کی مختلف کڑیوں کو کسی خاص ترتیب سے جوڑنے کا نام پلاٹ ہے۔ناول کی کہانی کو مختلف کرداروں کے ذریعے بڑھایا جاتا ہے۔یہ تمام کردار جس مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہیں اس کو ہیرو (Hero) کا نام دیا جاتا ہے۔ناول نگاری میں اسلوب کی بھی بہت اہمیت ہے اور کرداروں کے مابین مکالموں اور منظر نگاری سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن بہرِ کیف ناول کسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا سب سے پہلا ناول نگار اور ان کے ناول ''مراۃ العروس'' (1869ء) کو پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے علاوہ بھی کئی ناول لکھے جن میں 'توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' شامل ہیں۔تاہم ان کے تمام ناول مقصدی اور اصلاحی ہیں۔اس کے بعد زمانۂ حال تک جن ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ان میں مرزا ہادی بیگ رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' مولانا عبدالحلیم شرر کا تاریخی ناول ''فردوسِ بریں'' پریم چند کے ناول ''میدانِ عمل''، ''گئودان'' اور ''بازارِ حسن'' نسیم حجازی کے تاریخِ اسلام کے پس منظر میں لکھے گئے ناول ''محمد بن قاسم'' ''خاک و خون'' ''شاہین'' اور ''یوسف بن تاشفین''، شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی''، قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' خدیجہ مستور کا ''آنگن'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' الطاف فاطمہ کا ''دستک نہ دو'' اور بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی''، فضل کریم احمد فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک'' اور انتظار حسین کا ''بستی'' شامل ہیں۔

ناول آج بھی پڑھی جانے والی صنف ہے مگر ناول لکھنے کے لیے جس خلوص، لگن، یکسوئی، زبان اور فن میں مہارت کی ضرورت ہے، آج کا ادیب شاید ان سے محروم ہے، اس لیے ناول کا مستقبل تابناک نظر نہیں آتا۔

افسانہ (Short Story)

افسانہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے جس میں کسی واقعے، کردار یا لمحے کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اردو زبان میں افسانہ انگریزی ادب کے اثر سے آیا۔ مغربی زبانوں میں افسانے سے پہلے طویل قصے کہانیاں اور ناول لکھنے کا رواج تھا مگر جوں جوں انسان عدیم الفرصت ہوتا گیا تو کسی ایسی صنفِ ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والے کو مسرّت اور تسکین کے لمحات میسر کر سکے، چناں چہ افسانہ لکھا جانے لگا، جس کے اثرات ہندوستان میں بھی در آئے۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اختصار افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے یعنی افسانے میں بیان ہونے والی کہانی اتنی مختصر ہونی چاہیے کہ اسے ایک ہی نشست میں بخوبی پڑھا جا سکے، اس لیے وحدتِ تاثر اس کا بنیادی عنصر ہے اور اس میں مرکزی خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ناول کی طرح افسانے میں بھی اسلوبِ بیان، کردار نگاری اور مکالمہ نویسی بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ناول اور افسانے میں فرق یہ ہے کہ ناول نگار قاری کے لیے کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا اور اس میں پوری تفصیل بیان ہوتی ہے مگر اب زمانہ اور ہے، پڑھنے والے بھی تیز ہیں، وہ کچھ کڑیاں خود ملا لیتے ہیں، چناں چہ افسانے میں جا بجا کھانچے نظر آ سکتے ہیں، جنھیں ایک اچھا قاری خود ملا لیتا ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم از کم الفاظ کا استعمال کرے اور الفاظ سے زیادہ جذبات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔ لوگ عام طور پر الفاظ کے ذریعے نہیں سوچتے بلکہ انسان کے دل و دماغ میں خیالات و جذبات پہلے آتے ہیں، جنھیں وہ لفظوں کا جامہ پہناتا ہے اور خوب صورت شکل بنا دیتا ہے۔ اس طرح افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل کا نام ہے۔ یہ کسی امر کا ایسا بیان ہے جس میں تمہید ہو، ارتقا ہو، عروج (CLIMAX) ہو اور پھر اسے کسی موزوں نتیجے پر ختم کیا گیا ہو یا نتیجے کا اخذ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہو یعنی افسانے میں ایک منطقی ترتیب و تنظیم ہوتی ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا۔ منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کے اوّلین واضح نقوش پیش کیے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اردو میں انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور روسی کے معیاری افسانوں کے تراجم کثرت سے شائع ہوئے، جن کا اثر اردو افسانے پر پڑا مگر جلد ہی اردو افسانہ نگاروں نے اپنی کارگاہ کو وسعت دی اور اپنی کہانیوں کو فطری اور حقیقی پلاٹوں سے منظم کیا اور اپنے گرد و پیش کی تمام زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ عمدہ کردار نگاری اور خوب صورت منظر نگاری سے اپنے افسانوں کو جلا بخشی اور یوں افسانے کو دیگر اصنافِ نثر کے مقابلے میں مؤثر ترین صنفِ ادب کا درجہ حاصل ہو گیا۔

1935ء کے لگ بھگ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر افسانے میں نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے اور اس کا دامن وسیع سے

وسیع تر ہو گیا۔ آزادی کے بعد ملک کو جن نئے نئے حالات و مسائل سے دوچار ہونا پڑا، انھوں نے لوگوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے، چناں چہ افسانے کے موضوعات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ آزادی کے بعد سے لے کر زمانۂ حال تک افسانہ لکھنے والوں میں بڑے بڑے نام ہیں جن میں قرۃ العین حیدر، غلام عباس، انتظار حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام ثقلین نقوی، سعادت حسن منٹو، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے نام شامل ہیں۔ یہ یقیناً نا تمام فہرست ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے زبان و بیان کی حلاوت کے ساتھ تکنیک کی جدت پر بھی خاص توجہ دی۔ ان لوگوں کی مساعی سے آج اردو افسانے کو عالمی ادب میں ایک باوقار مقام اور اونچا مرتبہ حاصل ہے، یہاں تک کہ ان لکھنے والوں میں سے بعض کے افسانوں کو دنیا کے بہترین افسانوں کے موازنے میں بخوبی رکھا جا سکتا ہے۔

❁

ڈراما (Drama)

لفظ ''ڈراما'' یونانی لفظ ڈراؤ (Drao) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''عمل کر کے دکھانا'' لیکن ادب کی اصطلاح میں ڈراما ایسی صنفِ ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی ہوتی ہے جو کرداروں کی حرکات و سکنات اور مکالموں کے ذریعے سٹیج پر پیش کی جاتی ہے، اسی لیے ارسطو نے اسے کسی ایسے عمل کی نقالی سے تعبیر کیا ہے جو مکمل ہو۔ ڈرامے کے اجزا میں نہ صرف کہانی، پلاٹ، کردار اور مکالمے اہمیت کے حامل ہیں بلکہ اس کے لیے سٹیج، پس منظر، موسیقی اور کرداروں کا عمل بھی اتنا ہی اہم ہے، کیوں کہ ان باتوں کا تعلق براہِ راست ڈرامے کی پیش کش سے ہے۔

ڈرامے کا بنیادی عُنصر کہانی ہے۔ اسی کا تانا بانا ڈرامے کا پلاٹ ہے۔ منطقی طور پر کہانی میں جس قدر باطنی و معنوی ربط ہو گا، اسی قدر کہانی اچھا تاثر دے گی۔

کسی بھی ڈرامے کی دل چسپی، اس کے بنیادی کرداروں کے باہمی تصادم اور کشمکش (Conflict) میں مضمر ہے۔ کردار جتنے زندہ اور حقیقت کے قریب ہوتے ہیں، اتنے ہی وہ ناظرین کے دل و دماغ پر اچھا تاثر چھوڑتے ہیں۔ گویا اعلیٰ کردار نگاری ہی ڈرامے کا کمال ہے۔ ڈرامے کا اہم ترین حصہ اس کا نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ یہاں آ کر تذبذب کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ناظرین انجام کو جاننے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور جب ان کی الجھن انکشاف کے عمل سے حل ہو جاتی ہے تو ڈراما اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

ڈراما نگار ڈرامے کو بالعموم درج ذیل اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

1-المیہ (Tragedy)2-طربیہ (Comedy) 3-سوانگ 4- (Farce) میلوڈراما(Melodrama)

5- اوپیرا (Opera)6- مخلوط ڈراما (Mixed Drama)7- یک بابی ڈراما (One Act Play)

8- ریڈیائی ڈراما (Radio Drama) 9- ٹیلی ڈراما (Tele Drama)

ڈرامے کی اقسام ہی سے ان کی نوعیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے چناں چہ یہاں ڈرامے کی اقسام کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں مگر ہم اردو ڈرامے کے آغاز و ارتقا پر قدرے روشنی ڈالتے ہیں۔

اردو ڈرامے کی ابتدا واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ سے ہوئی۔ اس زمانے میں سیّد آغا حسین امانت لکھنوی نے ایک ڈراما ''اندر سبھا'' کے عنوان سے لکھا۔ اس ڈرامے کو اس لحاظ سے بجا طور پر اردو کا پہلا ڈراما کہا جاتا ہے کہ اسے پہلی دفعہ عوام کے سامنے سٹیج پر پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما بہت مقبول ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اردو تھیٹر کا آغاز ہوا تو ضرورت کے تحت اَن گنت ڈرامے لکھے گئے جو بہر طور اردو ڈرامے کے ارتقا میں انتہائی ممد و معاون ثابت ہوئے۔

اردو ڈرامے کی تاریخ میں آغا حشر کاشمیری (1879ء-1935ء) کا نام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اردو ڈرامے کو ایک نیا موڑ دیا اور اس میں وقار پیدا کیا اور اِسے فنّی خصوصیات کا حامل بنایا۔ اس ضمن میں ان کے ڈرامے ''اسیرِ حرص''، ''ترکی حور''، ''یہودی کی لڑکی''، ''شہیدِ ناز'' اور ''رستم و سہراب'' خاص شہرت رکھتے ہیں۔

آغا حشر کے بعد جن ڈراما نگاروں نے اس صنف میں نام پیدا کیا، ان میں سیّد امتیاز علی تاج اپنے ڈرامے ''انار کلی'' کی وجہ سے اور حکیم احمد شجاع ''باپ کا گناہ'' کی بنا پر بڑے مشہور ہوئے۔

زمانہ حال کے ڈراما نویسوں میں میرزا ادیب کا نام، جنھوں نے اپنی محنت، لگن اور استقلال کے ساتھ اس صنف میں گراں قدر اضافے کیے، بڑا نمایاں ہے۔ ان کے ڈرامے ''پسِ پردہ'' پر انھیں آدم جی انعام مل چکا ہے۔ انھوں نے کشمیر اور فلسطین کی تحریکِ آزادی کے موضوع پر بھی ڈرامے لکھے جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ میرزا ادیب کے علاوہ جن اہلِ قلم نے اردو ڈرامے کے ذخیرے میں اہم اضافہ کیا ہے، اُن میں سعادت حسن منٹو، آغا بابر، رفیع پیرزادہ، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین، خواجہ معین الدین، کمال احمد رضوی، امجد اسلام امجد، حسینہ معین، یونس جاوید اور اصغر ندیم سیّد کے نام شامل ہیں۔ ہمارے ہاں سٹیج ڈراموں کی حالت تو شاید اتنی اچھی نہیں مگر ٹی وی ڈراموں کو آج بھی ہر جگہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔
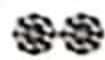
غیر افسانوی ادب (Non Fiction)

غیر افسانوی ادب میں فکشن کے علاوہ ہر طرح کی نثری تحریر شامل ہے۔ اس کی بالعموم درج ذیل صورتیں ہیں:

1- سوانح عمری، 2- آپ بیتی، 3- خاکہ، 4- سفرنامہ، 5- مکتوب نگاری، 6- طنز و مزاح، 7- مضمون 8- انشائیہ 9- مقالہ، 10۔ روداد نویسی، 11۔ کالم نگاری، 12۔ تحقیق، 13۔ تنقید۔ اب ہم ذیل کی سطور میں ان سب کا حال قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

سوانح عمری (Biography)

سوانح کا لفظ ''سانحہ'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: رُوداد، احوال یا کیفیت، چنانچہ سوانح عمری کے معنی ہوئے کسی شخص کی زندگی کے احوال یا اس کی سرگزشت۔ سوانح نگار کسی شخص کی ولادت سے وفات تک کے حالات چوں کہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع سے پوری طرح آگاہ ہو اور جس شخص کی وہ سوانح عمری ترتیب دے رہا ہے، اس کے ساتھ اس کا قریبی رابطہ رہا ہو یا اس شخص کا مطالعہ اس طرح کیا ہو کہ اس کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ سوانح نگار کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس شخص کے پورے عہد کا مکمل شعور رکھتا ہو۔ کوئی بھی شخص، خواہ وہ کتنا ہی قد آور اور عام سماجی و معاشرتی سطح سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اُسی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے جس میں اس نے زندگی بِتائی ہے اور اسے قدم قدم پر اپنے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، اس لیے سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اس معاشرے کی تہذیبی و فکری سطح سے مکمل آگاہ ہو، وگرنہ وہ زیرِ ترتیب سوانح عمری سے انصاف نہیں کر سکے گا۔

ان تمام عوامل کے اظہار کے لیے حسب حال، سادہ و دل کش مگر پر کشش زبان اور دل آویز اسلوب بیان اور موضوع کی منطقی ترتیب سوانح عمری میں ادبی شان پیدا کر دیتی ہے، جس کی بنا پر اس شخص کا نام بھی زندہ جاوید ہو جاتا ہے جس کی سوانح عمری لکھی گئی ہے اور سوانح نگار بھی اس حوالے سے پہچان بن جاتا ہے۔

ہر چند قدیم تذکروں میں کچھ شعرا کے مختصر حالات مل جاتے ہیں تاہم اردو میں سب سے پہلے مولانا حالی نے باقاعدہ طور پر سوانح عمری لکھی۔ ''حیاتِ سعدی'' (1883ء) اردو کی سب سے پہلی سوانح عمری ہے۔ مولانا حالی نے ''یادگارِ غالب'' (1897ء) لکھی جوان کے استادِ محترم مرزا غالب کی یادگار سوانح عمری ہے اور ''حیاتِ جاوید'' (1901ء) ان کے مُربّی و محسن سرسیّد احمد خاں کی سوانح عمری ہے، جس میں سرسیّد احمد خاں کے احوال و آثار اور ان کے کارہائے نمایاں اس طرح والہانہ انداز اور اس قدر دل کش اندازِ تحریر میں بیان ہوئے ہیں کہ ضخیم ہونے کے باوجود ''حیاتِ جاوید'' اردو کی بہترین سوانح عمری شمار ہوتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی سوانح عمریاں ''المامون'' (1887ء)، ''سیرت النعمان'' (1890ء) ''الفاروق (1899ء) اور ''الغزالی'' (1902ء) بھی اردو کی سوانح عمریوں کے ذخیرے کا قیمتی سرمایہ ہے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی نعمانی کی سوانح عمریوں کے بعد بھی بے شمار سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں جن میں افتخار احمد صدیقی کی ''حیات النذیر'' (1912ء) رئیس احمد جعفری کی 'سیرت محمد علی'' (1924ء) سید سلیمان ندوی کی ''حیات شبلی'' (1925ء) اور عبدالمجید سالک کی ''ذکر اقبال'' (1954ء) زیادہ اہم ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر علی محمد خاں نے دو سوانح عمریاں لکھی ہیں جن میں سے ایک سوانح عمری ''سرنوشت'' کے نام سے چودھری احمد سعید (1941ء-2018ء) کی سوانح عمری ہے جو 2019ء میں لکھی گئی اور چھپی اور دوسری ''شجرِ سایہ دار'' کے نام سے قاضی برکت علی (1927ء-2019ء) کی سوانح عمری ہے جو 2020ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ قارئین نے ان دونوں کتابوں کو سوانح نگاری کی صنف میں گراں قدر اضافہ قرار دیا ہے۔

❁

آپ بیتی (Autobiography)

اپنی زندگی کے حالات و واقعات کا بیان ''آپ بیتی'' یا ''خودنوشت'' کہلاتا ہے۔ سوانح عمری میں کسی دوسری شخصیت یا فرد کی زندگی کے بارے میں اپنی بساط کے مطابق بہ نظرِ غائر لکھا جاتا ہے جب کہ آپ بیتی لکھنے والا ''من آنم کہ من دانم'' کے مصداق اپنے حالات بقلم خود بیان کرتا ہے۔

آپ بیتی محض مصنف کے ذاتی احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ لکھنے والے کے جذبات و احساسات اور اُن کی روشنی میں مشاہدات و تجربات کی مدد سے اس کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہوتی ہے۔ عام طور پر مصنف اپنی آپ بیتی یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے آخیر عمر کے اس حصے میں لکھتا ہے جب اس کے پاس اتنا مواد جمع ہو جاتا ہے جسے وہ دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے تاکہ قارئین بھی اس کی زندگی سے اخذ و استفادہ کر سکیں۔ اس ضمن میں مصنف کچھ باتوں کو چھپا لیتا ہے، کچھ کو سرسری طور پر پیش کرتا، جب کہ کچھ باتوں کی تفصیل میں جانا پسند کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے حالات و افکار سے آگاہ تو ضرور ہوں مگر اس کے اپنے نقطۂ نظر سے۔ ان تمام باتوں میں قدرے تکلف برتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

> ''سب سے اچھی آپ بیتی وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ احوالِ زندگی پر مشتمل ہو۔''

آپ بیتی کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً: روزنامچہ یا ڈائری بھی ایک طرح کی آپ بیتی ہے جس میں لکھنے والا اپنی ذات کے

حوالے سے مشاہدات و تجربات اور احساسات کو ہر روز قلم بند کرتا ہے۔ روزنامچے کا رواج قدیم زمانے سے ہے۔ تزکِ تیموری، تزک بابری اور تزکِ جہانگیری اسی زُمرے میں آتی ہیں۔ رپورتاژ (رپورٹنگ) اور سفرنامہ بھی آپ بیتی ہی کی شکلیں ہیں، جن میں مصنف گھر سے نکلنے کے بعد اپنے سفر کے دوران میں پیش آنے والے واقعات، مشاہدات اور ذاتی تاثرات کو خارجی ماحول اور قدرتی و مصنوعی مناظر سے منسلک کر کے وطن سے دور قریہ قریہ، شہر شہر اور ملک ملک کے حالات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

یورپ کی کم وبیش تمام زبانوں میں آپ بیتی لکھنے کا رواج پرانے وقتوں سے ہے۔ اردو میں آپ بیتی کی صنف زیادہ پرانی نہیں۔ اردو میں زمانہ حال تک لکھی گئی اہم آپ بیتیوں میں مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ'' مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''یادِ ایامِ عشرتِ فانی'' مولانا عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت'' رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری'' دیوان سنگھ مفتوں کی ''نا قابلِ فراموش'' قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' اور مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' شامل ہیں۔

خاکہ (Sketch)

خاکہ کے لغوی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں اور خاکہ کھینچنا کے معنی ہیں کسی کی لفظی تصویر بنانا۔ ادبی اصطلاح میں خاکہ ایسی صنفِ نثر ہے جو مختصر ہونے کے باوجود کسی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کرے۔ اسے کسی شخص کی قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح ناول اور افسانے میں بڑا فرق ہے کہ ناول میں تفصیل بیان کی جاتی ہے مگر افسانہ بڑا مختصر ہوتا ہے۔ اسی طرح سوانح عمری اور خاکے میں یہ فرق ہے کہ سوانح عمری میں کسی شخصیت کی ولادت سے وفات تک کے حالات پیش کیے جاتے ہیں مگر خاکے میں بڑے اختصار کے ساتھ موٹے موٹے خدوخال بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح عمری چوں کہ طویل ہوتی ہے اس لیے اسے پڑھنے کے لیے وقت درکار ہے مگر خاکہ ایک ہی نشست میں پڑھنے کی چیز ہے اور آج کا قاری وقت کی ہر ممکن بچت کرتا ہے اور تفصیل میں جانے کے بجائے اختصار کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ خاکہ لکھنے کی طرف زیادہ راغب ہو رہے ہیں۔

ایک عمدہ خاکے کی خوبی یہ ہے کہ زیرِ قلم شخصیت کی وضع قطع، تراش خراش، چال ڈھال، لباس، نشست و برخاست، طعام و قیام، پسند ناپسند بیان کرنے کے علاوہ اس کی عادات واطوار اور کارہائے نمایاں اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ وہ شخصیت قاری کی نظروں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خاکے میں ہم اُس شخص کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں کیوں کہ اگر خاکہ نویس کا قلم بے ساختہ اور شگفتہ ہے تو وہ زیرِ عنوان شخصیت کا حال حقیقی زندگی سے قریب رہ کر بڑے

سلیقے کے ساتھ بے کم و کاست بیان کرتا ہے۔

ہر چند مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ضرور ملتے ہیں تاہم اردو کے پہلے باقاعدہ خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں جنھوں نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کے عنوان سے اپنے استادِ محترم ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھا۔ علاوہ ازیں ''ایک وصیت کی تعمیل'' اور ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' ان کے ناقابلِ فراموش خاکے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے بعد خاکہ نگاری میں رشید احمد صدیقی کی دو کتابوں ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' مولانا چراغ حسن حسرت کی ''مردمِ دیدہ'' مولانا عبدالمجید سالک کی ''یارانِ کہن'' عبدالسلام خورشید کی ''وے صورتیں الٰہی'' جگن ناتھ آزاد کی ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' محمد طفیل کی ''معظم'' اور ''مکرم'' احمد بشیر کی ''جو ملے تھے راستے میں'' رئیس احمد جعفری کی ''دید و شنید'' اور شاہد احمد کی کتاب ''گنجینۂ گوہر'' کو اہم درجہ حاصل ہے۔

خاکہ نگاری کا تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک مولوی عبدالحق کی خاکوں پر مبنی کتاب ''چند ہم عصر'' کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس کتاب کو خاکہ نویسی کی صنف میں بڑا اونچا مرتبہ حاصل ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''چند ہم عصر'' میں جہاں اپنے زمانے کی چند معروف ہستیوں کے خاکے تحریر کیے ہیں، وہیں نور خاں اور نام دیو مالی جیسے معمولی اور غیر معروف انسانوں کو عظمتِ کردار کے باعث زندہ جاوید کر دیا ہے۔

نئے خاکہ نگاروں میں ڈاکٹر علی محمد خاں کی کتاب ''اب انھیں ڈھونڈ'' کا حال ہی میں چوتھا ایڈیشن چھپا ہے۔ کتاب میں بارہ خاکے ہیں، جن میں سے ایک خاکہ ''ماں جی'' کا اور ایک عبدالستار ایدھی کا ہے، جسے قارئین نے بے حد پسند کیا ہے۔ اس کتاب پر ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور میں تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ جب کہ ان کی دوسری کتاب ''چراغِ رخ زیبا'' اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔

سفر نامہ (Travelogue)

سفر انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ عربی کی مثل مشہور ہے کہ ''اَلسَّفَرُ وَسِیْلَۃُ الظَّفَرُ'' یعنی سفر کامیابی کا وسیلہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''سفر کامیابی کی کنجی ہے'' اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں فقط وہی قومیں فتح و ظفر مندی سے ہم کنار ہوئیں جنھوں نے بہ شوق اور بہ رضا و رغبت سفر اختیار کیے۔ سفر ایسی چیز ہے جس میں اگر ناکامی حاصل ہو تو بھی کوئی نہ کوئی دل چسپ فائدہ

ضرور ہاتھ لگتا ہے۔

قرآن مجید میں آیا ہے: "سِیرُوا فِی الْاَرْضِ" یعنی زمین کی سیر کرو، چناں چہ جب تک فرمانِ الٰہی کے بہ موجب مسلمان سفر اختیار کرنے میں پیش پیش رہے وہ ہر جگہ کامیاب اور بامراد ہوئے اور جب انھوں نے اس معاملے میں پست ہمتی دکھائی تو وہ پس ماندہ ہو گئے۔ انگریزوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب ان کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ان کو یہ مقام و مرتبہ اس لیے ملا تھا کہ انھوں نے اپنی سرزمین سے نکل کر چار دانگِ عالم میں سفر اختیار کیے تھے اور اپنے قدم جما لیے تھے۔ آج بھی امریکہ کیا، آسٹریلیا کیا، کینیڈا کیا اور نیوزی لینڈ کیا ان ملکوں پر انگریزوں کی نسلیں ہی حکمران ہیں۔

سفرنامہ ایک قدیم مگر دل چسپ صنفِ ادب ہے کیوں کہ جب سفر کیا گیا تو دوسروں تک معلومات پہنچانے کی غرض سے سفر وحضر کی رُوداد لکھنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ سفرنامہ شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں پھرنے کا نام نہیں بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے کامیاب سفرنامہ وہ ہوتا ہے جس میں مصنّف اپنے ذاتی مشاہدات کے ساتھ ساتھ ان تاثرات کو بھی بیان کرے جو سفر کے دوران میں اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں مصنّف تخیّل سے بھی کام لے سکتا ہے اور تاریخ کے اوراق کی مدد سے بھی حقیقت پیدا کر سکتا ہے۔ سفرنامے کا اندازِ بیان سادہ اور رواں دواں ہونا چاہیے۔ ایک اچھا سفرنامہ جہاں ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے وہاں زبان وادب میں بھی اضافے کا باعث بنتا ہے۔

جب سفرناموں کا ذکر کیا جاتا ہے تو معاً ابنِ بطوطہ اور کولمبس کے نام ذہن میں ضرور آتے ہیں۔ مولانا حالی نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے:

فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ   سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

تو اُن کا اشارہ ابنِ بطوطہ کی طرف ہے اور علامہ اقبالؒ نے جو باری تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں   ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

تو اُن کا اشارہ کولمبس کی طرف ہے۔

اردو کے قدیم سفرناموں میں یوسف خان کمبل پوش کا سفرنامہ "عجائباتِ فرنگ" (1847ء) مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ "روم ومصر وشام" سر عبدالقادر کا "نقشِ فرنگ" اور محمود نظامی کا "نظرنامہ" اہم ہیں۔ ان کے علاوہ دنیا بھر کے رنگ رنگ کے سفروں کے حالات کے بارے میں بیگم اختر ریاض الدین کے دو سفرنامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" ندرتِ بیان اور دل کش اسلوب کی بنا پر بہت دل چسپ ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ "حجاز ومصر وشام" حکیم سعید کا "ماوراالبحار" اور ممتاز مفتی کا "لبیک" کے علاوہ ابنِ انشا کے سفرنامے "چلتے ہو تو چین کو چلیے"، "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" اور "دنیا گول ہے" سفرناموں میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ان سفرناموں کے علاوہ شیخ منظور الٰہی کا سفرنامہ "دردِ دل کشا" افضل علوی کا سفرنامہ "دیکھ لیا ایران"، جمیل الدین عالی کے دو سفرنامے "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" عطاء الحق قاسمی کا "شوقِ آوارگی"، مستنصر حسین تارڑ کے

سفر نامے ''نکلے تری تلاش میں'' اور ''اندلس میں اجنبی'' اور طارق محمود مرزا کا چند یورپی ممالک کے سفر کے حالات پر مبنی دل چسپ سفر نامہ ''خوشبو کا سفر'' اور مشرقِ بعید کے چند ممالک کے اسفار پر مبنی سفر نامہ ''دنیا رنگ رنگیلی'' بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔

مکتوب نگاری (Letter Writing)

مکتوب کے لغوی معنی ''لکھا گیا'' یا ''لکھا ہوا'' کے ہیں لیکن عام طور پر مکتوب سے مراد خط لیا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری ایک اہم صنفِ نثر ہے بلکہ یہ ایک فن ہے، ایسا فن جس سے ہر پڑھے لکھے کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ہر چند آج الیکٹرانک کا دور، ہر جانب اسی کا راج اور کسی حد تک مکتوب کی جگہ الیکٹرانک میڈیا نے لے لی ہے تاہم کسی شخص کے بارے میں اُس کے خیالات و کیفیات سے آگاہ ہونے اور علم و ادب کے لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی بنا پر مکتوب نگاری ہر زبان کے نصاب میں داخل ہے۔

مکتوب، کاتب کی عادات و میلانات کا آئینہ دار اور اس کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ شاید اسی بنا پر خط کو ''نصف ملاقات'' کہتے ہیں بلکہ مرزا غالب نے تو خط کو دو بدو باتیں کرنے کے مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ وہ اپنے ایک شاگرد مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

مکاتیب غالب اپنی جدّت اور ندرت کی بنا پر اردو ادب کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔ اگرچہ مرزا غالب سے پہلے بھی خط لکھے جاتے تھے مگر ان کا بالعموم انداز مسجع مقفیٰ ہوتا اور ان میں لکھنے والا اپنی لیاقت بگھارنے کی کوشش کرتا تھا، برخلاف اس کے مرزا نے سبک انداز اپنایا اور خط کو معاشری خدوخال کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے لحاظ سے بھی بڑا موقر و معتبر بنا دیا۔ مرزا غالب کے اردو خطوں کے مجموعے ''اردوئے معلّیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' اردو مکتوب نگاری کا پہلا سنگِ میل ہیں۔

بڑی بڑی سیاسی و ادبی شخصیات کے مکاتیب چوں کہ اس دور کی سیاست اور معاشرت کے عکاس ہوتے ہیں، اس لیے آنے والے وقتوں میں یہی مکاتیب ایک تاریخی دستاویز بن جاتے ہیں۔ جس طرح مرزا غالب کے مکاتیب سے، 1857ء میں دلّی کے قیامت خیز حالات کی مستند تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، اسی طرح علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مابین خط کتابت سے تحریکِ آزادی کے بعض واقعات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

مکاتیب کے حوالے سے ابوالکلام آزاد کی کتاب ''غبارِ خاطر'' جو دراصل ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے، بڑی اہم ہے۔

علاوہ ازیں ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہ آبادی، عبدالماجد دریابادی، سیّد سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھ پوری، فیض احمد فیض، ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی عبدالحق اور پطرس بخاری جیسے مشاہیر کے بیشتر مکاتیب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان دانشوروں کے مکاتیب کے مطالعہ سے جہاں مکتوب نگار کے زمانے کی سیاسی تاریخ اور طرزِ معاشرت کی تصویر سامنے آتی ہے، وہیں ان سے اردو زبان وادب میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

طنز ومزاح (Satire & Humour)

قادرِ مطلق نے اپنی مخلوق میں سے ہر جاندار کو زیادہ سے زیادہ پانچ حِسّوں سے نوازا ہے مگر انسان کو تین مزید حسّیں: چھٹی حِس (Common Sense)، حِسِ جمال (Aesthetic Sense) اور حِسِ مزاح (Sense of Humour) عطا کر کے اسے تمام جانداروں سے ممیّز ومشرف کر دیا ہے۔ اس وقت ہمارا روئے سخن، موضوع کے تحت، صرف حِسِ مزاح کی طرف ہے۔ ہنسنا ہنسانا انسانی فطرت ہے اور طبعی طور پر یہ صلاحیت کم یا زیادہ ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ جس طرح انسان جب مظاہرِ فطرت کے خوب صورت نظاروں کو دیکھتا ہے تو سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ اپنے معاشرے کے مضحک پہلوؤں پر اپنے آپ کو ہنسنے پر مجبور پاتا ہے۔ مولانا حالی نے مرزا غالب کو ''حیوانِ ظریف'' لکھا ہے تو محض اس بنا پر کہ مرزا غالب کی فطرت میں بذلہ سنجی، شوخ چشمی، طنز ومزاح اور لطیفہ گوئی کی حِس غیر معمولی طور پر موجود تھی اور ان کی کوئی بات بھی لطف وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ سر سیّد احمد خاں، علامہ اقبال ﷫، آغا حشر کاشمیری وغیرہم کا بھی یہی حال تھا اور ان کی تمام زندگی ساغرِ ظرافت سے لبریز رہی لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ کچھ انھی لوگوں پر موقوف نہیں بلکہ شوخی وظرافت کی حِس ہر شخص میں موجود ہوتی ہے اور انسان اپنے گرد وپیش کے حالات کے تقاضوں کے تحت اسے بروئے کار لاتا ہے، لیکن چوں کہ شاعر یا ادیب اپنے معاشرے کے حسّاس ترین افراد ہوتے ہیں، اس لیے یہ صلاحیت تمام لوگوں کی نسبت ان میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

طنز اور مزاح زبان وادب کے دو رنگ ہیں جو نظم ونثر دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ کبھی ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں اور کبھی الگ الگ۔ ان دونوں لفظوں میں معنوں کے اعتبار سے بھی فرق ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر اشفاق احمد ورک طنز اور مزاح میں فرق واضح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''طنز اور مزاح بیک وقت دو مختلف چیزیں بھی ہیں اور لازم وملزوم بھی۔ انگریزی ادب میں تو یہ دونوں اپنی اپنی خصوصیات، مزاج اور تاثیر کے اعتبار سے نمایاں طور پر الگ الگ پہچانی جاتی ہیں جب کہ اردو ادب میں ان دونوں میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ انھیں جدا کرنا کارِ دشوار ہے۔ طنز فن کی ضرورت ہے جب کہ مزاح طنز کا

لازمہ۔ مزاح کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے جب کہ طنز کا مقصد سوچنے کی دعوت دینا اور اصلاح کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے۔"

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو طنز و مزاح ادب کی ایک مشکل صنف ہے اور اس میں لکھنے والے کو بہت محتاط ہو کر لکھنا پڑتا ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی صحت منداور خوش گوار روایت کا آغاز مرزا غالب سے ہوتا ہے۔ مرزا غالب کے بعد "اودھ پنچ" اور "اودھ اخبار" نے بھی اسے خوب فروغ دیا۔ اس کے بعد کے مزاح نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری شامل ہیں۔ ان لوگوں کو اردو مزاح نگاری میں سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان تینوں مزاح نگاروں کے مضامین کے مجموعے بالترتیب "مضامینِ فرحت"، "مضامینِ رشید" اور "پطرس کے مضامین" کے ناموں سے شائع ہو کر قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

دورِ حاضر میں طنز و مزاح نے بہت ترقی کی ہے اور بے شمار ادیب اس صنفِ ادب میں مستند حیثیت رکھتے ہیں، جن میں ابنِ انشا، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خاں، ابراہیم جلیس، سیّد ضمیر جعفری، محمد خالد اختر، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، گلِ نوخیز اختر، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، ڈاکٹر اکرام سرا، محمد یونس بٹ، اعتبار ساجد، حسین مجروح، حسین احمد شیرازی، محسن مگھیانہ اور ڈاکٹر محمد کلیم کے نام شامل ہیں۔

جب تک انسان زندہ ہے، اس کی یہ فطرت بھی زندہ ہے۔ سیّد ضمیر جعفری نے کیا خوب کہا ہے:

غم نے کب آدمی کو چھوڑا ہے
خوب ہنس لو کہ وقت تھوڑا ہے

امید ہے کہ آنے والے دور میں یہ صنف اور بھی مقبول ہو گی کیوں کہ لوث غرض سے مردہ جذبات کو تر و تازہ کرنے کے لیے انسان کے پاس اس سے زیادہ مؤثر ذریعہ شاید کوئی اور نہ ہو گا۔

❁

مضمون (Essay)

مضمون کے لغوی معنی ہیں "ضمن میں لیا ہوا" لیکن اصطلاح میں مضمون اس عبارت یا تحریر کو کہتے ہیں جو کسی خاص بحث پر لکھی جائے۔ دوسرے لفظوں میں مضمون غیر داستانوی ادب کی وہ اہم نثری صنف ہے جس میں کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔

مضمون نویسی ایک نہایت مفید صنف ہے۔ اس کے موضوعات میں بہت وسعت اور بڑا تنوع ہے۔ اخلاقی، اصلاحی، علمی،

ادبی، سائنسی، تنقیدی، تاریخی، سوانحی غرض کہ ہر موضوع پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

مضمون کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع کے حسب حال زبان و بیان میں سادگی، سلاست اور دل آویزی ہو اور خیالات کی ترتیب میں کہیں بھی الجھاؤ نہ ہو البتہ ادبی نوعیت کے مضامین میں عبارت آرائی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

مضمون لکھنے کے بندھے ٹکے اصول نہیں ہوتے البتہ ہر مضمون کی ایک منطقی ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے، پھر اس کے بارے میں مضمون نگار اپنے نقطۂ نظر سے موضوع کی نسبت سے مخالفت یا موافقت میں دلائل دیتا ہے اور آخر میں نتیجہ پیش کرتا ہے۔

اردو میں مضمون نویسی کا باقاعدہ آغاز سر سیّد احمد خاں (1817ء-1898ء) سے ہوا۔ انھوں نے علمی و تحقیقی، اخلاقی و اصلاحی، ملکی و سیاسی اور مذہبی و تاریخی مضامین کے علاوہ سوانح و سیرَ اور ادبی و تنقیدی موضوعات پر بکثرت مضامین لکھے۔ سر سیّد قلم برداشتہ لکھنے پر قادر تھے۔ انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا ہی مضامین لکھنے کے لیے کیا تھا۔ وہ نہ صرف خود لکھتے تھے بلکہ انھوں نے اپنے دوست احباب کو بھی ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھنے کی طرف راغب کیا اور کتنی خوش آیند بات ہے کہ سر سیّد کی کوششوں سے جلد ہی لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی جس میں مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، نواب اعظم یار جنگ، مولوی ذکاء اللہ، ان کے فرزند مولانا عنایت اللہ، مولوی وحید الدین سلیم، محسن الملک، وقار الملک اور مولانا عبدالحلیم شرر کے علاوہ کچھ دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ مولانا حالی، سر سیّد احمد خاں کے نمایاں کارناموں میں ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''مضمون نویسی ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ تھا اور وہ اس مشغلے میں بڑا اطمینان اور سکون محسوس کرتے تھے۔''

مضامین و مقالات کے سلسلے میں سر سیّد نے جن موضوعات اور عنوانات کے تحت مختلف اوقات میں حسب ضرورت اور حسب موقع قلم اٹھایا تھا، انھیں مجلسِ ترقی ادب لاہور نے سولہ جلدوں میں طبع کیا ہے۔

سر سیّد کے رفیقوں نے جو مضامین و مقالات لکھے وہ بھی اردو زبان و ادب کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، جس کی تفصیل میں جانے کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے اور اس کی یہاں گنجائش نہیں مگر ہم اتنا ضرور بتاتے چلیں کہ سر سیّد اور ان کے رفقا نے مضامین و مقالات کے ذریعے اردو زبان کی بڑی خدمت کی اور لوگوں پر واضح کر دیا کہ اردو زبان تہی دامن نہیں بلکہ اس میں دقیق سے دقیق اور رُوکھے سے رُوکھے موضوع پر بھی بآسانی گفت گو ہو سکتی ہے۔

موقع کی مناسبت سے ہم اپنے طلبہ پر واضح کر دیں کہ مضمون اور مقالہ در حقیقت ایک ہی صنف کے دو روپ ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ مضمون مختصر ہوتا ہے جو پانچ چھے صفحات سے زیادہ طویل نہیں ہوتا اور اس کا اسلوب

تاثراتی اور مفہوم سادہ و سلیس ہوتا ہے جب کہ مقالہ مضمون کی نسبت کہیں زیادہ طویل اور عالمانہ و فاضلانہ ہوتا ہے اور اس میں ایک تو مضمون کی نسبت گہرائی ہوتی ہے اور دوسرے وہ تحقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔

انشائیہ بھی مضمون ہی کی ایک دوسری شکل ہے مگر ایک انشائیے کا انداز مضمون کے منطقی انداز کے برعکس غیر رسمی ہوتا ہے اور اسے کہیں سے بھی شروع کر کے کہیں بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے انشائیے کی زبان شستہ و رواں کے بجائے زیرِ لب تبسم کا انداز لیے ہوئے شگفتہ اور غزل کی طرح رمز و کنائے کی زبان ہوتی ہے اور انشائیہ لازمی طور پر انشائیہ نگار کے داخلی جذبات و تاثرات کا ترجمان ہوتا ہے یعنی اس میں مصنف کی ذات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

❁

انشائیہ

انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی سے آئی ہے۔ انشائیہ کا مفہوم اردو ادب میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں (Eassy) کا ہے۔

انشائیہ مضمون کی ایک ایسی قسم ہے جس میں استدلالی کے بجائے تاثراتی اور تخلیقی کیفیت پائی جاتی ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی موضوع پر اپنے ذاتی اظہارِ خیال کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار بے تکلف، سادہ اور بے ساختہ انداز میں اپنے ذاتی، انفرادی اور تاثراتی خیالات کو پیش کرتا ہے اور اس کے اسی شخصی اور انفرادی اظہارِ خیال کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی موضوع کے منفرد پہلو بیان کیے جاتے ہیں۔ انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کا انوکھا اور منفرد انداز ہے۔ انشائیہ میں خیالات اور تاثرات کا اظہار ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کہیں بھی خطیبانہ رنگ پیش نہیں ہوتا اور اصلاح کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر اپنا نقطہ نظر دلچسپ اور جاذب طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ البتہ انشائیہ میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انشائیہ نگار کی ذات کی جھلک نمایاں ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی بھی موضوع پر اپنے ذاتی اور انفرادی تاثرات اور خیالات بیان کرتا ہے۔ انشائیہ میں واقعات سے زیادہ اس پر بیان کیے گئے تاثرات اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انشائیہ نگار اپنی تحریر میں ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ سنجیدہ سے سنجیدہ بات بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہتا چلا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی اصلاحی مقصد نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے خیالات کا اظہار مزے سے بیان کرتا ہے۔ لیکن ان باتوں میں بورئیت کی بجائے شگفتگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ انشائیہ میں ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ روانی بھی ہوتی ہے جو انشائیے کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ انشائیہ کا انداز بیان فطری، دلکش، شگفتہ، نادر اور دلچسپ ہوتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو انوکھے رنگ میں پیش کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔ انشائیہ علمی اور استدلالی کی بجائے تخلیقی ادب کا حصہ ہے۔ اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہم مرزا فرحت اللہ بیگ، سجاد حیدر

یلدرم، ڈاکٹر وزیر آغا، مشکور حسین یاد، عبدالحلیم شرر، مولوی ذکا اللہ، جوش ملیح آبادی اور خواجہ حسن نظامی کے نام بڑے واضح انداز میں شامل کر سکتے ہیں۔

❀

مقالہ

مقالہ (Thesis) اور مضمون درحقیقت ایک ہی صنف کے دو روپ ہیں اور جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ دونوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ مضمون قدرے مختصر ہوتا ہے اور پانچ چھے صفحات سے زیادہ طویل نہیں ہوتا اور اس کا اسلوب تاثراتی اور مفہوم سادہ و سلیس ہوتا ہے جب کہ مقالہ مضمون کی نسبت کہیں زیادہ طویل اور عالمانہ و فاضلانہ ہوتا ہے اور اس میں ایک تو مضمون کی نسبت گہرائی ہوتی ہے اور دوسرے وہ تحقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مضمون میں ذاتی رائے کو فوقیت دی جاتی ہے، جو غیر سنجیدہ بلکہ بعض اوقات مزاحیہ بھی ہوتی ہے اور جس کا مقصد سراسر تفریحِ طبع ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مقالہ نہایت سنجیدگی اور ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے، جس میں قدم قدم پر حوالہ جات اور دلائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ موجودہ دور تحقیق کا دور ہے۔ اس لیے تقریباً تمام جامعات میں علم کے معیار کو جانچنے کے لیے اچھے تحقیقی مقالات ہی پر انحصار کیا جاتا ہے۔

❀

روداد نویسی

روداد فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کیفیت، ماجرا، سرگزشت یا عدالتی کارروائی کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں روداد سے مراد ایسی تحریر ہے جس میں کسی جلسہ، واقعہ، تقریب، میلے یا حادثے کا آنکھوں دیکھا حال نہایت ہی غیر جانبداری سے بیان کیا جائے۔ یہ صنفِ مضمون سے مخف ہے۔ ہم اسے کسی تقریب یا واقعہ کی تلخیص یا جائزہ بھی کہہ سکتے ہیں تاکہ جنھوں نے اس جلسہ، واقعہ، میلہ یا تقریب کو نہیں دیکھا تھا یا وہ وہاں موجود نہیں تھے، وہ اس سے واقف ہو سکیں۔

صحافتی روداد لکھنے کے کچھ مسلمہ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر روداد کسی خاص واقعہ یا شخص کے بارے میں ہے تو ابتدا میں اس کا تعارف چند سطروں میں پیش کیا جائے۔ ہمارے ہاں اسے زیادہ تر مختلف تقاریب کا حال بیان کرنے یا صحافتی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اردو میں یہ باقاعدہ صنف کا درجہ اختیار نہیں کر پائی اور اردو ادب میں بہت کم رودادیں نظر آتی ہیں۔ البتہ ہم جب بھی روداد کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں مرزا غالب کا یہ شعر ضرور آ جاتا ہے:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

علاوہ ازیں روداد لکھتے وقت ضروری ہے کہ تاریخ، وقت، مقام اور حاضرین کا ذکر کیا جائے اور روداد لکھتے ہوئے زبان سادہ، آسان اور عام فہم استعمال کی جائے۔ روداد ہمیشہ پیراگرافوں کی صورت میں تحریر کی جائے۔ واقعاتی ترتیب اور تسلسل کا خیال رکھا جائے۔ رودادنویسی میں موضوع سے متعلق اصل حقائق کو سادہ اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے۔ تاہم غیر اہم تفاصیل سے اجتناب برتا جائے۔ رودادنویسی میں آغاز اور اختتام کا خاص خیال رکھا جائے۔ اہم افراد کے ساتھ ساتھ، مقام کی آرائش وزیبائش سے بھی آگاہ کیا جائے۔ مہمان خصوصی اور بعض اہم شخصیات کی تقاریر کے بھی اہم نکات پیش کیے جائیں۔ اگر روداد لکھتے ہوئے تقریب یا انجمن کی کارروائی کو من وعن اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ تقریب کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جائے تو وہ کامیاب روداد کہلاتی ہے۔

کالم نگاری

کسی واقعے، حادثے یا سانحے کو اپنے علم اور مشاہدے کے زور پر بیان کرنا کالم نویسی کہلاتا ہے۔ کالم یا کالم نویسی فرانسیسی لفظ (Colomne) اور لاطینی زبان کے لفظ (Columna) سے ماخوذ ہے۔ جس کے معانی کھمبا یا ستون کے ہیں۔ کالم نگار کسی بھی موضوع پر حقیقی بنیادوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ کالم اخباری قدروں کی بنیاد پر اپنی شناخت کرواتا ہے۔ کالم کی بنیاد خبر پر ہوتی ہے۔ کسی بھی خبر پر کالم نویس اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر اظہار خیال کرتا ہے۔ کالم نگار معاشرے میں موجود مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے مشاہدے کے زور پر مختلف موضوعات پر تحقیق کرتا ہے اور پھر اپنی تحریر کے ذریعے معاشرتی نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرے کے مختلف موضوعات پر اپنے علم اور مشاہدے کی بنیاد پر قلم اٹھاتا ہے۔ کالم نگاروں میں موضوعات کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سماجی، سیاسی، نفسیاتی، سیاحتی، معاشرتی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ طبی، دینی، اقتصادیاتی، پامسٹری، علم نجوم، فیشن، کھیل اور کھلاڑی، انڈسٹری، معیشت کسی بھی موضوع پر اپنے علم وفہم، عقل واستدلال اور حقیقی بنیادوں پر کالم نویس اپنے مشاہدات کو پیش کرتا ہے۔ کبھی نرم ونازک لہجے اور کبھی شعلہ بیانی سے کام لیتا ہے۔ اس مقصد معاشرے کو اس کی اصل صورت دکھانا ہوتا ہے جس میں وہ آئینے کا کام کرتا ہے۔ کالم نویس الفاظ کے چناؤ کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس کا لب ولہجہ صحافتی ہوتا ہے یعنی وہ دوٹوک انداز میں کالم تحریر کرتا ہے۔ قاری کے وقت کی اہمیت کا خاص خیال رکھتا ہے۔ کم لفظوں میں زیادہ معانی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ واقعات کی سچائی کا خاص خیال رکھتا ہے۔ معاشرے میں بہتری لانے کے ظالم ومظلوم، حاکم ومحکوم، جبر وظلم واستبداد کو درست طریقے سے بیان کرتا ہے تاکہ عوام کے مسائل کا سدِ باب ہو سکے۔ کالم نگاری میں صحافتی انداز اپناتے ہوئے افسانوی انداز بیان سے پرہیز کرتا ہے۔ پے تلے حقیقی لہجے میں تحریر پیش کرتا ہے۔ کالم میں واقعات کی ترتیب اور تسلسل بیان کا خیال

رکھتا ہے۔اپنی ذاتی پسند ناپسند سے بالاتر ہوکر واقعات اور شخصیات کو حقائق کی روشنی میں پیش کرنا کالم نگاری کا خاصہ ہے۔جس طرح سفرنامے میں شگفتہ اسلوب کا ہونا لازمی ہے،اسی طرح کالم کے لیے بھی لطائف وظرائف کا ہونا ضروری ہے۔اگر ہم اردو کالم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ اسے ادب کا حصہ وہیں تسلیم کیا گیا ہے جہاں اس میں طنز ومزاح اور حکمت و دانش کی مناسب آمیزش کی گئی ہے۔

❁

تحقیق

ذہین آدمی غور وفکراور تدبّر کا عادی ہوتا ہے۔زندگی کے عام مسائل سے متعلق عموماً اور جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے،ان سے متعلق خصوصاً وہ سوچتا رہتا ہے یا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے اور وہ فطری طور پر اپنے حالات کو بدلنا یا بہتر بنانا چاہتا ہے، اس لیے اس کے ذہن میں نت نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پرانے مسائل سے متعلق نئے نئے پہلو اور شکوک وشبہات اس کے سامنے آتے ہیں۔وہ ان مسائل کو حل کرنا یا شکوک دُور کرکے یقین میں بدلنا چاہتا ہے۔یہیں سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے اور منظم دماغ مسائل کو حل کرنے میں خوش محسوس کرتا ہے اور اس وقت تک کوشش کرتا رہتا ہے جب تک وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائے۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے،جس کے معنی ہیں اصلیّت معلوم کرنا، دریافت کرنا،کھوج لگانا،تفتیش کرنا یا حقیقت کو ثابت کرنا۔یہ کھرے کو کھوٹے سے،حق کو باطل سے،مغز کو چھلکے سے الگ کرنے کا عمل ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ ''تحقیق وتنقید'' سے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

> ''تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اظہار یا اس کا اثبات ہے۔اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے،جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلّمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

تحقیق اصل میں سچائی کی جستجو کا نام ہے۔یہ مفروضے سے نتائج کی طرف، مشاہدے سے تجربے کی طرف، شبہے سے حقیقت کی طرف اور نامعلوم سے معلوم کی طرف ایک سفر ہے یا پھر دھندلے نقوش کو واضح کرنے کا عمل ہے۔

جہاں تک اردو میں باقاعدہ تحقیق کے آغاز کا سوال ہے تو اس کا ہمیں باقاعدہ آغاز سرسیّد میں نظر آتا ہے۔سرسیّد احمد خاں کی کتابوں آثارالصنادید،خطبات احمدیہ،مولانا حالی کی سوانح عمریاں اور مولانا شبلی نعمانی کی سوانح وسیرت نگاری کی کتابیں اس کی روشن مثالیں ہیں۔اس ضمن میں حافظ محمود شیرانی،مولوی عبدالحق،ڈاکٹر مسعود حسن خاں،رشید حسن خان،ڈاکٹر وحید قریشی،ڈاکٹر جمیل جالبی،ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر تحسین فراقی،ڈاکٹر رؤف پاریکھ،ڈاکٹر نجیب جمال،زاہد منیر عامر،اکرام چغتائی اور ڈاکٹر رفاقت علی شاہد اہم نام ہیں۔

❁

تنقید

تنقید عربی زبان کے لفظ ''نقد'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا یا کسی چیز یا فن پارے کے بارے میں غور و فکر کے بعد اس کی خوبیوں یا خامیوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ اصطلاحی لحاظ سے تنقید سے مراد کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقی کاوش کے محاسن و عیوب تلاش کرنے کے بعد اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنا ہے۔ تنقید نگاری وہ فن ہے جس میں کسی ادب پارے کے بارے میں اصول و قواعد اور حق و انصاف کے تقاضوں کے پیش نظر رکھتے ہوئے بے لاگ تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس کے اوصاف و نقائص کو ذاتی نظریات اور تعصبات سے بالاتر ہو کر واضح کیا جاتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کے خیال میں تنقید ہماری زندگی میں اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا سانس لینا۔ محدود معنوں میں تنقید کا مطلب کسی فن پارے میں خوبیوں، خامیوں کی نشان دہی کرنا ہے جب کہ وسیع تر مفہوم میں یہ اچھی تخلیق کے لیے راستے بجھانے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مؤرخ، ماہرِ نفسیات، ایک شاعر یا ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔''

اردو میں تنقید کی تاریخ بڑی طویل ہے اور اس کی اقسام پر بھی توضیحی بحث کی جاسکتی ہے مگر اس موقع پر ان باتوں کا ذکر نہیں کیا جاسکتا البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد (1830ء-1910ء) کی تصنیف ''آبِ حیات'' اردو تنقید کی دنیا میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے جو بیک وقت تنقید بھی ہے اور تذکرۂ ادب بھی۔ مولانا آزاد کے بعد اردو تنقید میں مستند اور نامور نام مولانا الطاف حسین حالی کا ہے جن کی کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اردو میں ایک مستقل اور اہم تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے بعد مولانا شبلی نعمانی، مولانا وحید الدین سلیم، عبدالرحمٰن بجنوری، عظمت اللہ خاں، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبدالقادر، رشید احمد صدیقی، کلیم احمد احمد، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان اور ڈاکٹر بصیرہ عنبرین وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

❀❀

ساتواں باب

قواعد و زبان دانی

اصطلاحاتِ زبان

وہ لفظ جس کے کوئی خاص معنی ہوں، اصطلاح کہلاتا ہے۔ جیسے "حدیث" کے لغوی معنی تو بات چیت کے ہیں مگر شریعت کی اصطلاح میں "حدیث" رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو کہتے ہیں۔ اسی طرح "نسخہ" کے معنی "لکھا ہوا" کے ہیں مگر طب کی اصطلاح میں "نسخہ" سے مراد وہ پرچہ لیتے ہیں جس پر مریض کو دوا میں لکھ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ہر زبان کی مانند اردو میں بھی بے شمار اصطلاحات رائج ہیں، جن میں سے آسان اور عام اصطلاحات ہم اپنے طلبہ کی سہولت اور استفادے کے لیے ذیل میں لکھے دیتے ہیں۔ طلبہ پر لازم آتا ہے کہ انھیں ازبر کر لیں۔

حروفِ تہجی: حرف وہ نشان یا علامت ہے جو آواز کو ظاہر کرے۔ حروف سے الفاظ بنتے ہیں اور زبان وجود میں آتی ہے۔ اردو کے حروفِ تہجی الف سے ے تک بشمول ہمزہ 37 بنتے ہیں۔ ان میں سے بیس وہ حروف ہیں جن پر نقطے نہیں آتے اور وہ ہیں: ا، ٹ، ح، د، ڈ، ر، ڑ، س، ص، ط، ع، ک، گ، ل، م، و، ہ، ھ، ی، ے اور سترہ حروف ایسے ہیں جو منقوط ہیں اور وہ یہ ہیں: ب، پ، ت، ث، ج، چ، خ، ذ، ز، ژ، ش، ض، ظ، غ، ف، ق اور ن۔ ان کے علاوہ ہائے مخلوط والے چودہ بھاری حروف ہیں جو یہ ہیں: بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، مھ اور نھ۔

حروفِ ابجد: اہلِ علم نے عربی زبان کے 28 حروفِ تہجی کو آٹھ الفاظ میں جمع کر کے ان میں سے ہر حرف کے عدد مقرر کر دیے ہیں۔ انھیں حروفِ ابجد کہتے ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ابجد	ہوز	حطی	کلمن
ا ب ج د	ہ و ز	ح ط ی	ک ل م ن
4 3 2 1	7 6 5	10 9 8	50 40 30 20
سعفص	قرشت	ثخذ	ضظغ
س ع ف ص	ق ر ش ت	ث خ ذ	ض ظ غ
90 80 70 60	400 300 200 100	700 600 500	1000 900 800

حروفِ شمسی اور حروفِ قمری

حرف کسی آواز کی لکھی ہوئی شکل کو کہا جاتا ہے۔ کسی آواز کی تحریری شکل کو پڑھنا اس زبان کو سیکھنے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور عربی زبان میں تو، جو دنیا کی فصیح ترین زبان ہے، اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے، کیوں کہ عربی زبان میں ملتی جلتی آوازیں کثرت سے ہیں نیز دوسری کچھ زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی بعض حروف ایسے ہیں جو لکھنے میں آتے ہیں مگر بولنے میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر ال ہے، جو عربی زبان میں کسی اسم کو خاص بنانے کے لیے اس سے پہلے لگایا جاتا ہے جیسے کتاب سے مراد لکھی ہوئی تحریر یا کوئی بھی کتاب ہے، لیکن جب ہم الکتاب کہتے ہیں تو اس سے مراد کوئی عام کتاب نہیں بلکہ خاص کتاب یعنی قرآن مجید ہے اور الکتاب کا لفظ صرف قرآن مجید ہی کے لیے بولا اور لکھا جاتا ہے۔

اب عربی کے بعض حروف ایسے ہیں، جن سے پہلے ال لگایا جائے تو ال کے بعد آنے والا لام پڑھا جاتا ہے اور بعض حروف سے پہلے نہ الف پڑھا جاتا ہے اور نہ لام۔ اس اعتبار سے ہم عربی حروف کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: ایک حروف شمسی، دوسرے حروف قمری۔ حروفِ شمسی کون سے ہیں اور حروفِ قمری کون سے، اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل دو آیتیں ملاحظہ کیجیے:

1۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

2۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

پہلی آیت میں اللہ، رحمٰن اور رحیم ایسے الفاظ ہیں جن سے پہلے ال تو استعمال ہوا ہے لیکن تینوں جگہ الف اور لام پڑھنے میں نہیں آتا اور تینوں الفاظ ل یا ر سے شروع ہوتے ہیں۔ ل اور ر اور اسی قسم کے دوسرے حروف جن سے پہلے ال استعمال ہوا اور یہ ال پڑھنے میں نہ آئے، حروفِ شمسی کہلاتے ہیں کیوں کہ عربی میں شمس سورج کو کہتے ہیں اور شمس سے پہلے اگر ال لگایا جائے تو لام پڑھنے میں نہیں آتا۔ اس لیے اس قسم کے تمام حروف کو حروفِ شمسی کہا جاتا ہے۔

اب دوسری آیت دیکھیے، اس میں بھی حمد اور عالمین سے پہلے ال تو استعمال ہوا ہے لیکن ان میں ال کی آواز واضح طور پر ظاہر کی جاتی ہے اور اگر ال کو نہ پڑھا جائے تو لفظ غلط ہوگا۔ اب حمد اور عالمین کے الفاظ ح اور ع سے شروع ہوتے ہیں۔ ح اور ع اور اس قسم کے تمام دوسرے حروف کو، جن سے پہلے ال لگایا جائے تو لام اپنی پوری اور واضح آواز دے، قمری حروف کہا جاتا ہے کیوں کہ قمر عربی زبان میں چاند کو کہتے ہیں اور اس سے پہلے ال لگا کر القمر بنایا جاتا ہے تو اس میں لام کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ اس قسم کے تمام حروف کو قمری حروف کہا جاتا ہے گویا:

حروفِ شمسی: وہ حروف ہیں، جن سے پہلے اگر ال لگایا جائے تو الف اور لام اپنی آواز نہ دیں مثلاً الشمس میں ش اور النور میں ن۔

عربی میں حروفِ شمسی مندرجہ ذیل ہیں:

ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ل اور ن۔ ان حروف کی تعداد چودہ ہے۔

حروفِ قمری: یہ وہ حروف ہیں، جن سے پہلے اگر ال لگایا جائے تو لام اپنی پوری آواز دے مثلاً القرآن میں ق اور الحمد میں ح۔ اسی طرح حروفِ قمری کی تعداد بھی چودہ ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ اور ی۔

❀

مطابقت

مطابقت کے معنی ہیں مطابق کرنا یا برابر کرنا لیکن قواعدِ زبان کی رُو سے فعل کی اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور علامتِ اضافت (کا، کے، کی) کی اپنے مضاف کے ساتھ نسبت کے بدلتے ہوئے اصولوں کو مطابقت کہتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فعل اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ، صفت اپنے موصوف کے ساتھ اور علامتِ اضافت اپنے مضاف کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً ان جملوں پر غور کیجیے:

1۔ ماں چلی گئی۔ 2۔ بیٹا چلا گیا۔

3۔ ماں اور بیٹا دونوں چلے گئے۔ 4۔ علم انسان کا درجہ بڑھا دیتا ہے۔

5۔ علم اور نیک چلنی انسان کا درجہ بڑھا دیتے ہیں۔

❀

حروف کی اقسام

حرف وہ کلمہ ہے جو نہ تو کسی شخص یا چیز کا نام ہو، نہ کسی کام کے کرنے یا ہونے کو ظاہر کرے اور نہ ہی اپنے الگ کوئی معنی رکھتا ہو، بلکہ یہ مختلف کلموں کو آپس میں ملاتا اور ان کے ساتھ مل کر ہی بامعنی بنتا ہے۔ مثلاً: پر، کا، اور وغیرہ۔

حروف کی اقسام : اردو میں حروف کی بہت سی اقسام ہیں، جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

حروفِ جار : وہ حروف ہیں جو اسما اور افعال کو آپس میں ملاتے ہیں۔ مثلاً: میں، سے، پر، تک، ساتھ، اوپر، نیچے، لیے، واسطے وغیرہ

حروفِ اضافت : وہ حروف ہیں جو دو اسموں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً: کا، کے، کی

حروفِ عطف : وہ حروف ہیں جو دو اسموں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً: و، اور، نیز

حروفِ استفہام : وہ حروف ہیں جو کچھ پوچھنے کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: کیا، کیوں، کہاں، کب، کون، کیسا، کس لیے، کس طرح وغیرہ

حروفِ ندا : وہ حروف ہیں جو کسی اسم کو ندا دینے یا پکارنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً: اے، یا، اجی، او، ارے وغیرہ

حروفِ تشبیہ : وہ حروف ہیں جو کسی ایک چیز کے مشابہ یا مانند قرار دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً: مانند، طرح، جیسا، سا، جوں، مثل، بصورت وغیرہ

حروفِ تحسین : وہ حروف ہیں جو تحسین و آفرین کے موقع بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: شاباش، خوب، واہ، سبحان اللہ، مرحبا، آفرین وغیرہ

حروفِ نفرین : وہ حروف ہیں جو نفرت یا ملامت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً: توبہ، لعنت، تف، معاذ اللہ، استغفر اللہ، لاحول ولاقوۃ وغیرہ

حروفِ استدراک : وہ حروف ہیں جو پہلے جملے میں آنے والے کسی شبہ کو دور کرنے کے لیے دوسرے جملے میں استعمال ہوں۔ مثلاً: مگر، لیکن، ہاں، البتہ وغیرہ

حروفِ تاکید : وہ حروف ہیں جو کلام تاکید اور زور پیدا کریں۔ مثلاً: ہرگز، ضرور، مطلق، بالکل، زنہار وغیرہ

حروفِ علت : وہ حروف ہیں جو کسی بات کے سبب یا علت کو ظاہر کریں۔ جیسے: کہ، کیوں کہ، تاکہ، اس لیے کہ، تا وغیرہ

مرکب ناقص کی اقسام

مرکب ناقص وہ کلام ہے جس سے سننے یا پڑھنے والے کو پورا پورا مفہوم حاصل نہ ہو۔ مثلاً ٹھنڈا پانی، پھول اور کانٹا، پانچ کرسیاں وغیرہ۔ مرکب ناقص کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً مرکب اضافی، مرکب توصیفی، مرکب عطفی، مرکب عددی، مرکب جاری، مرکب اشاری، مرکب ندائیہ، مرکب تاکیدی، تابع مہمل، تابع موضوع، مرکب بیانی وغیرہ مگر ہم یہاں ابتدائی تین مرکبات کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ مُرکب اضافی: وہ مرکب ہے جو مضاف، مضاف الیہ اور حرف اضافت (کا، کے، کی) سے مل کر بنے۔ مثلاً ادریس کا گھر، احمد کے ابا جان، توصیف کی کتاب وغیرہ۔ اردو میں فارسی مرکبات کثرت سے مستعمل ہیں۔ فارسی

میں حرفِ اضافت (کا، کے، کی) کی جگہ اضافتِ کسرہ (ِ) یا ہمزہ (ء) آتا ہے جیسے: صاحبِ خانہ (گھر کا مالک) ذرّۂ خاک وغیرہ۔

2۔ مرکّبِ توصیفی: وہ مرکّب ہے جو صفت اور موصوف سے مل کر بنے مثلاً: نیک آدمی، بدکردار، چالاک بھیڑیا، معصوم بچہ وغیرہ۔ ان مرکّبات میں بالترتیب نیک، بد، چالاک اور معصوم صفت ہے جب کہ آدمی، کردار، بھیڑیا اور بچہ موصوف ہیں۔ فارسی مرکّبات میں اردو کے برعکس موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے مثلاً مردِ نیک، بچۂ معصوم وغیرہ۔

3۔ مرکّبِ عطفی: مرکّبِ عطفی وہ مرکّب ہے جو معطوف علیہ، حرفِ عطف (و، اور نیز) اور معطوف سے مل کر بنے۔ حرفِ عطف سے پہلے آنے والے کلمے کو معطوف علیہ اور حرفِ عطف کے بعد آنے والے کلمے کو معطوف کہتے ہیں۔ یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے: بہار و خزاں، گل و خار، پھول اور کانٹا، حامد نیز محمود۔ ان مثالوں میں حرفِ عطف سے پہلے آنے والے اسما بہار، گل، پھول اور حامد ہیں۔ ان کو معطوف کہتے ہیں، جب کہ خزاں، خار، کانٹا، محمود کے اسما معطوف علیہ کہلائیں گے۔

نوٹ: فارسی حرفِ عطف واؤ (و) ہمیشہ فارسی یا عربی الفاظ میں آتا ہے۔ ہندی، اردو یا انگریزی الفاظ کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً: گل و لالہ، لوح و قلم، خشک و تر، وغیرہ مرکبات درست ہیں لیکن کالج و یونیورسٹی، گائے و بھینس، باغ و سڑک درست نہیں، ان کے بجائے کالج اور یونیورسٹی، گائے اور بھینس، باغ اور سڑک کہنا درست ہوگا۔

❁

امدادی افعال (افعالِ معاون)

تعریف: تحریر و تقریر میں بسا اوقات اصل فعل کے ساتھ کوئی دوسرا فعل یا اس کا جز و استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے اصل فعل کے معنوں میں تھوڑا بہت تغیر پیدا ہو جاتا ہے، یا تو اصل فعل کے معنوں میں زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ہے یا کلام میں کوئی حسن اور خوبی آ جاتی ہے۔ وہ افعال یا ان کے اجزا، جو اصل فعل کی مدد یا معاونت کے طور پر آتے ہیں، امدادی افعال یا افعالِ معاون کہلاتے ہیں۔

وضاحت: امدادی افعال کا کام بنیادی افعال کے معنوں کی تکمیل و تقویت ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ

تمام بنیادی افعال، امدادی افعال کے طور پر استعمال نہیں ہوتے جب کہ تمام امدادی افعال بنیادی افعال بھی ضرور ہوتے ہیں۔

عام طور پر امدادی فعل اصل فعل کے بعد ہی آتا ہے جیسے امدادی افعال دینا اور لینا کی مناسبت سے یہ جملے:

1- میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔

2- یہ رقم رکھ لیجیے۔

لیکن کبھی کبھی امدادی فعل اصل فعل سے پہلے بھی آ جاتا ہے۔ جیسے یہ جملے:

1- اور تو اور وہ مجھ کو بھی لے ڈوبا۔

2- ایک پہلوان نے دوسرے پہلوان کو سر پر اٹھایا اور نیچے دے پٹکا۔

3- ع ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اردو میں بالعموم استعمال ہونے والے امدادی افعال جن مصادر سے بنتے ہیں وہ یہ ہیں:

دینا، لینا، آنا، جانا، ڈالنا، پڑنا، ہونا، بیٹھنا، اٹھنا، رہنا، چکنا، سکنا، پانا، کرنا، نکلنا، لگنا، چاہنا، رکھنا وغیرہ۔ مندرجہ بالا مصادر کو جملوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ان مثالوں کو بغور دیکھیے۔ ساتھ ساتھ چند شعری مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

(1) دینا: 1- وہ چل دیا۔ 2- میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔

3- اسے اندر آنے دو۔ 4- براہِ کرم مجھے جانے دو۔

5- باپ نے ناخلف بیٹے کو گھر سے نکال دیا وغیرہ

ے اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

ے نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

(2) لینا: 1- جب چاہیں بلا لیں۔ 2- یہ رقم رکھ لیجیے۔

3- میں نے تمھاری بات سن لی ہے۔ 4- اسلم نے ڈوبتے کو بچا لیا۔

5- یہ خط پڑھ لیجیے۔ 6- راستے میں طوفان نے آ لیا۔

ے روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

ے مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

(3) آنا: 1- اگر بن آیا تو تمھاری طرف بھی آؤں گا۔ 2- پہلے اسے دیکھ آؤ۔
3- اسلم کی طرف بھی ہو آنا۔ 4- جاؤ پہلے بچے کو سکول چھوڑ آؤ۔
5- جب چاہو چلے آنا۔ 6- یہ خیال کیسے ابھر آیا؟
7- میرا دل بھر آیا ہے۔

؎ ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے
؎ اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(4) جانا: 1- پتے بکھر گئے۔ 2- ابھی بیٹھو پھر چلے جانا۔
3- وہ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔ 4- پانی بہتا جاتا ہے۔
5- میں خط لکھا جاتا تھا اور وہ پڑھتا جاتا تھا۔

؎ ناامیدی مٹائے جاتی ہے شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
؎ ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے ہُنر کی، عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں
عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

(5) ڈالنا: 1- "مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے" (مرزا غالب بنام میر مہدی حسین مجروح)
2- پولیس نے ملزم کی کھال ادھیڑ ڈالی۔ 3- بچے نے چیونٹی کو پاؤں تلے مسل ڈالا۔
4- جو دل میں ہے ابھی سے کہہ ڈالو۔ 5- میں نے سوتے ہوئے حامد کو جھنجھوڑ ڈالا۔
6- تمام لکڑی چیر ڈالو۔ 7- لگائی بجھائی نے بالآخر بھائیوں میں جدائی کر ڈالی۔

؎ تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
؎ توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے او ظالم اسے تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا
؎ نہ پوچھ مجھ سے لذّتِ خانماں برباد رہنے کی نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

(6) پڑنا: 1- آج بہت دنوں بعد دکھائی پڑے ہو؟ 2- چاند آنگن میں اتر پڑا۔
3- وہ مجھ پر برس پڑا۔ 4- آج حامد محمود سے الجھ پڑا۔
5- دونوں دوست لڑ پڑے۔ 6- آپ کو مجھ سے معافی مانگنا پڑے گی۔

7- اسے بالآخر شرمندہ ہونا پڑا۔ 8- پھر وہ رو پڑا۔

9- بچہ چھت سے گر پڑا۔ 10- ہماری فوج دشمن پر ٹوٹ پڑی۔

؎ اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

؎ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

(7) ہونا: 1- اگر وہ آیا ہوتا تو مجھے ضرور اطلاع ہوتی۔ 2- یہ تمام واقعہ میرا سنا ہوا ہے۔

3- غالباً اس نے ایسا ضرور کیا ہو گا۔ 4- اگر وہ ایسا کرتا ہوتا تو اب تک نہ بچتا۔

5- اگر وہ پڑھتا ہوتا تو آج کسی بڑے عہدے پر ہوتا۔ 6- وہ ہوسٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔

؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(8) بیٹھنا: 1- وہ دشمن کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے۔ 2- ہم تو اپنی قسمت کو رو بیٹھے ہیں۔

3- دراصل وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ 4- احمد اپنے سب دوستوں سے لڑ بیٹھا ہے۔

5- وہ ایسے کام اکثر بے سوچے سمجھے کر بیٹھتا ہے۔ 6- میں ہی پوچھ بیٹھا ہوں تو بتا دو۔

؎ کیا فلک ٹوٹ پڑا بعدِ فنا بھی مجھ پر بیٹھی بیٹھی ہے، دبی جاتی ہے تربت میری

(9) اٹھنا: 1- وہ یکا یک بول اٹھا۔ 2- وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔

3- میری بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ 4- کھلونا دیکھتے ہی بچے کا دل مچل اٹھا۔

5- چور بھاگ اٹھے۔ 6- میرا دل غصے سے جل اٹھا۔

؎ دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

؎ مزا کیا دل کو آتا ہے نہ جانے بے قراری میں تڑپ اٹھا یہ دیوانہ جو دم بھر کی خوشی آئی

(10) رہنا: 1- کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہو گے؟ 2- وہ سو رہا ہے۔

3- وہ بولتا رہا اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ 4- وہ کیا کھا رہا ہے؟

5- کیا سوچ رہے ہو؟ 6- وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔

7- میں تو درویش ہوں جہاں جگہ ملی پڑ رہا۔ 8- میاں! کن خیالوں میں کھوئے رہتے ہو؟

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

؎ پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

ـ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(11) چکنا: 1- یہ کام ہو چکا ہے۔ 2- میں خط لکھ چکا ہوں۔
3- وہ کھانا کھا چکا ہے۔ 4- کیا چائے پی چکے؟
5- میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ 6- توصیف جا چکا ہے۔
7- بچہ سو چکا ہے۔ 8- جو کہنا ہے کہہ چکو۔

ـ طے کر چکا جو منزلِ شب، کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح

ـ یہ قصہ تمام ہو چکا اب بس اپنا تو کام ہو چکا اب

ـ سر غیر کے حضور میں خم ہو چکے بہت رسوائے دہر اہلِ حرم ہو چکے بہت

(12) سکنا: 1- کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ 2- تم جا سکتے ہو۔
3- میں یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔ 4- کیا تم یہ کتاب پڑھ سکتے ہو؟
5- وہ اندھا نہیں، دیکھ سکتا ہے۔ 6- کاش تم میری بات سمجھ سکتے!
7- تم یہاں رہ سکتے ہو۔ 8- میں تمھیں کچھ نہیں دے سکتا۔
9- تم اتنا کر سکتے ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا وغیرہ

ـ ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل وہ ہے کہ جہاں تو سما سکے

ـ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

ع تم ہی نہ سن سکو اگر قصۂ غم، سنے گا کون

(13) پانا: 1- ابھی آدھا راستہ طے کر پایا تھا کہ طوفان نے آلیا۔ 2- آج اسے کوئی ملنے نہ پایا۔
3- وہاں کوئی نہیں جانے پاتا۔ 4- کیا مجال کہ آدمی ٹھہرنے پائے۔
5- دیکھنا، کسی کا دل دکھنے نہ پائے۔ 6- وقت نکال پایا تو ضرور آؤں گا۔
7- دیکھنا، دامن تر نہ ہونے پائے۔ 8- میں یہ کام شاید کل تک ختم کر پاؤں گا۔

ـ پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیاں کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ـ غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

ـ چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

(14) نکلنا: 1- جونہی میں نے اسے روتا دیکھا تو میں بھی پھوٹ بہ نکلا۔

2- مسافر گھر سے مُنھ اندھیرے چل نکلا۔

3- پھوڑا پک گیا تو پھوٹ نکلا۔

یہ امدادی فعل شاید زیادہ تر انھیں تین مصدروں کے ساتھ آتا ہے۔ (مولوی عبدالحق، اردو صرف ونحو، ص 73)

(15) کرنا: 1- وہ آیا کرتا تھا۔
2- میں بھی یہی کہا کرتا ہوں۔
3- بچہ دیر تک رویا کیا۔
4- ذرا صبح اٹھ جایا کرو۔
5- دل لگا کر پڑھا کرو۔
6- اچھے لوگوں کی صحبت میں رہا کرو۔
7- میں ایک مُدّت تک اسے سنوارا کیا۔
8- فطرت کے نظاروں کو غور سے دیکھا کرو۔

ے دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار   جب تک شراب آئی کئی دور ہو گئے

ے ابنِ مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

(16) لگنا: 1- وہ کہنے لگا۔
2- پھر وہ کھانے لگا۔

3- جب وہ بیان کرنے لگتا ہے تو اس کے مُنھ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔

4- پہلے تو وہ چپ رہا پھر اچانک بولنے لگا۔

5- زلزلے سے شہر کے در و دیوار لرزنے لگے۔
6- کبھی کبھی اس کا سانس رکنے لگتا ہے۔

ے طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صُبح   ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صُبح

ے گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صُبح   ہر سو ہوئی بلند، صدائے اذانِ صُبح

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے   ہمالہ کے چشمہ ابلنے لگے

(17) چاہنا: 1- بارش آیا چاہتی ہے۔
2- دیکھیے، کیا ہُوا چاہتا ہے۔
3- اس نے بولنا چاہا۔
4- میں جانا چاہتا ہوں۔
5- آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟
6- اس غلطی سے بچنا چاہیے۔
7- میں سونا چاہتا ہوں۔
8- بس وہ آیا چاہتا ہے۔
9- آپ کو اپنا فرض پہچاننا چاہیے۔
10- بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔

ـ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ـ کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

ع نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب

ـ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(18) رکھنا: 1- اس نے مجھے صبح سے بٹھائے رکھا۔ 2- اس نے میرا مال دبا رکھا ہے۔

3- میں نے اسے سمجھا رکھا ہے۔ 4- میں نے اسے پہلے ہی کہہ رکھا ہے۔

5- سن رکھو، میں تمھارے چکمے میں آنے والا نہیں۔

6- میں نے یہ کام اگلے سال کے لیے اٹھا رکھا ہے۔

7- تم نے میرے سینے میں آگ لگا رکھی ہے۔

8- میں نے اپنا سامان باندھ رکھا ہے۔

ـ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ـ گو بظاہر تو دِیا میں نے بجھا رکھا ہے درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

ـ منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے۔

❁❁
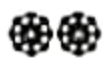
سابقے اور لاحقے

اردو زبان میں سابقوں اور لاحقوں کی اہمیت کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ان کی مدد سے بے شمار نئے الفاظ بنتے رہتے ہیں اور زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہتا ہے۔ اردو میں ہندی، فارسی اور عربی کے بیسیوں سابقے اور لاحقے مستعمل ہیں۔

سابقہ سے مراد وہ علامت ہے جو نیا لفظ یا نئی ترکیب بنانے کے لیے کسی لفظ کے شروع میں لگائی جائے اور لاحقہ سے وہ علامت مراد ہے جو کسی لفظ کے آخر میں لگائی جائے۔ مثلاً: خودغرض، خودشناس، خود پسند، خودمختار وغیرہ الفاظ میں ''خود'' سابقہ ہے۔ اسی طرح خطرناک، دردناک، غم ناک، خوفناک وغیرہ الفاظ میں ''ناک'' لاحقہ ہے۔

طلبہ کی سہولت کے لیے چند مشہور سابقے اور لاحقے درج ذیل ہیں:

سابقے

سابقے	مثالیں
اَن	ان پڑھ، ان مول، انجان، ان گنت، ان تھک، ان دیکھا، ان کہی
اہل	اہلِ بیت، اہلِ نظر، اہلِ کمال، اہلِ قلم، اہلِ وطن، اہلِ علم، اہلِ حدیث
با	باادب، باخدا، باوفا، باوقار، باکمال، باقاعدہ، بااثر، باضابطہ، باوضو
بَد	بدچلن، بدنصیب، بدشکل، بدمزاج، بداخلاق، بداصل، بدبخت
بلا	بلاامتیاز، بلاناغہ، بلاقیمت، بلااجازت، بلاارادہ، بلاتکلف، بلاتامل
بلند	بلندکردار، بلندنظر، بلندہمت، بلنداقبال، بلندفطرت، بلندپرواز، بلندآواز
بن	بن بلایا، بن دیکھا، بن بیاہا، بن جتی (زمین)، بن داموں، بن روئے
بے	بےادب، بےعلم، بےعقل، بےخبر، بےنصیب، بےمثال، بےپروا، بےکار
پُر	پُرجوش، پرکیف، پرہول، پردرد، پروقار، پرآب، پُرآشوب
پس	پس منظر، پس ماندہ، پس پردہ، پس خوردہ، پس انداز، پس خیمہ
تنگ	تنگ نظر، تنگ دل، تنگ دست، تنگ ظرف، تنگ حوصلہ، تنگ حال
خوب	خوب صورت، خوب رُو، خوب سیرت، خوب صورتی، خوب روئی
خود	خودغرض، خودرَو، خودفریب، خودآرا، خودآشنا، خودارادیت
خوش	خوش بو، خوش خلق، خوش باش، خوش گلو، خوش دامن، خوش مزاج، خوش خط
زیر	زیرِ سایہ، زیرِ علاج، زیرِ دست، زیرِ لب، زیرِ زمین، زیرِ بار، زیرِ حراست
زُود	زودپشیمان، زودرنج، زودہضم، زوداثر، زودفہم، زودنویس
غیر	غیرممکن، غیرمعمولی، غیرموزوں، غیرذمہ دار، غیرحاضر
کم	کم نظر، کم ظرف، کم ہمت، کم حوصلہ، کم عقل، کم گو، کم خرچ، کمزور
لا	لازوال، لاحاصل، لاعلاج، لاوارث، لاتعداد، لاجواب، لاولد، لاثانی

نا	نابکار، نامراد، نالائق، ناتواں، نادان، ناجائز، ناپاک، ناتجربہ کار
نو	نوعمر، نوجوان، نوخیز، نونہال، نومسلم، نووارد، نوزائیدہ، نوبہار، نوآموز
نیم	نیم جان، نیم روز، نیم حکیم، نیم ملّا، نیم مردہ، نیم پختہ، نیم برہنہ
ہم	ہم سفر، ہم صفیر، ہم راز، ہم نام، ہم وطن، ہم جماعت، ہم چشم، ہم خیال
یک	یک رنگ، یک زبان، یک دل، یک لخت، یک دم، یک جہتی

لاحقے

آرا	انجمن آرا، جہاں آرا، بزم آرا، صف آرا، عالم آرا
اندیش	خیر اندیش، بداندیش، مصلحت اندیش، دور اندیش، غلط اندیش
انگیز	نفرت انگیز، حیرت انگیز، عبرت انگیز، دردانگیز، فکر انگیز
بان	دربان، شتربان، فیل بان، مہربان، باغبان، ساربان، نگہبان
بخش	فرحت بخش، منفعت بخش، جاں بخش، حیات بخش، خدا بخش، صحت بخش
بردار	علم بردار، ناز بردار، فرماں بردار، مشعل بردار، حاشیہ بردار
پوش	میز پوش، سفید پوش، سرخ پوش، سیاہ پوش، پاپوش، گرد پوش، کمبل پوش
پن	گنوار پن، بچپن، لڑکپن، دیوانہ پن، بھولپن، اکھڑپن، کنوار پن
خواہ	خیر خواہ، تنخواہ، بدخواہ، قرض خواہ، خاطر خواہ، بہی خواہ، دلخواہ
خیز	زرخیز، مردم خیز، نوخیز، سحر خیز، فتنہ خیز، بلاخیز، دھماکہ خیز
دان	قلم دان، قدر دان، پاندان، عطردان، سیاست دان، ریاضی دان، نکتہ دان
دار	وفادار، جہاں دار، داغدار، جاندار، سمجھدار، سرمایہ دار، تاجدار
زار	لالہ زار، سبزہ زار، چمن زار، ریگ زار، گل زار
ستان	کوہستان، گلستان، خارستان، پاکستان، نخلستان، قبرستان، کافرستان
شناس	مردم شناس، جوہر شناس، حق شناس، فرض شناس، اداشناس

طلب	خیر طلب، آرام طلب، انصاف طلب، محنت طلب، جفا طلب
فروش	جوفروش، سرفروش، گل فروش، ضمیر فروش، کتب فروش
کدہ	بت کدہ، آتش کدہ، دولت کدہ، آرام کدہ، نعمت کدہ، صنم کدہ
گار	پروردگار، کردگار، روزگار، خدمت گار، پرہیزگار، مددگار، کامگار
گاہ	آرام گاہ، پناہ گاہ، بارگاہ، شکارگاہ، قیام گاہ، چراگاہ، عیدگاہ
مند	حاجت مند، دردمند، دولت مند، فتح مند، خردمند، تنومند، ہنرمند
ناک	خطرناک، دردناک، غمناک، دہشت ناک، افسوس ناک، ہیبت ناک، عبرت ناک
ور	سخن ور، دیدہ ور، دانش ور، تاجور، پیشہ ور، طاقت ور، جانور
یاب	فتح یاب، سزایاب، ظفریاب، کمیاب، فیض یاب، کامیاب، زریاب

روزمرّہ اور محاورہ

روزمرّہ: اُس بول چال کا نام ہے جو خاص اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن روزمرّہ میں الفاظ کے استعمال کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اور وہ الفاظ اپنے لغوی معنی دیتے ہیں۔ اس میں قیاس کو دخل نہیں بلکہ سماعت پر دارومدار ہے۔ مثال کے طور پر انیس بیس کے فرق کو ہم بیس اکیس کا فرق اور دو چار ہاتھ کو دو پانچ ہاتھ نہیں کہہ سکتے۔

محاورہ: دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے، جس سے حقیقی کی بجائے مجازی معنی مراد لیے جائیں تو اسے محاورہ کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سبز باغ دکھانا، آنکھ لگنا، یاد اللہ ہونا وغیرہ۔

محاورہ زبان کا زیور ہے۔ اس کے مناسب اور برمحل استعمال سے تحریر و تقریر میں ایک خاص قسم کی دل کشی اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ محاورے کے الفاظ میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اسے قواعدِ زبان کے اصولوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ محاورے کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لیے اہلِ زبان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ہم ذیل میں اپنے طالب علموں کی سہولت کے لیے حروفِ تہجی کی ترتیب سے کچھ محاورات، ان کے معانی اور ان کا جملوں میں استعمال لکھے دیتے ہیں۔ طالب علموں پر لازم ہے کہ انھیں ازبر کرلیں۔

محاورات	معانی	جملے
آبروخاک میں ملانا	ذلیل کرنا	اُس نے اتنے برے کام کیے کہ اپنے بزرگوں کی آبروخاک میں ملادی۔
آپے سے باہر ہونا	حد درجے کا غصہ	احمد گالی سن کر آپے سے باہر ہوگیا۔
آڑے آنا	مشکل میں کام آنا	سچا دوست وہی ہے جو مصیبت میں دوستوں کے آڑے آئے۔
آب ودانہ اٹھنا	رزق ختم ہونا	سچ ہے جب انسان کا آب ودانہ اٹھ جاتا ہے تو کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔
آگ بگولا ہونا	بہت غصے میں ہونا	وہ میری بات سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا۔
آنکھیں چرانا	نظریں بچانا	آنکھیں کیوں چراتے ہو، سچے ہو تو سامنے آکر بات کرو۔
آفت کا پرکالہ ہونا	نہایت شرارتی	یہ بڑھیا تو آفت کا پرکالہ ہے۔ اِدھر کی اُدھر لگا دیتی ہے اور لوگوں میں لڑائی کرادیتی ہے۔
آسمان سے باتیں کرنا	بلندوبالا ہونا	کوہِ ہمالیہ کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔
اپنا سامُنھ لے کر رہ جانا	شرمندہ ہونا	جب احمد سے میری دلیل کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ اپنا سا مُنھ لے کر رہ گیا۔
اپنے مُنھ میاں مٹھو بننا	اپنی تعریف خود کرنا	اپنے میاں مُنھ مٹھو بننا کوئی خوبی نہیں، مزہ تو تب ہے کہ دوسرے لوگ تعریف کریں۔
اپنے گریبان میں مُنھ ڈالنا	اپنا جائزہ لینا	دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے آدمی کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں بھی مُنھ ڈال کر دیکھ لے۔
اللّے تللّے کرنا	بے دریغ خرچ کرنا	میاں! اگر تمھارے یہی اللّے تللّے رہے تو ایک دن بھیک مانگتے نظر آؤ گے۔
اینٹ سے اینٹ بجانا	تباہ و برباد کردینا	نادر شاہ نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔
باغ باغ ہونا	بہت خوش ہونا	بیٹے کی کامیابی کی خبر سن کر باپ کا دل باغ باغ ہوگیا۔
بے نقط سنانا	برا بھلا کہنا	بڑھیا نے لڑکوں کو وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ ہی بھلی۔
بیڑا اٹھانا	کسی مہم کو انجام دینے کا ذمہ لینا	قائداعظم ؒ نے برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی سے ہم کنار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے مقصد میں کام یاب ہوئے۔
بے چراغ ہونا	اجاڑ، سنسان ہونا	یہ بستی برسوں پہلے دریا برد ہوگئی تھی۔ اس وقت سے آج تک بے چراغ چلی آرہی ہے۔
پاپڑ بیلنا	محنت مشقت کرنا	فی زمانہ انسان کو اپنے بچوں کی خاطر بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

پالا پڑنا	واسطہ پڑنا	خدا کرے تمھارا پالا کسی احمق سے نہ پڑے۔
پانی پھیر دینا	برباد کر دینا	آپ نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔
پانی میں آگ لگانا	متحمل مزاج کو بھڑکانا	آج میں نے صدیقی صاحب کو غصے میں دیکھا، یوں لگتا تھا کسی نے پانی میں آگ لگا دی ہو۔
تین پانچ کرنا	جھگڑا کرنا، بحث کرنا	میرے ساتھ تین پانچ کرنے کی ضرورت نہیں، سیدھی طرح سے میری رقم واپس کرو۔
تین حرف بھیجنا	لعنت بھیجنا	میں چغل خوروں پر تین حرف بھیجتا ہوں۔
تین تیرہ ہونا	منتشر ہونا	حملے کی تاب نہ لا کر کفار کا لشکر آن واحد میں تین تیرہ ہو گیا۔
تگنی کا ناچ نچانا	بہت پریشان ہونا	دوسری بیوی نے تو اسے آتے ہی ایسا تگنی کا ناچ نچایا کہ وہ دنیا ہی سے بیزار ہو گیا۔
ٹسوے بہانا	جھوٹ موٹ رونا	اس بچے کو چوٹ نہیں لگی، یہ ٹسوے بہا رہا ہے۔
ٹیڑھی کھیر ہونا	کام کا مشکل ہونا	اس مسئلے کا حل میرے بس میں نہیں، یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔
ٹس سے مس نہ ہونا	ذرا بھی اثر نہ ہونا	بعض لوگ ایسے بے حس ہوتے ہیں، لاکھ سمجھاؤ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔
جامے میں پھولا نہ سمانا	بہت خوش ہونا	اکرم اپنی کامیابی پر جامے میں پھولا نہ سماتا تھا اور خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔
جی چرانا	بچنے کی کوشش کرنا	بعض لوگ محنت مشقت سے جی چراتے ہیں۔
جلتی پر تیل ڈالنا	جھگڑے کو اور بڑھانا	بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بیچ بچاؤ کرانے کی بجائے جلتی پر تیل ڈالتے ہیں۔
جان پر کھیلنا	انتہائی مشکل کام کرنا	کمانڈوز نے جان پر کھیل کی دہشت گردوں کو آن واحد میں ٹھکانے لگا دیا۔
جلی کٹی سنانا	برا بھلا کہنا	ساس بہو کی نہ بنتی تھی اور وہ اکثر ایک دوسرے کو جلی کٹی سناتی رہتی تھیں۔
چراغ پا ہونا	غصے کی کیفیت	جب سے حامد نے سنا ہے کہ محمود اس کا مخالف ہے، تو وہ چراغ پا ہے۔
چراغ سحر ہونا	مرنے کے قریب ہونا	میاں! ہمارا کیا ہے، ہم تو چراغِ سَحر ہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن ہوگا۔
چھکے چھڑانا	حواس گم کرنا	مجاہدین نے پے در پے حملے کر کے دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔
چار چاند لگانا	قدر و قیمت بڑھانا	علامہ اقبالؒ کے کلام نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے۔
چھاتی پر سانپ لوٹنا	حسد ہونا	پاکستان کی ترقی اور خوش حالی سے دشمنوں کی چھاتی پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔

محاورہ	معنی	جملہ
چھٹی کا دودھ یاد آنا	مصیبت میں آرام کے دنوں کا یاد آنا	پولیس نے چور کی ایسی پٹائی کی کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔
حرف آنا	بدنامی ہونا	کوئی ایسا کام نہ کرو کہ بزرگوں کی عزت پر حرف آئے یا ان کے نام کو دھبا لگے۔
حواس باختہ ہونا	گھبرا جانا	خطرے کے وقت حواس باختہ نہیں ہو جانا چاہیے۔
خاطر میں نہ لانا	پروا نہ کرنا	خلیل اتنا خود پسند ہے کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔
خاک چھاننا	بہت جستجو کرنا	خاک چھاننے کا شوق خوف و خطر پر غالب رہنا چاہیے۔
خون سفید ہونا	بے مروّت ہونا	کیا زمانہ آ گیا ہے، عزیزوں اور رشتہ داروں کا بھی خون سفید ہو گیا ہے، کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں۔
خبر گرم ہونا	چرچا ہونا	ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا (غالب)
داغ بیل ڈالنا یا طرح ڈالنا	بنیاد رکھنا	علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اردو شاعری میں ایک نئے اندازِ فکر کی داغ بیل ڈالی یا طرح ڈالی۔
ڈول ڈالنا	بنیاد رکھنا	لوگوں نے لڑائی بھڑائی کی باتیں کیں مگر میں نے صلح صفائی کا ڈول ڈالا۔
دام میں آنا	جال میں پھنسنا	اس آدمی کے دام میں نہ آنا، یہ بڑا مکار ہے۔
دانت کھٹے کرنا	عاجز کرنا	مٹھی بھر مجاہدین نے کفار کے لشکرِ جرار کے دانت کھٹے کر دیے اور کفار کو میدانِ جنگ سے بھاگتے ہی بنی۔
دست بردار ہونا	چھوٹ دینا	بڑا بھائی چھوٹے بھائی کے حق میں جائیداد سے دست بردار ہو گیا۔
دل بھر آنا	غم گین ہونا	اس کی دکھ بھری داستان سن کر سب کا دل بھر آیا۔
دوڑ دھوپ کرنا	بہت کوشش کرنا	آپ اپنی دوڑ دھوپ جاری رکھیں گے تو اپنی منزل پانے میں ضرور کام یاب ہو جائیں گے۔
دامن تر ہونا	گناہ گار ہونا	مولانا! ہمیں ایسا بھی تر دامن نہ سمجھ لینا، توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔
دھان پان ہونا	دبلا پتلا ہونا	قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ دیکھنے میں دھان پان تھے مگر عزم و حوصلہ کے پہاڑ تھے۔
ڈکار تک نہ لینا	ہضم کر جانا	وہ لاکھوں کا مال ہضم کر گئے اور ڈکار تک نہ لی۔

محاورہ	معنی	جملہ
ڈیرے ڈالنا	قیام کرنا	اُس آدمی کے گھر میں ایک عرصہ ہوا مفلسی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔
ڈنکا بجنا	شہرت ہونا	شہر بھر میں صدیقی صاحب کی شرافت اور نیکی کا ڈنکا بجتا ہے۔
رات دن ایک کرنا	سخت محنت کرنا	اُس نے رات دن ایک کیا۔ لیاقت بہم پہنچائی، تب اس رتبے کو پہنچا ہے۔
رائی کا پہاڑ بنانا	بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا	رائی کا پہاڑ بنانا تو کوئی تم سے کوئی سیکھے۔ کیا بات تھی اور تم نے کیا بنا دیا۔
رفو چکر ہونا	کھسک جانا	پولیس کو دیکھتے ہی دونوں ٹھگ رفو چکر ہو گئے۔
رنگ فق ہونا	چہرے کا رنگ اڑ جانا	جب کبھی بجلی چمکتی ہے تو ڈرپوک نجمہ کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔
ریل پیل ہونا	کثرت ہونا	اکثر کاروباری لوگوں کے گھروں میں روپے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے۔
زخم پر نمک چھڑکنا	دکھی کو ستانا	میں تو پہلے ہی افسردہ بیٹھا ہوں، طعنہ زنی کر کے تم میرے زخموں پر نمک کیوں چھڑکتے ہو؟
زمین آسمان کے قلابے ملانا	مبالغہ کرنا	وہ اپنے کارنامے اس طرح سناتا ہے کہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔
زیروزبر کرنا	الٹ پلٹ کرنا	پچھلے دنوں مہمان بچوں نے میرا سارا کتب خانہ زیروزبر کر کے رکھ دیا۔
زمین میں گڑ جانا	سخت شرمندہ ہونا	جب باپ نے اپنے بیٹے کو جھوٹ بولتے سنا تو وہ مارے غیرت کے زمین میں گڑ گیا۔
زندہ درگور ہونا	دکھ بھری زندگی گزارنا	آج کل غریب غربا مفلسی کے ہاتھوں زندہ درگور ہیں۔
سر قلم کرنا	سر کاٹ دینا	جلاد نے قاتل کا سر قلم کر دیا۔
سبز باغ دکھانا	لالچ دینا، دھوکا دینا	آصف نے مجھے بہت سبز باغ دکھائے مگر میں اُس کے جھانسے میں نہ آیا۔
سبز قدم ہونا	منحوس ہونا	ساس نے کہا: ''یہ ہماری بہو سبز قدم ہے، جب سے آئی ہے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے۔''
سانپ سونگھ جانا	خاموشی چھا جانا	جب صدرِ جلسہ نے چندے کی اپیل کی تو پورے جلسے کو گویا سانپ سونگھ گیا۔
سینگ سمانا	جگہ ملنا	میری شب بسری کا کیا ہے، جہاں سینگ سمائیں گے، پڑ رہوں گا۔
شش و پنج میں پڑنا	سوچ بچار کی کیفیت	میں اس شش و پنج میں ہوں کہ یہ سفر اختیار کروں یا نہ کروں۔

شیر و شکر ہونا	میل ملاپ ہونا	آج کل وسیم اور اکرم آپس میں خوب شیر و شکر ہیں۔
شیطان کی آنت ہونا	طویل ہونا	یہ مسافت تو میرے لیے شیطان کی آنت ہو گئی ہے، صبح سے طے کر رہا ہوں مگر منزل کا کوئی نشان نہیں ۔
شگوفہ چھوڑنا	نئی بات کرنا	آپ جب بھی آتے ہیں، کوئی نہ کوئی شگوفہ ضرور چھوڑتے ہیں۔
شیخی بگھارنا	ڈینگ مارنا	مجھے تو شیخی بگھارنے والے لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔
صبر کا پیانہ لبریز ہونا	صبر نہ ہو سکنا	ساس کے آئے دن کے طعنوں سے تنگ آ کر آخر کار بہو کے صبر کا پیانہ لبریز ہو ہی گیا۔
طرح دینا	چشم پوشی کرنا	آپ اُسے طرح دیے جاتے ہیں اور وہ مُنہ چڑھتا جا رہا ہے۔
طوطا چشم ہونا	آنکھیں پھیر لینا	بعض لوگ ایسے طوطا چشم ہوتے ہیں کہ مطلب نکل جانے پر پہچاننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔
عبرت پکڑنا	سبق حاصل کرنا	دشمن کو جنگ میں عبرت ناک شکست سے عبرت پکڑنی چاہیے تھی۔
عقل پر پتھر پڑنا	بے سمجھی کی بات کرنا	خدا جانے تمھاری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں کہ سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔
عقل کے ناخن لینا	ہوش کی بات کرنا	میاں! عقل کے ناخن لو، اپنے باپ سے لڑنے چلے ہو۔
عش عش کرنا	حیران ہونا	دل پذیر تقریر سن کر سامعین عش عش کر اٹھے۔ (اَش اَش کرنا فصیح ہے۔)
عید کا چاند ہونا	کبھی کبھی نظر آنا	اخاہ! احمد صاحب، آپ تو عید کا چاند ہو گئے، عرصہ کے بعد آج دکھائی پڑے ہو۔
غصہ پینا	غصّے کو دبا لینا	مجھے اس کے کرتوت دیکھ کر غصہ تو آیا مگر میں اپنا غصہ پی گیا۔
غتر بود کرنا	گڈ مڈ کرنا	تم نے تمام اشیا کو اس طرح غتر بود کر دیا ہے کہ پہچان دشوار ہو گئی ہے۔
فاختہ اڑانا	عیش کرنا، مزے کرنا	وہ وقت گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے، اب تو محنت مشقت سے کمانے کا زمانہ ہے۔
فرّاٹے بھرنا	تیزی سے گزر جانا	گاڑی فرّاٹے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئی۔
قافیہ تنگ کرنا	عاجز کر دینا	بچّوں نے پے در پے سوال کر کے استاد کا قافیہ تنگ کر دیا۔
قلعی کھل جانا	اصلیت ظاہر ہونا	بڑا شاعر بنا پھرتا تھا، آج مشاعرے میں قلعی کھل گئی۔
قیامت ڈھانا	غضب کرنا	اس فلکِ ناہنجار نے ہم پر کیا کیا قیامتیں ڈھائی ہیں۔

قدم رنجہ فرمانا	تشریف لانا	آپ جب بھی لاہور آئیں، ہمارے یہاں ضرور قدم رنجہ فرمائیں، بڑی خوشی ہوگی۔
کافور ہونا	غائب ہو جانا	یہ تیل گرم کر کے مل لیجیے، درد ابھی کافور ہو جائے گا۔
کاغذی گھوڑے دوڑانا	بہت خط کتابت کرنا	ہمارے دادا ابو سرکاری امور حل کرانے کے سلسلے میں کاغذی گھوڑے دوڑانے کے بہت شوقین تھے۔
کان کھڑے ہونا	چوکنا ہونا	بچے کے مُنھ سے مرزا غالب کے شعر سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔
گل کھلانا	عجیب کام کرنا	باپ تو بہت شریف تھا مگر بیٹا آئے دن کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلاتا رہتا ہے۔
گھوڑے بیچ کر سونا	بے فکری سے سونا	جوانی میں ہم بھی گھوڑے بیچ کر سویا کرتے تھے مگر اب بڑھاپے میں صرف ایک آدھ گھڑی کو آنکھ لگتی ہے۔
گھی کے چراغ جلانا	خوشیاں منانا	ملک میں امن ہوا تو لوگوں نے گھی کے چراغ جلائے۔
لٹو ہونا	فریفتہ ہونا	یہ حسن چند روزہ ہے، آپ کیوں اس پر لٹو ہو رہے ہیں؟
ماتھا ٹھنکنا	پہلے سے برے آثار ظاہر ہونا	اُسے یہاں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ کوئی نیا گل ضرور کھلنے والا ہے۔
مسیں بھیگنا	نو جوانی کا آغاز ہونا	ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، مسیں بھیگ رہی تھیں کہ موت کا پیغام آ گیا۔
مُنھ دیکھتے رہ جانا	حیران رہ جانا	بھیڑیا چرواہے کے سامنے میمنا اٹھا کر لے گیا اور چرواہا مُنھ دیکھتا رہ گیا۔
مُنھ کی کھانا	شکست کھانا	میدانِ جنگ میں دشمن نے مُنھ کی کھائی اور اسے میدان سے بھاگتے ہی بنی۔
مٹھی گرم کرنا	رشوت دینا	ہمارے یہاں پولیس کا بہت برا حال ہے، کوئی کام مٹھی گرم کیے بغیر نہیں ہوتا۔
موم کی ناک ہونا	غیر مستقل مزاج ہونا	یہ افسر موم کی ناک ہے، جو ماتحت بھی جاتا ہے، اپنی بات منوا لیتا ہے۔
مُنھ میں پانی بھر آنا	جی للچانا	حلوائی کی دکان پر تازہ تازہ مٹھائی دیکھ کر اسلم کے مُنھ میں پانی بھر آیا۔
نو دو گیارہ ہونا	رفو چکر ہونا	ڈاکو قافلے کو لوٹ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔
وبالِ جان ہونا	مصیبت کا باعث ہونا	بری صحبت میں پڑنے کے باعث دونوں لڑکے والدین کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔
وقت کاٹنا	وقت گزارنا	امیری ہو کہ غریبی، بہر حال وقت کاٹنا پڑتا ہے۔
وارے نیارے ہونا	خوب فائدہ اٹھانا	ان دنوں تجارت پیشہ لوگوں کے خوب وارے نیارے ہیں۔

ہاتھ بٹانا	مدد کرنا	گھر آ کر امی کا ہاتھ بٹایا کرو۔
ہوا دینا	اکسانا	وہ پہلے ہی بھرا بیٹھا ہے تم معاملے کو مزید ہوا دے رہے ہو۔
ہاتھوں کے طوطے اڑنا	حواس باختہ ہونا	ماں نے بچے کے [illegible] کی خبر سنی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
ہوا سے باتیں کرنا	بہت تیز ہونا	کوچوان نے چابک دکھایا تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔
ہاتھ پاؤں مارنا	کوشش کرنا	بیچارے اسلم نے ملازمت کے حصول کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔
یک جان، دو قالب ہونا	گہرے دوست ہونا	حامد اور محمود آپس میں یک جان، دو قالب ہیں۔
یاد اللہ ہونا	جان پہچان ہونا	میرا اس سے آج کا تعلق نہیں، بہت پرانی یاد اللہ ہے۔
ید طولیٰ رکھنا	مکمل مہارت ہونا	حکیم محمد سعید جملہ طبی امور میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔
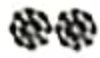
ضرب الامثال

ضرب کے معنی ہیں بیان کرنا اور مَثَل کے معنی ہیں مثال۔ ضرب المثل کے معنی ہوئے مثال دے کر بیان کرنا۔ ضرب المثل کو اردو میں مقولہ یا کہاوت بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسا جملہ ہے جو مثال کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس جملے میں جو بات کہی جائے اسے عالم گیر سچائی (Universal Truth) کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ضرب الامثال یا کہاوتیں صدیوں کے تجربات اور انسانی زندگی کے لاتعداد مشاہدات کے جواہر پارے ہوتے ہیں اور انھیں علم و حکمت کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔

بیشتر ضرب الامثال کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ کب سے ہیں اور کیوں کر بنی ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ضرب الامثال کلام میں زور اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں کی سہولت اور استفادے کے لیے ذیل میں اردو ضرب الامثال کا مختصر سا انتخاب اور ان کا مفہوم اور محلِ استعمال پیش کرتے ہیں:

ضرب الامثال	مفہوم اور محلِ استعمال
آپ کاج مہا کاج	جو کام خود کیا جائے، وہ سب سے بہتر ہوتا ہے۔
آ بیل، مجھے مار	خوامخواہ کی لڑائی مول لینا۔
آپ آئے، بھاگ آئے	آپ کے آنے سے ہمارے نصیب جاگ اٹھے۔

آخ تھو کھتے ہیں	کسی چیز کے حصول میں ناکامی ہو تو کھسیانا پن مٹانے اور شرمندگی دور کرنے کے لیے کہتے ہیں۔
آدمی کا شیطان آدمی ہے	آدمی کو آدمی ہی بہکاتا ہے۔
آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا	ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنس جانا۔
آج کا کام کل پر نہ چھوڑو	آدمی جو کام آج کر سکتا ہو، اسے کل پر اٹھا نہ رکھو۔
اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا	اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔
ایک ایک دو گیارہ	دو آدمی مل کر اکیلے کی نسبت کہیں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔
ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے	ایک برا آدمی سارے خاندان کو بدنام کرتا ہے۔
الٹے بانس بریلی کو	الٹا کام کرنا۔
اندھوں میں کانا راجا	ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ جہاں بہت سارے بے وقوف ہوں اور ان میں ایک آدمی ذرا سی عقل رکھتا ہو۔
اندھا کیا جانے بسنت کی بہار	ناقدر شناس آدمی اچھی چیز کی قدر نہیں کر سکتا۔
اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی	اُس آدمی کی نسبت بولتے ہیں جس کی ہر بات انوکھی ہو۔
اونچی دکان، پھیکا پکوان	شہرت تو بہت زیادہ ہو مگر اصلیت کچھ بھی نہ ہو۔
ایک انار سو بیمار	اس وقت بولتے ہیں جب ایک چیز کے بہت سے خواہش مند ہوں۔
ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا	کسی برے آدمی کے لیے مزید برائی کا سبب پیدا ہونا۔
بوڑھی گھوڑی لال لگام	اس بوڑھی عورت کی نسبت بولتے ہیں، جو بڑھاپے میں بھی جوانی کے سے ناز نخرے کرے۔
بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا	کسی کی بھلائی جب اصل میں برائی کی نسبت سے ہو تو اسے ٹالنے کے لیے بولتے ہیں۔
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی	بد اپنی بدی کی سزا کسی نہ کسی دن ضرور پاتا ہے۔
بات کھٹائی میں پڑ گئی	کسی بات کا التوا میں پڑ جانا۔
بارہ برس دلی میں رہے بھاڑ جھونکا	مراد ہے کہ لائق لوگوں کی صحبت میں رہ کر بھی کچھ حاصل نہ کیا۔
باسی کڑھی میں ابال آیا	بے وقت جوش آنے کے وقت یہ بات کہتے ہیں۔
بد اچھا، بدنام بُرا	یعنی بدنام سے بدکار بہتر ہے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا	کسی قیمتی چیز کا بغیر کوشش کے اتفاقیہ ہاتھ آ جانا۔
پاک رہو، بے باک رہو	ایمان دار اور دیانت دار کو کچھ ڈر نہیں ہوتا۔
پنچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی	بڑے آدمیوں کی بات کو مان لینا چاہیے۔
تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی	لڑائی جھگڑا یا محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔
تخمِ تاثیر، صحبت کا اثر	پاس اٹھنے بیٹھنے کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔
تو بھی رانی، میں بھی رانی، پھر کون بھرے گا پانی	سب برابری کا دعویٰ کریں تو پھر کام کیسے ہو۔
تو ڈال ڈال، میں پات پات	میں تجھ سے بھی ہوشیار ہوں۔
جتنی چادر دیکھو، اتنے پاؤں پھیلاؤ	آمدنی کے مطابق خرچ کرو۔
جس کی لاٹھی، اس کی بھینس	زور آور اور طاقت ور جیت جاتا ہے۔
جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں	زیادہ باتیں کرنے والے کام کم کرتے ہیں۔
جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے	کام کے مطابق نتیجہ نکلتا ہے۔
جیسا دیس، ویسا بھیس	جہاں رہیں، وہاں کے طور طریقے اختیار کریں۔
چراغ تلے اندھیرا	اس وقت بولتے ہیں جب کسی آدمی سے دور دور کے لوگ تو فیض حاصل کریں مگر اپنے محروم رہیں۔
چور کی داڑھی میں تنکا	اپنا عیب خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔
چھوٹا مُنھ بڑی بات	معمولی آدمی کا حیثیت سے بڑھ کر بات کرنا۔
حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات	حاکم کا حکم اور موت دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کو ٹالا نہیں جا سکتا۔
حساب جو جو، بخشش سو سو	کوڑی کوڑی کا حساب ہونا چاہیے۔
خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں	خدا کا عذاب اچانک آتا ہے۔
خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے	صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے (خصوصاً بری صحبت کا)
خدمت سے عظمت ہے	کارگزاری ہی سے درجہ ملتا ہے۔
دل کو دل سے راہ ہوتی ہے	محبت دونوں طرف سے ہوتی ہے۔

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی	پورا پورا انصاف، کھرا اور کھوٹا الگ الگ۔
دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ کا	آوارہ آدمی جو کسی کام کا نہ ہو۔
ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے	جو شخص مصیبت میں مبتلا ہو وہ تھوڑی سی مدد کو بھی غنیمت شمار کرتا ہے۔
رات گئی، بات گئی	موقع نکل جانے کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔
رسی جل گئی پر بل نہ گیا	تکلیف اٹھائی لیکن بری عادت نہ چھوڑی۔
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو	جس بات کا لوگوں میں عام چرچا ہو جائے، وہ عموماً سچی ہوتی ہے۔
سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے	جسے بہت تکلیف پہنچی ہو وہ معمولی چیز سے بھی ڈرتا ہے۔
سانچ کو آنچ نہیں	آخر کار سچ غالب رہتا ہے۔
سیکھ وا کو دیجیے جا کو سیکھ سہائے سیکھ نہ دیجیے باندرا جو گھر بیے کا جائے	نصیحت اس کو کرنی چاہیے جس کو نصیحت اچھی معلوم ہو نہ کہ بندر کو [illegible] نے بیے کا گھر تباہ و برباد کر دیا تھا۔
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں	دھوکا یا فریب ہمیشہ نہیں دیا جا سکتا۔
شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں	کسی کے عدل و انصاف کی تعریف میں کہتے ہیں۔
شیخی اور تین کانے	پاس کچھ نہ ہونا مگر شیخی مارنا۔
صورت نہ شکل، بھاڑ سے نکل	بدصورت آدمی کی نسبت طنزاً کہتے ہیں۔
ضرورت ایجاد کی ماں ہے	ضرورت آدمی سے سب کچھ کرا لیتی ہے۔
طویلے کی بلا، بندر کے سر	بہت سے لوگوں کی آفت کسی اکیلے پر پڑنا۔
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں	ظلم ہمیشہ نہیں ڈھایا جا سکتا اور خدا مظلوم کی ضرور سنتا ہے۔
عید پیچھے ٹرو	ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کام کا موقع ہاتھ سے نکل گیا ہو۔
عقل بڑی کہ بھینس	دماغی قوت جسمانی قوت سے بہتر ہے۔
عقل کا اندھا، گانٹھ کا پورا	بے وقوف مال دار آدمی کی نسبت بولتے ہیں۔
غریب کی جورو، سب کی بھابی	غریب آدمی پر سب کا بس چلتا ہے۔
فقیر کی صورت ہی سوال ہے	حاجت مند کے چہرے ہی سے اس کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔
قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے	عقل مند لوگوں کے چھوٹے بھی عقل مند ہوتے ہیں۔

کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی	جھوٹ فریب ہمیشہ نہیں چل سکتا۔
گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو	جو کام آسانی سے ہو سکے، اسے مشکل سے نہیں کرنا چاہیے۔
لا دو دے لدا دے، لدانے والا ساتھ دے	چیز بھی دے، اس کو لدوا بھی دے اور ایک آدمی بھی دے جو جا کر اتروا بھی دے۔ یعنی ہر طرح کا بوجھ دوسرے پر ڈالنے والا۔
مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ہے	مفت چیز ملے تو پھر جائز و ناجائز کی کوئی پروا نہیں کرتا۔
ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ	بے جوڑ اور بے محل بات پر کہتے ہیں۔
ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا	اپنی نالائقی اور کوتاہی کا الزام دوسرے کو دینا۔
نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی	ساری عمر گناہ کرتے رہنا اور اخیر عمر میں پارسا بن بیٹھنا۔
نو نقد نہ تیرہ ادھار	قرض کے تیرہ سے نقد کے نو اچھے ہیں۔
نہ رہے بانس نہ بجے بانسری	جب جھگڑے والی چیز ہی نہ رہے تو پھر جھگڑا کیسا؟
ولی را ولی می شناسد	جیسا آدمی ہو اُسے ویسا ہی آدمی پہچانتا ہے۔
ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور	ظاہر کچھ باطن کچھ
ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں	کنبے کا بڑا آدمی جس طرف ہوگا چھوٹے بھی اسی طرف کو ہوں گے۔
ہاتھی نکل گیا ہے دُم باقی ہے	سارا کام ہو گیا ہے تھوڑی سی کسر باقی ہے۔
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات	لائق بننے والے آدمی کے پہلے سے اچھے آثار نظر آ جاتے ہیں۔
ہنوز دِلی دور است	اس کام کے پورا ہونے میں ابھی دیر ہے۔
نیکی کر دریا میں ڈال	نیکی کر کے بھلا دینی چاہیے۔
ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور	مراد ہے ظاہر کچھ باطن کچھ۔
یہ منہ اور مسور کی دال	یہ شخص اس عزت اور کام کے لائق نہیں ہے۔
یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے	یہاں کے طور طریقے قطعی مختلف ہیں۔
یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہیں آتی	اس کام کا سرانجام پانا مشکل ہے۔
یار زندہ صحبت باقی	زندگی ہے تو پھر ملاقات ہوگی۔

غلط جملوں کی دُرستی

تحریر و تقریر میں زبان اور بیان کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ گفت گو کے دوران میں درست اور خوبصورت الفاظ کا استعمال بولنے والے کی شخصیت کو باوقار بنا دیتا ہے۔ جب کہ غلط سلط الفاظ کا استعمال اور کم زور لہجہ شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زبان دانی میں اس موضوع پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں طلبہ کی سہولت کے لیے زبان دانی کے چند بنیادی اور اہم اصول بیان کیے دیتے ہیں۔ تحریر و تقریر میں انھیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھیے:

زبان دانی کے چند اہم اصول

1۔ جمع اسموں میں پہلے "ہر" کا لفظ لکھنا یا بولنا غلط ہے۔ مثلاً: ہر ممالک یا ہر اشخاص کہنا غلط ہے۔ اس کے بجائے ہر ملک اور ہر شخص کہنا درست ہے۔

2۔ ایک جملے میں دو ہم معنی الفاظ کا لانا غلط ہے۔ مثلاً: آبِ زم زم کا پانی کی جگہ صرف آبِ زم زم کہنا چاہیے۔ اسی طرح کوہِ ہمالیہ کا پہاڑ کہنا غلط ہے، اس کی جگہ صرف کوہِ ہمالیہ اور ماہِ رمضان کے مہینے کے روزے کی جگہ ماہِ رمضان کے روزے کہنا چاہیے۔

3۔ مصدر کے ساتھ "نے" کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ مثلاً: تم نے کہاں جانا ہے؟" کی جگہ "تمھیں کہاں جانا ہے؟" صحیح ہوگا۔

4۔ اردو میں کسی اسم کے آخر میں آنے والے حروف "الف" "یا" "ہ" کو یائے مجہول (ے) سے بدلنے کا نام اِمالہ ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ لفظ جیسا بولنے میں آئے گا ویسا ہی لکھنے میں آئے گا۔ مثلاً: "جلسہ میں بہت لوگ آئے تھے" کی جگہ "جلسے میں بہت لوگ آئے تھے" لکھا اور بولا جائے گا۔

5۔ مونث فعل کی گردان میں نون غنہ (ں) کا اضافہ صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً: لڑکیاں پڑھ رہیں ہیں" غلط ہے۔ "لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔" صحیح ہے۔ اسی طرح "عورتیں سوئیٹر بن رہیں ہیں۔" غلط ہے۔ "عورتیں سوئیٹر بن رہی ہیں۔" صحیح ہے۔

6۔ فارسی میں علامتِ اضافت (زیر) اور واوٴ عطف (و) صرف فارسی اور عربی الفاظ میں لائی جاتی ہیں۔ کسی اردو یا ہندی لفظ کے ساتھ ان کا استعمال جائز نہیں۔ مثلاً: "دامنِ کوہ" صحیح ہے۔ "دامنِ پہاڑ" کہنا غلط ہوگا۔ اسی طرح روٹی اور پانی کہنا صحیح ہوگا مگر روٹی و پانی کہنا غلط ہوگا۔

7۔ عربی میں جمع تین کے عدد سے شروع ہوتی ہے۔ دو کے لیے تثنیہ کا صیغہ آتا ہے، چنانچہ عربی میں دو کے لیے جمع کا صیغہ استعمال نہیں کرتے۔ مثلاً: دو اشعار، دو کتب کہنا غلط ہے جب کہ دو شعر، دو کتابیں کہنا صحیح ہوگا۔

8۔ جب کسی جملے میں کئی اسم آئیں تو فعل کی وحدت وجمع آخری اسم کے مطابق آئے گی۔ مثلاً: ہم نے تین کرسیاں اور ایک میز خریدی۔

9۔ جب کسی جملے میں کئی اسم آئیں تو فعل کی تذکیر وتانیث آخری اسم کے مطابق آئے گی۔ مثلاً: ہم نے چڑیا گھر میں کئی قسم کے طوطے اور چڑیاں دیکھیں۔

10۔ متشابہ (ہم آواز) لفظوں کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثلاً: انھوں نے حساب بیباک کر دیا' اس جملے میں '' بیباک '' کی جگہ '' بیباق '' ہونا چاہیے۔

11۔ غیر جانبدار اسموں کی تذکیر وتانیث کے معاملے میں اہل زبان کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ مثلاً: ''میز خریدی'' کو ''میز خریدا'' نہیں کہیں گے۔

12۔ اہل زبان کے روزمرہ کی پیروی بھی لازم ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ''ہر روز'' کو ''ہر دن'' اور ''آئے دن'' کو ''آئے روز'' کہنا غلط ہوگا۔

13۔ محاورے اور ضرب المثل کے الفاظ میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً: لال پیلا ہونا کی جگہ نیلا پیلا ہونا اور ایک انار سو بیمار کی جگہ ایک انار ہزار بیمار کہنا غلط ہوگا۔

14۔ ''مبادا'' کے معنی ہیں: ''ایسا نہ ہو'' چنانچہ تحریر وتقریر میں ''مبادا'' کے ساتھ ''نہ'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً: یہ کہنا غلط ہوگا: ''محنت کرو، مبادا فیل نہ ہو جاؤ۔'' صحیح جملہ یوں ہوگا: ''محنت کرو، مبادا فیل ہو جاؤ۔''

15۔ جب کسی جملے میں ''چونکہ'' استعمال ہوگا تو اس کے بعد ''اس لیے'' ضرور آئے گا۔ اسی طرح ''جوں جوں'' کے بعد ''توں توں'' اور ''جیسے جیسے'' کے بعد ''ویسے ویسے'' لازماً آتا ہے۔ مثلاً: چونکہ وہ بیمار ہے اس لیے آج کالج نہیں آیا۔ جوں جوں ہم بلندی پر جائیں، توں توں سردی بڑھتی ہے۔ جیسے جیسے منزل قریب آتی گئی، ویسے ویسے ہم خوش ہوتے گئے، کہنا ہی درست ہوگا۔

اب ہم طالب علموں کے استفادے کے لیے مختلف حوالوں سے کچھ غلط اور درست جملے لکھتے ہیں۔ انھیں اپنی تحریر میں ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

املا کی اغلاط

غلط جملے	درست جملے
اسلام وعلیکم کے بعد عرض ہے۔	السلام علیکم کے بعد عرض ہے۔
مجھے تمھاری مخالفت کی پرواہ نہیں۔	مجھے تمھاری مخالفت کی پروا نہیں۔
یہ واقع کب پیش آیا؟	یہ واقعہ کب پیش آیا؟
عیدالضحیٰ مسلمانوں کا مذہبی تہوار ہے۔	عیدالاضحیٰ مسلمانوں کا مذہبی تہوار ہے۔
مجھے ایک ضروری کام پڑھ گیا ہے۔	مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔
اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے؟	اس میں ناراضی کی کیا بات ہے؟
مجھے آپ کی بات سن کر حیرانگی ہوئی۔	مجھے آپ کی بات سن کر حیرانی ہوئی۔
یہ جملہ صیح نہیں۔	یہ جملہ صحیح نہیں۔
وہ بلکل خاموش تھا۔	وہ بالکل خاموش تھا۔
قاعداعظم کراچی میں پیدا ہوئے۔	قائداعظم ؒ کراچی میں پیدا ہوئے۔
سفید کاغذ کو دودھ سے تشبیح دیتے ہیں۔	سفید کاغذ کو دودھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

واحد جمع کی اغلاط

یہاں ہر امراض کا علاج ہوتا ہے۔	یہاں ہر مرض کا علاج ہوتا ہے۔
میں نے ہر ممالک کی سیر کی ہے۔	میں نے ہر ملک کی سیر کی ہے۔
میں نے دو من گیہوں خریدا۔	میں نے دو من گیہوں خریدے۔
میاں میر بہت بڑے اولیا اللہ تھے۔	میاں میر بہت بڑے ولی اللہ تھے۔
اس نے تمام مشکلاتوں کا مقابلہ کیا۔	اس نے تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔
یہ دونوں اشعار میرے پسندیدہ ہیں۔	یہ دونوں شعر میرے پسندیدہ ہیں۔
وہ کئی سالوں سے لاہور میں مقیم ہے۔	وہ کئی سال سے لاہور میں مقیم ہے۔
دونوں فریقین کے درمیان صلح ہوگئی۔	فریقین کے درمیان صلح ہوگئی۔

تذکیر و تانیث کی اغلاط

جنابہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ!	جناب ہیڈ مسٹریس صاحب!
اسے ابھی تک ہوش نہیں آئی۔	اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔
میں صبح سے آپ کا راہ دیکھ رہا ہوں۔	میں صبح سے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔
بچے کا ناک بہہ رہا ہے۔	بچے کی ناک بہہ رہی ہے۔
اس دکان کی دہی کھٹی ہے۔	اس دکان کا دہی کھٹا ہے۔
مولانا محمد حسین آزاد بہت اچھا اردو لکھتے تھے۔	مولانا محمد حسین آزاد بہت اچھی اردو لکھتے تھے۔
مرض بڑھتی گئی جوں جوں دوا کی۔	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔
میں نے آج کی اخبار نہیں پڑھی۔	میں نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔
میں نے آپ کی بہت انتظار کی۔	میں نے آپ کا بہت انتظار کیا۔
آج کل چین کی طوطی بول رہی ہے۔	آج کل چین کا طوطی بول رہا ہے۔
وہ لاکھوں کا مال ہضم کر گیا مگر ڈکار تک نہ لیا۔	وہ لاکھوں کا مال ہضم کر گیا مگر ڈکار تک نہ لی۔
بچے کا گیند گم ہو گیا۔	بچے کی گیند گم ہو گئی۔
بازار میں بہت زیادہ کیچڑ تھا۔	بازار میں بہت زیادہ کیچڑ تھی۔
ہرا ہرا گھاس دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔	ہری ہری گھاس دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔
مجھے اس بات کا بڑا فکر ہے۔	مجھے اس بات کی بڑی فکر ہے۔
یہ پتھر بہت بھارا ہے۔	یہ پتھر بہت بھاری ہے۔
آپ کو کون سی کھیل پسند ہے؟	آپ کو کون سا کھیل پسند ہے؟
کمرے کا چھت ٹپکنے لگا۔	کمرے کی چھت ٹپکنے لگی۔

زائد اور متشابہ الفاظ کی اغلاط

نذیر اکبری آبادی کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔	نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔
ڈپٹی نظیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔	ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔

میں یہ کتاب آپ کی نظر کرتا ہوں۔	میں یہ کتاب آپ کی نذر کرتا ہوں۔
مثل ہے کہ ہمت کا ہامی خدا ہے۔	مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔
صدا عیش دوراں دکھاتا نہیں۔	سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں۔
میں نے سیب کا مربع کھایا۔	میں نے سیب کا مربہ کھایا۔
ابن بطوطہ بہت بڑا سیاہ تھا۔	ابن بطوطہ بہت بڑا سیاح تھا۔
پہلی رات کے چاند کو حلال کہتے ہیں۔	پہلی رات کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔
بڑھیا عورت نے بچوں کو دعائیں دیں۔	بڑھیا نے بچوں کو دعائیں دیں۔
ہم سب بخیریت سے ہیں۔	ہم سب بخیریت ہیں۔
وہ بمشکل سے گھر پہنچا۔	وہ مشکل سے گھر پہنچا۔
درحقیقت میں وہ سچا تھا۔	درحقیقت وہ سچا تھا۔
سنگِ مرمر کا پتھر بڑا ملائم ہوتا ہے۔	سنگِ مرمر بڑا ملائم ہوتا ہے۔
مریض کی عیادت کرنا کارِ ثواب کا کام ہے۔	مریض کی عیادت کارِ ثواب ہے۔
آج شبِ برات کی رات ہے۔	آج شبِ برات ہے۔
دھوپ میں نہ چلو مبادا بیمار نہ پڑ جاؤ۔	دھوپ میں نہ چلو مبادا بیمار پڑ جاؤ۔
میں نے اس کتاب سے استفادہ حاصل کیا ہے۔	میں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔
یہ راستہ شارع عام نہیں ہے۔	یہ شارع عام نہیں ہے۔
اس نے خود آپ ساری بات بتائی۔	اس نے خود ساری بات بتائی۔
ان کی شادی بتاریخ 17۔ دسمبر کو ہوئی تھی۔	ان کی شادی بتاریخ 17۔ دسمبر ہوئی تھی۔
تیز چلو، مبادا گاڑی نہ چھوٹ جائے۔	تیز چلو، مبادا گاڑی چھوٹ جائے۔
اس نے میرے برخلاف گواہی دی۔	اس نے میرے خلاف گواہی دی۔
وہ تا ہنوز کراچی سے نہیں آیا۔	وہ ہنوز کراچی سے نہیں آیا۔
آپ مری سے کب واپس لوٹیں گے؟	آپ مری سے کب لوٹیں گے؟

امالہ کی اغلاط

یہ آپ ہی کے فائدہ کی بات ہے۔	یہ آپ ہی کے فائدے کی بات ہے۔
قاعدہ قانون کے مطابق چلنا چاہیے۔	قاعدے قانون کے مطابق چلنا چاہیے۔
حامد نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتا ہے۔	حامد نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔
میں اس جھگڑا میں کیوں پڑوں؟	میں اس جھگڑے میں کیوں پڑوں۔
لوگ کھیل دیکھ کر ہکے بکے رہ گئے۔	لوگ کھیل دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔
وہ بڑے حیلہ بہانہ کرتا ہے۔	وہ بڑے حیلے بہانے کرتا ہے۔
ہر ذرہ میں خدا کا نور جلوہ گر ہے۔	ہر ذرے میں خدا کا نور جلوہ گر ہے۔
ننھا روتا روتا سو گیا۔	ننھا روتے روتے سو گیا۔
جلسہ میں بہت زیادہ لوگ آئے تھے۔	جلسے میں بہت زیادہ لوگ آئے تھے۔
آپ ہمت اور حوصلہ سے کام لیں۔	آپ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔
مجھے کھیل تماشا سے کوئی دلچسپی نہیں۔	مجھے کھیل تماشے سے کوئی دلچسپی نہیں۔
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے۔	پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔
وہ لطیفہ پر لطیفہ سنا رہے تھے۔	وہ لطیفے پر لطیفہ سنا رہے تھے۔

اضافت و عطف کی اغلاط

مویشی شدتِ دھوپ سے ہانپنے لگے۔	مویشی دھوپ کی شدت سے ہانپنے لگے۔
دیکھنے و سننے میں بڑا فرق ہے۔	دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے۔
یہ چیخ و پکار کیسی ہے؟	یہ چیخ پکار کیسی ہے؟
وہ صحیح و سلامت گھر پہنچ گیا۔	وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گیا۔
انھوں نے میری خاطر و مدارات کی۔	انھوں نے میری خاطر مدارات کی۔
ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔	ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔
آپس میں پیار و محبت سے رہو۔	آپس میں پیار اور محبت سے رہو۔

لیڈران قوم کا احترام کرنا چاہیے۔	قوم کے لیڈروں کا احترام کرنا چاہیے۔
خدا ہمیں آگ جہنم سے بچائے!	خدا ہمیں جہنم کی آگ سے بچائے!
بارش سے باغ کا رنگ و روپ نکھر گیا۔	بارش سے باغ کا رنگ روپ نکھر گیا۔

مطابقت کی اغلاط

آپ کب تشریف لاؤ گے؟	آپ کب تشریف لائیں گے؟
آپ یہاں سے چلے جاؤ۔	آپ یہاں سے چلے جائیں۔
لڑکیاں سبق یاد کر رہیں ہیں۔	لڑکیاں سبق یاد کر رہی ہیں۔
آؤ آؤ تشریف رکھو۔	آئیے آئیے تشریف رکھیے۔
میں نے تین کرسیاں اور ایک میز خریدیں۔	میں نے تین کرسیاں اور ایک میز خریدی۔
معلوم نہیں باہر کون صاحب ہے؟	معلوم نہیں باہر کون صاحب ہیں؟
"مکاتیب غالب" چھپ گئے ہیں۔	"مکاتیب غالب" چھپ گئی ہے۔
میں نے آج اخبار نہیں پڑھی۔	میں نے آج اخبار نہیں پڑھا۔
آپ منھ ہاتھ دھولو۔	آپ منھ ہاتھ دھولیں۔
اسلم اور اس کا بھائی راستہ بھول گیا۔	اسلم اور اس کا بھائی راستہ بھول گئے۔
جلسے میں عورتیں بھی آئی ہوئیں تھیں۔	جلسے میں عورتیں بھی آئی ہوئی تھیں۔
اسے ابھی تک ہوش نہیں آئی۔	اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔
میں اور احمد بازار گیا تھا۔	میں اور احمد بازار گئے تھے۔
ماموں اور بھانجا لڑ پڑا۔	ماموں اور بھانجا لڑ پڑے۔
زندگی کھیل اور تماشا ہوتی ہیں۔	زندگی کھیل اور تماشا ہوتی ہے۔
گھر عورت کی سلطنت ہوتی ہے۔	گھر عورت کی سلطنت ہوتا ہے۔
وہ اور میں راستہ بھول گیا۔	وہ اور میں راستہ بھول گئے۔
"ادبی دنیا" بند ہو چکی ہے۔	"ادبی دنیا" بند ہو چکا ہے۔

نیکی کا راہ بہت کٹھن ہے۔	نیکی کی راہ بہت کٹھن ہے۔
اب تو دن رات چین سے گزر رہی ہے۔	اب تو دن رات چین سے گزر رہے ہیں۔
وہ گھوڑا گاڑی کس کا ہے؟	وہ گھوڑا گاڑی کس کی ہے؟

''نے'' اور ''کو'' کی اغلاط

میں نے آج ہی واپس جانا ہے۔	مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔
یہ سبق ہم نے پڑھا ہوا ہے۔	یہ سبق ہمارا پڑھا ہوا ہے۔
آپ نے کہاں جانا ہے؟	آپ کو کہاں جانا ہے؟
انور نے آپ کو کیا کہا تھا؟	انور نے آپ سے کیا کہا تھا؟
دشمن میرے بال کو بیکا نہ کر سکے۔	دشمن میرا بال بیکا نہ کر سکے۔
ہم کو اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیے۔	ہمیں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیے۔
میں نے آپ کے مکان کو نہیں دیکھا۔	میں نے آپ کا مکان نہیں دیکھا۔
آپ میری خطا کو معاف کر دیں۔	آپ میری خطا معاف کر دیں۔
دروازے کو بند کر دو۔	دروازہ بند کر دو۔
جناب پرنسپل نے طلبہ کو خطاب کیا۔	جناب پرنسپل نے طلبہ سے خطاب کیا۔
انھوں نے آپ کو کیا پوچھا تھا؟	انھوں نے آپ سے کیا پوچھا تھا؟
جو کچھ تم نے کہنا ہے کہہ لو۔	جو کچھ تمھیں کہنا ہے کہہ لو۔
ایک دن سبھی نے مرنا ہے۔	ایک دن سبھی کو مرنا ہے۔
میری بات کو غور سے سنو۔	میری بات غور سے سنو۔
میں نے دو ٹکٹ کو خریدا۔	میں نے دو ٹکٹ خریدے۔
اس نے راولپنڈی جانا ہے۔	اسے راولپنڈی جانا ہے۔
نوکر نے بازار سے دودھ لایا۔	نوکر بازار سے دودھ لایا۔
میری باتیں کان کو کھول کر سنو۔	میری باتیں کان کھول کر سنو۔

وہ آپ کو ملنے کا خواہش مند ہے۔	وہ آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔

ضرب الامثال اور محاورات کی اغلاط

ایک انار ہزار بیمار۔	ایک انار سو بیمار۔
پانی دیکھو، پانی کی دھار دیکھو۔	تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔
دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ باہر کا۔	دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔
جس کی لاٹھی اس کی گائے۔	جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔
لڑکا گود میں ڈھنڈورا شہر میں۔	لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔
دودھ کا جلا لسی پھونک کر پیتا ہے۔	دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔
بھینس بڑی کہ عقل۔	عقل بڑی کہ بھینس۔
گائے کے آگے بین بجانا۔	بھینس کے آگے بین بجانا۔
گیہوں کے ساتھ جو بھی پس جاتا ہے۔	گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔
نہ دس من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی۔	نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی۔
آسمان سے گرا کوٹھے پر اٹکا۔	آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔
لکڑی کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔	کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔
بھاگتے چور کا جوتا ہی سہی۔	بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔
بوڑھی گھوڑی سرخ لگام۔	بوڑھی گھوڑی لال لگام۔
جتنی چادر دیکھو اتنے ہاتھ پھیلاؤ۔	جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ۔
چور کی داڑھی میں شہتیر۔	چور کی داڑھی میں تنکا۔
امیر کی جورو سب کی بھابی۔	غریب کی جورو سب کی بھابی۔
قاضی کے گھر کے چوہے بھی عقل مند۔	قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔
سات سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔	نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔
مجھے ہتھیلی پر سرسوں لگانا نہیں آتا۔	مجھے ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں آتا۔

سر منڈاتے ہی پتھر پڑے۔	سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔
وہ ایک چھڑی سے سب کو ہانکتے ہیں۔	وہ ایک لاٹھی سے سب کو ہانکتے ہیں۔
آپ کا حکم سر ماتھے پر۔	آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔
قائداعظمؒ کی سیاست دانی کا سکہ قائم ہو گیا۔	قائداعظمؒ کی سیاست دانی کا سکہ بیٹھ گیا۔
اسرائیل عربوں کے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔	اسرائیل عربوں کی چھاتی پر مونگ دل رہا ہے۔
فوج نے دریا کے کنارے ڈیرہ ڈال دیا۔	فوج نے دریا کے کنارے ڈیرے ڈال دیے۔
میرے ساتھ چار پانچ مت کرو۔	میرے ساتھ تین پانچ مت کرو۔
یہ بڑھیا آفت کی پرکالی ہے۔	یہ بڑھیا آفت کا پرکالہ ہے۔
یہاں سوئی دھرنے کی جگہ نہیں۔	یہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔
حامد نے محمود کو آڑے ہاتھ لیا۔	حامد نے محمود کو آڑے ہاتھوں لیا۔
اس نے مجھے گالی نکالی۔	اس نے مجھے گالی دی۔
ناہید یہ سن کر بکی بکی رہ گئی۔	ناہید یہ سن کر ہکا بکا رہ گئی۔
آپ نے یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے؟	آپ نے یہ کیا اودھم مچا رکھی ہے؟
یہ خبر سن کر میرے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔	یہ خبر سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

روزمرہ کی اغلاط

وہ دن بدن کم زور ہو رہا ہے۔	وہ روز بروز کم زور ہو رہا ہے۔
مہنگائی کے ہاتھوں غریب فاقے مر رہے ہیں۔	مہنگائی کے ہاتھوں غریب فاقوں مر رہے ہیں۔
دن دن کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے۔	روز روز کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے۔
مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمھاری بات کا کیا جواب دوں؟	مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تمھاری بات کا کیا جواب دوں۔
احمد آئے روز غیر حاضر رہتا ہے۔	احمد آئے دن غیر حاضر رہتا ہے۔
شور سن کر بچے کی نیند کھل گئی۔	شور سن کر بچے کی آنکھ کھل گئی۔
امتحان میں سرخ سیاہی کا استعمال منع ہے۔	امتحان میں سرخ روشنائی کا استعمال منع ہے۔

ہم ہر دن سیر کو جاتے ہیں۔	ہم ہر روز سیر کو جاتے ہیں۔
یہ عورت بڑی لڑاکی ہے۔	یہ عورت بڑی لڑاکا ہے۔
دہشت گردوں نے اندھیرا مچا رکھا ہے۔	دہشت گردوں نے اندھیر مچا رکھا ہے۔
میں نے یہ سبق پڑھا ہوا ہے۔	یہ سبق میرا پڑھا ہوا ہے۔
بارش برس رہی ہے۔	بارش ہو رہی ہے۔
بے چارے کو بے نیل و مرام لوٹنا پڑا۔	بے چارے کو بے نیلِ مرام لوٹنا پڑا۔
کیا تم چپ نہیں کر سکتے؟	کیا تم چپ نہیں رہ سکتے؟
آپ کو یہ خبر کیسے معلوم ہوئی؟	آپ کو یہ خبر کیسے ملی؟
ہمارا مکان برلب سڑک واقع ہے۔	ہمارا مکان سڑک کے کنارے واقع ہے۔
میں بے ناغہ سکول آتا ہوں۔	میں بلا ناغہ سکول آتا ہوں۔
میں اس کے سخت برخلاف ہوں۔	میں اس کے سخت خلاف ہوں۔
آپ میری بات کا برا نہ منائیں۔	آپ میری بات کا برا نہ مانیں۔
میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔	میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔
ہم آج واپس لوٹ جائیں گے۔	ہم آج لوٹ جائیں گے۔
ان دونوں کی عمروں میں اٹھارہ بیس کا فرق ہے۔	ان دونوں کی عمروں میں انیس بیس کا فرق ہے۔
میرے سوا سب موجود تھے۔	میرے علاوہ سب موجود تھے۔
وہ گھر بہ گھر اور گلی بہ گلی پھرے۔	وہ گھر گھر اور گلی گلی پھرے۔
خدا خدا کر کے دن نکلا۔	خدا خدا کر کے دن چڑھا۔
میں آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔	میں آپ کی خیریت نیک مطلوب ہوں۔
میں آپ کا تابعدار ہوں۔	میں آپ کا تابع فرمان ہوں۔
آؤ یہاں سے چل نکلیں۔	آؤ یہاں سے نکل چلیں۔
ہم بلا روک ٹوک آگے بڑھ گئے۔	ہم بے روک ٹوک آگے بڑھ گئے۔
ہم نے ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔	ہم نے ٹوپی پہن رکھی [illegible]

برائے مہربانی کر کے کل ضرور آئیں۔	براہ مہربانی کل ضرور آئیں۔
میں ضرور بر ضرور آؤں گا۔	میں ضرور بالضرور آؤں گا۔
ہوش جاتی نہیں رہی لیکن۔	ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
چار پانچ کرنا شریفوں کا کام نہیں۔	تین پانچ کرنا شریفوں کا کام نہیں۔
اس میں برا منانے کی کیا بات ہے؟	اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟
آپ کا مزاج کیسا ہے؟	آپ کے مزاج کیسے ہیں؟
ضد کرنی بری بات ہے۔	ضد کرنا بری بات ہے۔
چیرو تو بدن میں لہو نہیں۔	کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
شور نہ ڈالو۔	شور نہ کرو۔
ممتحن نے پرچہ بڑا مشکل ڈالا ہے۔	ممتحن نے پرچہ بڑا مشکل بنایا ہے۔
اس کی صورت دیکھ کر ڈر آتا ہے۔	اس کی صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔

اعراب، ہجے (تلفظ)

کسی لفظ کے حروف پر اعراب (زیر، زبر، پیش، جزم وغیرہ) لگا کر اس کی صحیح آواز نمایاں کرنے کا نام تلفظ ہے۔ زبان دانی میں صحتِ تلفظ کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھنے کے لیے حرکات کا جاننا ضروری ہے۔ حرکات ان علامات کو کہتے ہیں جو الفاظ کی صحیح ادائیگی کے لیے ان کے مختلف حروف پر دی جاتی ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

زبر (اَ) یہ علامت حرف کے اوپر لگائی جاتی ہے۔ اس علامت کو فتحہ بھی کہتے ہیں۔ جس حرف پر یہ علامت ہوگی وہ مفتوح کہلائے گا۔

زیر (اِ) یہ علامت حرف کے نیچے لگائی جاتی ہے۔ اس علامت کو کسرہ بھی کہتے ہیں۔ جس حرف پر یہ علامت ہوگی اسے مکسور کہیں گے۔

پیش (اُ) یہ علامت حرف کے اوپر لگائی جاتی ہے۔ اس علامت کا دوسرا نام ضمہ ہے۔ جس حرف پر یہ علامت ہوگی اسے مضموم کہتے ہیں۔

جزم (ْ) کسی حرف کو ساکن ظاہر کرنے کے لیے اس کے اوپر جزم کی علامت لگا دی جاتی ہے۔ اس علامت کا دوسرا نام سکون ہے۔ جس حرف پر یہ علامت ہو گی وہ ساکن کہلائے گا مثلاً: عقل میں ق ساکن ہے۔

تشدید (ّ) یہ علامت اس حرف کے اوپر لگائی جاتی ہے جسے دو بار پڑھا جاتا ہے۔ جس حرف پر یہ علامت آتی ہے اسے مشدد کہتے ہیں مثلاً: مُعَلِّم میں "ل" مشدد ہے۔

مد (ٓ) یہ علامت صرف الف پر لگائی جاتی ہے۔ جس الف پر یہ علامت ہو گی، اسے الف ممدودہ کہتے ہیں اور اسے کھینچ کر پڑھتے ہیں جیسے: آب، آج، آن، آم وغیرہ

کھڑی زبر (ٰ) یہ علامت صرف عربی الفاظ میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً: اللہ، موسیٰ، عیسیٰ، رحمٰن، اسحٰق، ادنیٰ، اعلیٰ، عظمیٰ وغیرہ

کھڑی زیر ( ) یہ علامت بھی فقط عربی الفاظ میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً: آلہٖ، بعینہٖ وغیرہ میں۔

الٹی پیش (ٗ) یہ علامت واؤ کی قائم مقام ہے اور اس واؤ پر لگاتے جیسے دو بار پڑھتے ہیں۔ مثلاً: داوود کو ہم ایسے لکھیں گے: داؤد اور واؤ پر پیش لگائیں گے۔

تنوین (ٌ) اگر کسی حرف پر دو زبر، دو زیر یا دو پیش لگا دیں تو اسے تنوین کہتے ہیں۔ یہ علامت اردو کے کچھ الفاظ میں استعمال ہوتی ہے۔ ان سے چند الفاظ یہ ہیں:

فوراً، اتفاقاً، احتیاطاً، اصولاً، امتحاناً، رسماً، عمداً، عملاً، غالباً، احتجاجاً، اخلاقاً، جواباً، سوالاً، آناً، فاناً، وقتاً فوقتاً، فطرتاً، اشارتاً، نسبتاً وغیرہ

اردو میں عربی، فارسی کے اکثر الفاظ مستعمل ہیں، جن کا صحیح تلفظ کرنے میں طلبہ بالعموم غلطی کرتے ہیں۔ اس طرح ہندی کے بعض الفاظ کے تلفظ میں بھی وہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔

ہم نے طلبہ کے استفادے کے لیے ذیل کی سطور میں عربی الفاظ کے مشہور اوزان اور ان کے وزن پر آنے والے کچھ الفاظ لکھ دیے ہیں طلبہ پر لازم آتا ہے کہ انھیں ازبر کر لیں اور ان کے وزن پر آنے والا الفاظ بھی دیکھ لیں۔ اس طرح ان کا تلفظ درست ہو جائے گا اور وہ خوب صورت گفت گو کرنے لگیں گے، جس سے ان کی شخصیت میں خوشگوار اضافہ ہو گا۔

فَعْلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر زبر آتا ہے اور دوسرے دونوں حروف ساکن ہوتے ہیں۔ مثلاً:

أرض، أجر، أمر، أصل، بطن، بذر، برق، بہت، جذب، جبر، جلد، حرف، حذف، حمد، ختم، دفن، درس، رقص، رسم، رمز، شرم، شکل، شرط، صبر، صدر، ظرف، طنز، عقل، عزم، عقد، عصر، عضو، عذر، فصل، فقر، فخر، فرض، قرض، قصد، کشف، لفظ، مسح، نظم، نثر، نجم، نفس، وجد، وضع، وصل وغیرہ

فِعْلْ: اس وزن میں پہلے حرف کے نیچے زیر آتی ہے اور دوسرے دونوں حروف ساکن ہوتے ہیں۔ مثلاً: اِبن، اِذن، اِسم، جِسم، حِفظ، حِرص، ذِکر، شِرک، صِدق، عِشق، عِلم، فِسق، فِکر، نِصف، اِرد، گِرد وغیرہ

فُعْلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر پیش آتی ہے اور دوسرے دونوں حرف ساکن ہوتے ہیں۔ جیسے: اُنس، بُغض، بُخل، حُزم، حُزن، حُکم، شُغل، شُکر، ظُلم، عُشر، عُضو، قُرب، کُفر، مُلک، خُمس، عُذر وغیرہ

فَعَلْ: اس وزن میں پہلے دونوں حرفوں پر زبر آتا ہے۔ مثلاً: اَدَب، اَجَل، اَثَر، اَزَل، اَبَد، اَلَم، بَشَر، بَصَر، بَدَن، ثَمَر، جَدَل، حَرَج، خَبَر، خَطَر، شَفَق، طَلَب، عَرَق، عَمَل، عَدَم، غَزَل، غَلَط، غَضَب، غَرَض، فَقَط، قَلَق، قَلَم، کَفَن، مَرَض، مَثَل، نَسَب وغیرہ

اَفْعَالْ: اس وزن میں پہلے حرف پر زبر، دوسرا ساکن، تیسرے حرف پر زبر، پانچواں ساکن ہوتا ہے۔ مثلاً: اَخلاق، اَسرار، اَسلاف، اَفراد، اَلقاب، اَمثال، اَفکار، اَخبار، اَقسام، اَفواج، اَضلاع وغیرہ

اِفْعَالْ: اس وزن میں پہلے حرف کے نیچے زیر، دوسرا ساکن، تیسرے حرف پر زبر اور پانچواں ساکن ہوتا ہے۔ مثلاً: اِدبار، اِرسال، اِرشاد، اِسراف، اِعراب، اِعزاز، اِفراط، اِفلاس، اِفطار، اِقدام وغیرہ

اِنْفِعَالْ: اس وزن میں پہلے حرف کے نیچے زیر، دوسرا ساکن، تیسرے حرف کے نیچے زیر، چوتھے پر زبر اور چھٹا حرف ساکن ہوتا ہے، مثلاً:

اِفتِعال، اِقتِباس، اِجتِماع، اِعتِراف، اِرتِکاب، اِجتِناب، اِختِصار، اِفتِخار، اِشتِعال، اِفتِتاح، اِلتِماس، اِنحِراف، اِنحِصار، اِنعِکاس، اِنکِسار، اِنکِشاف، اِنقِلاب، اِنحِطاط، اِنعِطاف، اِحتِرام، اِختِتام، اِختِلاف، اِشتِہار، اِعتِراض، اِعتِدال، اِمتِحان، اِنتِخاب، اِنبِساط وغیرہ

تَفَاعُلْ: اس وزن میں پہلے دونوں حرفوں پر زبر اور چوتھے پر پیش ہے۔ مثلاً: تَعارُف، تَناسُب، تَعاقُب، تَفاخُر، تَواضُع، تَقابُل، تَصادُم، تَعاوُن، تَناوُل، تَوازُن، تَسابُل، تَداوُل وغیرہ

تَفَعُّل: اس وزن میں پہلے اور دوسرے حرف پر زبر جب کہ تیسرے حرف پر تشدید اور پیش آتی ہے۔ مثلاً:

تَعَصُّب، تَعَجُّب، تَعَلُّق، تَعَیُّن، تَشَدُّد، تَہَجُّد، تَفَکُّر، تَکَبُّر، تَجَسُّس، تَقَدُّس، تَعَیُّش، تَخَلُّص، تَحَفُّظ، تَلَفُّظ، تَسَلُّط، تَکَلُّف، تَصَرُّف، تَوَقُّف، تَمَدُّن، تَبَسُّم، تَکَلُّم، تَوَکُّل، تَنَزُّل، تَدَبُّر، تَشَکُّر، تَرَنُّم، تَبَرُّک وغیرہ

فَاعِلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر زبر جب کہ تیسرے حرف کے نیچے زیر آتی ہے اور فاعل کے وزن پر آنے والے وہ تمام الفاظ جو فعل سے بنتے ہیں، اسمِ فاعل ہوتے ہیں۔ مثلاً:

عَالِمْ، حَاسِدْ، فَاضِل، عَابِد، ظَالِم، حَاکِم، طَالِب، قَاتِل، سَاجِد، حَامِد، عَاشِق، زَاہِد، کَاتِبْ، عَادِلْ وغیرہ

مَفْعُوْلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر زبر، دوسرا سکون، تیسرے پر پیش، چوتھا اور پانچواں سکون۔ مَفْعُوْل کے وزن پر آنے والے وہ تمام الفاظ جو فعل سے بنتے ہیں اسمِ مفعول ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مَعْلُوْمْ، مَسْجُوْدْ، مَعْبُوْدْ، مَظْلُوْمْ، مَحْکُوْمْ، مَطْلُوْبْ، مَقْتُوْلْ، مَحْمُوْدْ، مَحْبُوْبْ، مَعْشُوْقْ، مَفْتُوْحْ، مَذْکُوْرْ، مَضْمُوْنْ، مَفْقُوْدْ، مَوْجُوْدْ وغیرہ

مُفْعِلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر پیش، دوسرا ساکن، تیسرے حرف کے نیچے زیر اور چوتھا حرف ساکن ہوتا ہے۔ جیسے:

مُخْلِصْ، مُوْجِدْ، مُفْلِسْ، مُفْسِدْ، مُشْرِکْ، مُنْصِفْ، مُشْفِقْ، مُحْسِنْ، مُجْرِمْ، مُشْکِلْ، مُوْمِنْ، مُسْلِمْ وغیرہ

مُفَاعَلَہْ: اس وزن میں پہلے حرف پر پیش، دوسرے، چوتھے اور پانچویں حرف پر زبر آتا ہے۔ مثلاً:

مُبَالَغَہْ، مُحَاصَرَہْ، مُطَالَعَہْ، مُبَاحَثَہْ، مُجَاہَدَہْ، مُحَاسَبَہْ، مُرَاسَلَہْ، مُشَاعَرَہْ، مُشَاہَدَہْ، مُطَالَبَہْ، مُشَاہَرَہْ، مُکَالَمَہْ، مُلَاحَظَہْ، مُنَاظَرَہْ، مُقَابَلَہْ، مُعَاوَضَہْ، مُغَالَطَہْ، مُعَالَجَہْ وغیرہ

مُفَاعِلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر پیش، دوسرے پر زبر، چوتھے کے نیچے زیر ہے۔ مثلاً:

مُحَافِظْ، مُسَافِرْ، مُعَالِجْ، مُجَاہِدْ، مُخَالِفْ، مُنَافِقْ، مُوَافِقْ وغیرہ

مُفَعَّلْ: اس وزن میں پہلے حرف پر پیش، دوسرے پر زبر، تیسرے حرف پر تشدید اور اوپر زبر آتا ہے۔ جیسے:

مُقَدَّسْ، مُرَکَّبْ، مُہَذَّبْ، مُقَرَّبْ، مُثَلَّثْ، مُرَوَّجْ، مُعَطَّرْ، مُقَدَّرْ، مُلَخَّصْ، مُخَفَّفْ، مُجَسَّمْ، مُحَقَّقْ وغیرہ

مَفْعَل: اس وزن میں پہلے اور تیسرے حرف پر زبر آتا ہے۔ مثلاً:

مَکْتَب، مَشْرَب، مَسْنَد، مَرْقَد، مَدْفَن، مَقْتَل، مَسْلَک وغیرہ

مَفْعِل: اس وزن میں پہلے حرف پر زبر اور تیسرے حرف کے نیچے زیر آتی ہے۔ جیسے:

مَجْلِس، مَحْفِل، مَنْزِل، مَشْرِق، مَغْرِب، مَسْجِد، مَجْمِل وغیرہ

اُمَرَا: اس وزن پر آنے والے پہلے حرف پر پیش اور دوسرا اور تیسرا حرف مفتوح ہے اور یہ تمام الفاظ اسم جمع ہیں۔

جیسے: غُرَبَا، فُقَرَا، اُدَبَا، شُعَرَا، شُہَدَا، عُلَمَا وغیرہ

مندرجہ بالا اوزان پر آنے والے الفاظ کے علاوہ طلبہ پر لازم ہے کہ وہ درج ذیل الفاظ کے تلفظ کو بھی یاد رکھیں:

عَمَل، عَقْل، جِسْم، شُکْر، اَخْلَاق، اُمَرَا، مَذَاہِب، جُلُوس، عَالِم، مُسْلِم، مُسَافِر، مُصَوِّر، حِسَاب، مُخْتَلِف، مُعَطَّر، مَحْبُوب، مُحْتَرِم، مِعْرَاج، مَنْزِل، مَدْرَسہ، اَفْضَل، اِسْلَام، اِعْتِبَار، اِتِّحَاد، تَرَنُّم، تَعْظِیْم، تَعَاوُن، اِسْتِعْمَال، تِلَاوَت، نَفَاسَت، مَعْذِرَت، مُشَاعَرَہ، بُخَار، مَحَبَّت، حَاجَت، حَلَال، مَبَادَا، طَلَبَہ، چِکْنَا چُوْر، خَیْرْمَقْدَم، یُوْسُف، مُتَّحِدَہ، فِرِشْتَہ وغیرہ

❀❀

رموزِ اوقاف

رموز "رمز" کی جمع ہے جس کے لغوی معنی "اشارہ" کے ہیں اور اوقاف "وقف" کی جمع ہے جس کے معنی "توقف یا ٹھہراؤ" کے ہیں۔ چنانچہ رموزِ اوقاف کے معنی ہوئے توقف یا ٹھہراؤ کے اشارے۔ رموزِ اوقاف سے مراد وہ علامات ہیں جو تحریر میں ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو دوسرے حصوں سے علیحدہ کریں۔ علاماتِ وقف (Punctuation) کی مدد سے قاری عبارت کو بڑی روانی اور سہولت کے ساتھ پڑھتا چلا جاتا ہے اور عبارت کے مفہوم کو بھی بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

اردو میں رموزِ اوقاف کے طور پر بالعموم مندرجہ ذیل علامتیں استعمال میں آتی ہیں:

نام علامت	شکل	انگریزی نام
سکتہ یا وقفِ خفیف	،	Comma
وقفہ یا نصف وقف	؛	Semi Colon
رابطہ یا وقفِ لازم	:	Colon
تفصیلیہ	:-	Colon & Dash
ختمہ یا وقفِ مطلق	۔	Full Stop

سوالیہ یا استفہامیہ	؟	Sign of Interrogation
ندائیہ یا فجائیہ	!	Sign of Exclamation
واوین	“ ”	Inverted Commas
قوسین	( )	Brackets
خط	ــــ	Dash

سکتہ ، یہ علامت سب سے کم توقف کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جس لفظ کے بعد یہ علامت آئے وہاں قاری کو بغیر سانس ٹوٹے بالکل ذرا سی دیر کے لیے ٹھہرنا چاہیے۔ مثلاً:

کراچی، لاہور، حیدرآباد، ملتان، پشاور اور کوئٹہ پاکستان کے بڑے بڑے شہر ہیں۔

وقفہ ؛ یہ علامت سکتہ سے ذرا زیادہ ٹھہراؤ کے لیے آتی ہے۔ یہ علامت دو مقاصد کے تحت استعمال ہوتی ہے: جب ایک طویل میں چھوٹے چھوٹے جملے آئیں یا کسی جملے کے مختلف اجزا پر زور دینا مقصود ہو۔ جیسے: جو کرے گا سو بھرے گا؛ جو بوئے گا سو کاٹے گا۔

رابطہ : اس علامت کا ٹھہراؤ وقفہ سے قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ اس علامت کو وقف لازم بھی کہا جاتا ہے اور اس کا عام طور پر استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں جملے کے سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے یا کسی مختصر مقولے یا ضرب المثل کو بیان کرنا ہو۔ جیسے: آپ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرو، خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔

تفصیلیہ :- جیسا کہ اس علامت کے نام ہی سے ظاہر ہے، یہ علامت کسی بات کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے استعمال ہوتی ہے۔ عام طور پر اس کے استعمال سے پہلے مندرجہ ذیل یا حسب ذیل وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں یا ان کا موقع ہوتا ہے۔ جیسے: علامہ اقبال ؒ نے خطبہ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:—

ختمہ ۔ یہ علامت تحریر میں جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے۔ جیسے: دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

سوالیہ یا استفہامیہ ؟ یہ علامت کسی سوالیہ جملے کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ جیسے: یہ کتاب کس کی ہے؟ آج کون سا دن ہے؟ آپ کا نام؟ وغیرہ

ندائیہ یا فجائیہ ! — یہ علامت دراصل لفظ "ندا" کا مخفف ہے اور الف اور "ن" کا نقطہ ملا کر بنائی گئی ہے۔ یہ علامت وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی کو ندا دینا، پکارنا یا خطاب کرنا مقصود ہو۔ دوسرے جب کسی بھی جذبے مثلاً: خوشی، غم، حیرت یا ادب وغیرہ کے اظہار کا موقع ہو۔ جیسے: احمد! تم ادھر آؤ۔ اف! میرے پاؤں میں سخت تکلیف ہے۔

واوین " " — اس علامت کا استعمال کسی کا قول اسی کے الفاظ میں درج کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ جیسے: باپ نے کہا: "بیٹا! محنت کرو، محنت کا پھل ضرور ملے گا۔"

قوسین ( ) — اس علامت میں ایسے الفاظ لکھے جاتے ہیں جو لفظِ معترضہ یا جملۂ معترضہ کے طور پر آتے ہیں اور انھیں حذف کر دینے سے عبارت کے ربط و تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے: انور صاحب (مرحوم) سے ہمارے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔

خط ــــ — یہ علامت بھی، جو ایک چھوٹے سے خط کی صورت میں لکھی جاتی ہے، قریب قریب اسی طور استعمال کی جاتی ہے جو قوسین کا محلِ استعمال ہے۔ جیسے:
اب تو اسی تنخواہ میں ــــ وہ جتنی بھی ہے ــــ گزارہ کرنا ہوگا۔

تلخیص نگاری

تلخیص نگاری کے کچھ رہنما اصول

تلخیص کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:-

- عنوان ضرور دیں اور فقط ایک عنوان لکھیں۔ ایک عنوان سے اعتماد ظاہر ہوتا ہے اور متبادل عنوانات نہ دیں۔
- سب سے بہتر عنوان وہ ہوتا ہے جو اصل اقتباس پڑھنے کے بعد ذہن سے نکلے، بصورتِ دیگر اس ضمن میں اصل اقتباس کا پہلا یا آخری جملہ پڑھ لینا بھی سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔
- تلخیص اصل اقتباس کے ایک تہائی سے زیادہ ہرگز نہ ہونی چاہیے لیکن اس ضمن میں اصل اقتباس کے لفظوں یا جملوں کو گننا اور انھیں تین پر تقسیم کرنا بیکار کا عمل اور عبث ہے۔ اصل یہ ہے کہ تلخیص ایک تہائی ہونی چاہیے، ایک آدھ جملہ کم کیا اور زیادہ کیا۔

- تلخیص میں، جہاں تک ممکن ہو، جامع قسم کے الفاظ (One Word) کا استعمال کرنا چاہیے۔
- تلخیص میں ایک مفہوم کو دو طرح سے ادا نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک مترادف تراکیب یا مترادف مرکبات عطفی قبیل کے الفاظ مثلاً: عدل و انصاف، جرأت و ہمت، لطف و کرم اور جُود و سخا وغیرہ بھی استعمال نہیں کیے جاتے۔
- تلخیص میں تشبیہ یا مثال دینا بھی زبُوں ہوتا ہے۔
- اگر اصل اقتباس میں ایک دو اسمِ معرفہ قبیل کے الفاظ (Proper Nouns) آئے ہیں تو وہ تلخیص میں بھی ضرور آ جائیں گے۔
- اگر اصل اقتباس دو یا دو سے زیادہ ضمنی اقتباسات میں منقسم ہے تو تلخیص بہر طور فقط ایک پیراگراف کی صورت میں لکھی جائے گی۔
- اگر اصل اقتباس کے آخر میں مصنف کا نام درج ہے تو تلخیص کا پہلا جملہ اسی کے نام سے شروع ہوگا۔
- یاد رہے کہ تلخیص کا عمل دراصل تشریح کا متضاد عمل ہے یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کیا جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ تلخیص کے تمام جملے ایک دوسرے سے پیوست ہوں اور خود طبع نظر آئیں۔

پیراگراف کی تلخیص سے قبل چند جملوں کی تلخیص ملاحظہ ہو:

1- جملہ: میں نے آج تیرہ دسمبر 2021ء بروز پیر کالج میں اردو کے مضمون کا ٹیسٹ دیا۔
تلخیص: آج کالج میں ٹیسٹ دیا۔

2- جملہ: گزشتہ دنوں اتوار کے روز ہم نے اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ چڑیا گھر دیکھا۔
تلخیص: ہم نے چڑیا گھر دیکھا۔

3- جملہ: وہ صاحب جوں ہی مجھے کہیں ملتے ہیں، میں ان سے تمھارے بارے میں تفصیلی بات کروں گا۔
تلخیص: میں ان سے بات کروں گا۔

4- جملہ: جنابِ عالی! میں حقیر پُر تقصیر آپ کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔
تلخیص: مجھے آپ سے مکمل اتفاق ہے۔

❀❀

تلخیص شدہ اقتباسات

(1)

''بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا۔ ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز تو موجود ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی، آ سیائے گردشِ ایام ایک آن کے لیے رک سی گئی۔ لیکن فوراً ہی پھر رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا، نہ کھانے کو جی ہوا، جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔''

(رشید احمد صدیقی)

عنوان: علامہ اقبال ؒ کی وفات پر

تلخیص: رشید احمد صدیقی کا بیان ہے کہ علی گڑھ اسٹیشن پر اترتے ہی اقبال ؒ کی وفات کی خبر ملی۔ ایک لمحے کے لیے چکرا سا گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سناٹے اور جمود کی کیفیت طاری ہے۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو گھر پہنچا، مگر طبیعت بے حد اداس تھی، خاموشی سے لیٹ گیا۔

(2)

سرسید نے اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا۔ جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی، غدر کے زمانے تک جو کہ تقریباً بیس برس ہوتا ہے، اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل (قدرتی اسلوب) میں ہر قسم کی تحریریں کیا کتابیں، کیا مضامین، کیا مقدمات کے فیصلے اور تحریریں برابر لکھتے رہے۔ اس میں بیس سال کی مشق اور مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ ان کے قلم نے ہر مطلب کے ادا کرنے پر پیچیدہ مضمون کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہو گی۔

عنوان: سرسید کی سادہ نویسی

تلخیص: سرسید کا انداز تحریر ہمیشہ عام فہم رہا۔ مسلسل بیس سال تک وہ اپنے خیالات کو بے تکلفی کے ساتھ سیدھی سادی زبان میں بیان کرتے رہے۔ چنانچہ انھیں ہر طرح کے مشکل مطالب ادا کرنے میں بھی مہارت حاصل ہو گئی۔

(3)

سکون کا دور ہو یا انقلاب، زندگی کے ہر شعبے میں ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ انسان پہلے بھی تھا مگر حیوانات سے بہت قریب۔ تہذیب وتمدن کی جو کارفرمائیاں آج ہمارے سامنے ہیں پہلے کہاں تھیں۔ انسان صدیوں پیدل چلتا رہا، پھر کسی جانور پر سوار ہوا۔ پھر اس نے گاڑی بنائی، پھر ریل، پھر طیارہ، غاروں میں رہتے رہتے وہ عالی شان محلوں میں رہنے لگا۔ کبھی عریانی اس کا لباس تھی پھر درختوں کے پتے ستر پوش ہوئے اور اب کیسے کیسے نادر لباس اس کے پاس ہیں۔ اس کی زبان نے بھی اسی طرح ترقی کی اور کر رہی ہے۔ پہلے بولیاں بنیں پھر بولیاں زبان بن گئیں اور اس میں علم وحکمت کے صحیفے تیار ہوئے۔

عنوان: تہذیب کا ارتقا

تلخیص: زندگی میں ارتقا کا عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ انسان پہلے حیوانوں سے ممیز ہوا۔ پھر طرح طرح کی سواریاں ایجاد کیں۔ جھونپڑے محل بنے، عریانی ڈھانپنے کے لیے عمدہ لباس وضع ہوئے اور بولیاں زبانوں میں تبدیل ہو کے قیمتی ادب پاروں سے مزین ہوئیں۔

(4)

مایوسی اور ناامیدی گناہ ہے۔ آدمی کو برے حالات میں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ جرأت کا مظاہرہ کرتے رہنے سے ایک نہ ایک دن حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن آدمی ناامید ہو کر زمانے کی دوڑ سے کنارہ کش ہو جائے تو یہ اقدام بزدلی میں شمار ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو دریا کی گہرائی میں پہنچ چکا ہو تو بھی حکمت کا تقاضا ہے کہ ہاتھ پاؤں مارتا رہے۔ ممکن ہے اللہ کی رحمت سے اسے کسی تنکے کا سہارا مل جائے اور وہ بچ نکلے۔ لیکن یہ کسی اعتبار سے درست نہیں کہ آدمی معمولی ابتری میں مایوس ہو جائے اور کچھ کرنے کی بجائے حالات کا رونا روتا رہے۔

عنوان: مایوسی گناہ ہے

تلخیص: دشوار تر حالات میں بھی ہمت ہارنا بزدلی ہے۔ ہمیں تلخ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے کیوں کہ بیچ منجدھار میں بھی کوشش کرنے سے بچنے کی سبیل نکل سکتی ہے۔ رحمت خداوندی سے مایوسی گناہ کبیرہ ہے۔

(5)

''ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مُصمّم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے، اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے، جسے ترک کرنا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے، جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور کم نصیب ملک کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ

قائل ہوئے، کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترکِ شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں، وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔" (سر عبدالقادر)

عنوان :اقبال کا ارادۂ ترکِ شعر

تلخیص: سر عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک بار شیخ محمد اقبال نے ترکِ شاعری کے ارادے کا اظہار کیا تو میں نے انھیں باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کی شاعری تو قوم کے لیے بڑی مفید ہے، اسے نہ چھوڑیں۔ وہ نہ مانے مگر جب پروفیسر آرنلڈ نے میری رائے کی تائید کی تو انھیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

❁❁

تلخیص کے لیے اقتباسات

"اوّل اوّل جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں، تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آیند ہے، طرزِ ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے: ایک تو یہ کہ ان کے لیے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا۔ جب کبھی پڑھیں، لوگ اصرار کرتے ہیں کہ لَے سے پڑھا جائے اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدردان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے، اس کشش کے سبب عوام بھی کھنچ آئے۔ لاہور میں جلسۂ حمایت اسلام میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جائے، لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں، وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے، وہ بھی محو ہوتے ہیں۔" (سر عبدالقادر)

❁

"انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے ٹکڑے کیا ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انھی اصولوں کو اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لائے اور ہمیشہ کامیاب ہوئے۔ میری کیا، اس وقت

ب کی رائے یہی ہے کہ اصطلاحات بنانے میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور اب اُن کے بعد اُن کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔" (مرزا فرحت اللہ بیگ)

❁

"مولوی نذیر احمد کو محاوروں کے استعمال کا حد سے زیادہ شوق تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں، وہ محاوروں کی ٹھونس ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے کہ جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستے میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے، پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں۔ بہر حال اُن کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے اور اس کی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔" (مرزا فرحت اللہ بیگ)

❁

وہ اپنے ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا۔ ان کو پیار کرتا، جُھک جُھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھلتے پھولتے، اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ اُن کو توانا اور تناتھا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا، باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا، دن بھر اس میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچالیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا، اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

❁

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدّت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے، اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے۔ لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا۔ بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہے میں ڈال سکتا ہے مگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔

❁

شعرا کی قدر تمام دنیا میں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ سلطنتوں نے ہمیشہ ان کی قدر کی ہے اور قوموں نے ان کے دل بڑھائے ہیں۔ عرب میں شاعر قوم کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی قبیلے میں کوئی شخص شاعری میں ممتاز ہوتا تھا تو اور قبیلوں کے لوگ اس قبیلے کو آ کر مبارک باد دیتے تھے اور سب مل کر خوشیاں کرتے تھے۔ قبیلے کی عورتیں اپنے بیاہ کے زیور پہن پہن کر آتی تھیں اور فخریہ اشعار گاتی تھیں کہ ہم میں ایسا شخص پیدا ہوا، جو تمام قبیلے کی ناک رکھنے والا، ان کے نسب اور زبان کی حفاظت کرنے والا اور ان کے کارہائے نمایاں اخلاف و اعقاب تک پہنچانے والا ہے۔ شعرا کی ناز برداری یہاں تک کی جاتی تھی کہ اگر کوئی محال سوال کر بیٹھتا تو بھی صراحتاً اس کو رد نہ کیا جاتا تھا۔

❁

روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ: ''ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔''

ارسطو شاعر جس کے کلام میں مشہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے، اس کے مسودے اب تک فرریا، علاقہ اٹلی میں محفوظ ہیں۔ ان مسودوں کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو اشعار اس کے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں، وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔

ملٹن بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سخت محنت اور جاں فشانی سے نظم لکھی جاتی ہے اور نظم کی ایک ایک بیت میں اس کے سڈول ہونے سے پہلے کتنی ہی تبدیلیاں پے در پے کرنی پڑتی ہیں۔

❁

غزل کی اصلاح تمام اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور اَن پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں۔ وہ شادی بیاہ کی محفلوں میں، وجد و سماع کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی صحبتوں میں، تکیوں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے، وہ بھی غزل کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں، کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوبِ خاص و عام ہو، اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

❁

ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاتا ہے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا

کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

❁

''بعض قابلِ ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور ان کے اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جائے گی جس میں باہمی حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں! یہ بات سچ ہے، مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے، بلکہ قومی اتفاق ہے۔ ہمارے آپس میں بہ مقتضائے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو، جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے، مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ قومی بھلائی یا قومی برائی کا اثر قوم کے تمام لوگوں پر پہنچتا ہے، اس لیے جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔'' (سرسید احمد خاں)

❁

''انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصّے پائے گا: ایک حصّہ خدا کا اور ایک حصّہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو، اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے، جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سُنّی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے بھی کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جب کہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو، جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہیے۔'' (سرسید احمد خاں)

❁

اردو بلاشبہ ایک مُرکّب زبان ہے لیکن ہندی نژاد ہے، جس پر عربی، ترکی، فارسی اور انگریزی کے اثرات سب سے زیادہ ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ بنیادی عناصر کی صورت میں اس کثرت سے اور اس طرح اردو میں داخل ہو گئے ہیں کہ اب انھیں اس مُرکّب سے علیحدہ کرنا محال ہے اور شاید اسی وجہ سے اردو کا یہ مزاج بن گیا ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر آسانی سے جذب کر لیتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر شخص کے لیے ایک انجانی سی کشش ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اردو جن جن زبانوں سے مل کر بنی ہے، ان تمام زبانوں کی بیشتر خوبیاں اس میں آ گئی ہیں۔ مثلاً: ہندی میں یہ خوبی ہے کہ اس کے الفاظ نرم و

شیریں اور کومل ہیں اور ان میں ایک دل آویزی موجود ہے۔ عربی میں جو فصاحت و بلاغت ہے وہ کسی دوسری زبان میں نہیں۔ فارسی میں شیرینی کے ساتھ ساتھ ایک شان ہے۔ چنانچہ یہ تمام خوبیاں اردو میں موجود ہیں۔

❁

انسان کے اردگرد کا ماحول اس کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ صحت مند انسانوں سے صحت مند معاشرے جنم لیتے ہیں۔ صحت کی قیمت پر کوئی بھی ترقی خوش آیند نہیں ہوا کرتی۔ انسان دوستی اور پائیدار معاشرے کے شفاف تصور کے لیے ہر شخص کو، جہاں تک اس کی دسترس ہے، اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنی ضرورتیں اس طرح پوری کریں جن سے وسائل پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے آج کے آرام و آسائش کا خمیازہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔ اس کی ابتدا کا پہلا، آسان اور سب سے مناسب راستہ یہ ہے کہ ہم ماحولیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے، پانی، توانائی اور باقی چیزوں کو کفایت سے استعمال کریں۔ اگر ماحول کی تبدیلی موجودہ رفتار سے جاری رہی تو زیادہ امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے تباہ و برباد شدہ ماحولیاتی نظام ہی باقی رہ جائے گا۔

❁

”قدرت نے نواب محسن الملک کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ خطاب یا نام انکل سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ مسمّٰی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں۔ عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لیے بہت ہی موزوں نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چُھوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا تھا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہ بھولتے تھے اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی ان کے زیرِ بارِ منت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہلِ حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان افراد کو، جو ان کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں، دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا لیکن انھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقے سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے ان کے شکر گزار رہے۔“ (مولوی عبدالحق)

❁❁

علمِ بیان

تحریر وتقریر کی خوبیوں کے ذکر اور ان کی بحث کو علمِ بیان کہتے ہیں۔ اگر ہمارے طالب علم چاہتے ہیں کہ انھیں اردو زبان پر عبور حاصل ہو تو اس کے لیے انھیں علمِ بیان میں کسی قدر مہارت حاصل کرنا ہوگی تا کہ وہ اپنی تحریر وتقریر کو اہلِ زبان کی گفت گو کے مطابق کئی طریقوں سے بیان کرنے کے قابل ہو جائیں۔ علمِ بیان کی چار قسمیں ہیں: تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل اور کنایہ۔ ان اقسام کا مختصر حال ہم ذیل کی سطور میں بیان کرتے ہیں:

تشبیہ: (1) اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔

(2) اس کا چہرے غصّے سے انگارے کی طرح سُرخ ہو گیا۔

مثال نمبر (1)) میں چہرے کی سرخی کا ذکر سادہ اور عام انداز میں ہوا ہے جب کہ مثال نمبر (2) میں سرخ چہرے کو انگارے کی مانند قرار دیا گیا ہے، جس سے کلام کا حسن بڑھ گیا ہے اور اس میں خاص قسم کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ جب کسی چیز کو کسی مشترکہ صفت کی بنا پر اس کی کیفیت اور صورتِ حال کو مزید پر تاثیر اور کیف آور بنانے کے لیے کسی دوسری چیز کی مانند قرار دیا جاتا ہے تو اسے علمِ بیان کی اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔ جسے تشبیہ دیں اسے مشبّہ، جس سے تشبیہ دیں اُسے مشبّہ بہ اور وہ صفت جس کی بنا پر تشبیہ دی جائے اسے وجہِ شبہ کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کلمہ یا حرف جو مشبّہ اور مشبّہ بہ کو ملاتا ہے، حرفِ تشبیہ کہلاتا ہے۔ اس طرح تشبیہ کے چار ارکان ہوئے:

مشبّہ، مشبّہ بہ، وجہِ شبہ اور حرفِ تشبیہ

مثال نمبر 2 میں:

چہرہ	مشبّہ	انگارہ	مشبّہ بہ
سرخ	وجہِ شبہ	کی طرح	حرفِ تشبیہ ہے

محاورے اور ضرب الامثال کی طرح تشبیہ کو بھی زبان کا زیور سمجھا جاتا ہے اور اس کے استعمال سے کلام میں حسن اور خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ تشبیہات دیکھیے:

پتھر کی طرح سخت، چٹان کی مانند مضبوط، شہد جیسا میٹھا، شیر کی طرح بہادر، ریشم کی طرح نرم، دن کی طرح روشن، رات کی طرح اندھیرا، تلوار کی طرح تیز، خون کی طرح سرخ، کوئلے کی طرح سیاہ، برف کی طرح ٹھنڈا، تیر کی طرح سیدھا، سمندر کی طرح گہرا وغیرہ۔

استعارہ: (1) کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے
رَن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

(2) ماں کہتی ہے: میرا چاند آیا۔

پہلی مثال میں جرأت و ہمت کے باعث حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شیر کہا گیا ہے لیکن شعر میں ان کا مذکور نہیں۔ اسی طرح دوسری مثال میں ماں اپنے خوب صورت بیٹے کو چاند کہتی ہے اور بیٹے کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔ سب جانتے ہیں کہ شیر شجاعت کی علامت ہے اور چاند خوب صورت نظر آتا ہے مگر ہم اصلی اور مجازی معنوں کا خیال کیے بغیر بعینہٖ دوسرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو استعارہ کہتے ہیں۔

استعارہ کے لغوی معنی عاریتاً یا ادھار لینا کے ہیں مگر اصطلاح میں جب ہم کسی لفظ کو حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کریں کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ استعارہ کے تین ارکان ہوتے ہیں:

1۔ مستعارلہٗ (جس کے لیے استعارہ کیا جائے)
2۔ مستعارمنہٗ (جس سے استعارہ لیا جائے)
3۔ وجہِ جامع (مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ میں مشترک صفت)

استعارے میں مستعارلہٗ کا ذکر نہیں ہوتا، یہی اس کا امتیاز ہے۔ اسی طرح مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ میں مشترک صفت کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ مثلاً دوسری مثال میں:

بیٹا — مستعارلہٗ (ذکر نہیں ہے)
چاند — مستعارمنہٗ
خوب صورتی — وجہِ جامع (ذکر نہیں ہے)

استعارے کی یہ خوب صورت مثال ملاحظہ کیجیے:

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

مولانا حالی نے اس شعر میں مرزا غالب کے لیے روشن دماغ اور چراغ کا استعارہ استعمال کیا ہے لیکن مرزا غالب کا نام کہیں بھی نہیں آیا۔ یہی استعارے کا امتیاز ہے۔

مجازِ مرسل: (1) آپ "الحمد" سنائیں۔ (جزو سے کل)

(2) میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ (کل سے جُز)

(3) ایک گلاس پی لو۔ (ظرف سے مظروف)

(4) پانی لے آؤ۔ (مظروف سے ظرف)

پہلے جملے میں "الحمد" کہہ کر پوری سورۂ فاتحہ مراد ہے یعنی جز کہہ کر کل مراد لیا گیا ہے۔ دوسرے جملے میں "میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں" چونکہ کانوں کے اندر انگلی کا کچھ حصہ ہی جا سکتا ہے، اس لیے کل کہہ کر جز مراد لیا گیا ہے۔ تیسرے جملے میں "گلاس" سے مراد پانی ہے، جو گلاس کے اندر موجود ہے یعنی ظرف کہہ کر مظروف مراد لیا گیا ہے۔ اسی طرح چوتھے جملے میں پانی سے مراد وہ برتن ہے جس کے اندر پانی ہے یعنی مظروف کہہ کر ظرف مراد لیا گیا ہے۔ یہ سب مجازِ مرسل کی صورتیں ہیں۔ اس طرح مجازِ مرسل کی بہت سی صورتیں روزمرہ بول چال میں آتی ہیں۔ گویا مجازِ مرسل کی جامع تعریف یہ ہوئی:

"جب کوئی لفظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال ہو کہ اس میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو تو اسے مجازِ مرسل کہتے ہیں۔" مجازِ مرسل کی تین مثالیں مزید ملاحظہ کیجیے:

(1) نہر بہ رہی ہے۔

(2) آسمان سے سونا برس رہا ہے۔

(3) قلم تلوار سے طاقت ور ہے۔

❁

کنایہ: کنایہ لغت میں پوشیدہ بات کو کہتے ہیں مگر علمِ بیان کی اصطلاح میں ایسے کلمے کو کہتے ہیں جس سے غیر حقیقی معنی مراد ہوں اور اگر حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو بھی جائز ہوں۔ جیسے:

ہاتھوں کے طوطے اڑنا سے حیران ہونا مراد ہے اور خاک بسر ہونا سے کچھ نہ رہنا مراد ہے۔ اسی طرح گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے، کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں سخی انسان رہتا ہے۔

کنائے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک کنایہ قریب اور ایک کنایہ بعید ہے۔ کنایہ قریب تو تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد جلد ہی سمجھ میں آ جاتا ہے مگر کنایہ بعید غور و فکر کے بعد ہی ذہن میں آتا ہے۔

کنایہ کی دو مثالیں مزید ملاحظہ کیجیے۔

(1) اسلم شترِ بے مہار ہے۔

(2) امجد پیٹ کا ہلکا ہے۔

پہلی مثال میں شترِ بے مہار کے اصلی معنی ہیں وہ اونٹ جس کی نکیل نہ ہو اور وہ بلبلاتا پھرتا ہے۔ کنایہ یہ ہے کہ بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ دوسری مثال میں پیٹ کا ہلکا کے اصلی معنی ہیں ہلکے پیٹ والا آدمی، جس کے پیٹ میں کوئی چیز نہ ٹھہرے مگر یہ کنایہ ہے کہ وہ راز کی بات جلد اگل دینے والا ہے۔

اس طرح کنایہ علمِ بیان کی بہت اچھی صورت ہے۔ جس سے تحریر و تقریر میں لطف پیدا ہوتا ہے۔

❀❀

علمِ بدیع

بدیع کے لغوی معنی تو نادر، انوکھا یا نئی چیز کے ہیں لیکن اصطلاح میں علمِ بدیع اس علم کو کہتے ہیں جس سے تحسین و تزئینِ کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں: صنائع لفظی اور صنائع معنوی یعنی لفظوں کے لحاظ سے نِکات اور باریکیاں بیان کرنا۔ صنائع لفظی و معنوی کا بیان بڑا تفصیل طلب ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ذیل میں ان کی چند معروف اقسام اختصار کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں:۔

صنعتِ تضاد: اگر کسی شعر میں ایک دوسرے کے متضاد یا الٹ لفظ استعمال کیے جائیں تو اسے صنعتِ تضاد کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

مری قدر کر اے زمینِ سخن!
کہ بات میں تجھے آسماں کر دیا

زمین اور آسمان متضاد الفاظ ہیں۔

صنعتِ تلمیح: تلمیح کے لغوی معنی ہیں اشارہ کرنا۔ ادب کی اصطلاح میں کلام میں کسی مشہور قصے، واقعے، شخصیت، داستان یا روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کا تفصیلی بیان کتاب میں پہلے آچکا ہے۔ ایک مثال مزید ملاحظہ کیجیے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس شعر میں ''ابنِ مریم'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے جو مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

صنعتِ ایہام: ایہام کے لغوی معنی وہم میں ڈالنا یا چھپانا کے ہیں۔ صنعتِ ایہام یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک قریب کے اور دوسرے بعید کے۔ متکلم بعید کے معنی مراد لے۔ مثلاً:

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کرکے

''خدا خدا کر کے'' کے ایک معنی تو خدا کو یاد کرنا ہے اور دوسرے معنی ہیں بڑی مشکل سے۔ یہاں شاعر کی مراد دوسرے معنوں سے ہے۔

صنعتِ لف ونشر: اصطلاح میں صنعتِ لف ونشر کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے کچھ چیزوں کا ذکر کیا جائے اور پھر انھی چیزوں سے مناسبت رکھنے والی چیزوں کا ذکر بھی کیا جائے۔ پہلے جز کا نام لف اور دوسرے کا نام نشر ہوگا۔ ایک مثال یہ ہے:

ایک سب آگ ، ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

پہلے آگ اور پانی کا ذکر ہے اور پھر ان سے مناسبت رکھنے والی چیزوں دل اور دیدہ کا ذکر ہے۔

صنعتِ مراعاتِ النظیر: مراعات النظیر اس صنعت کاری کا نام ہے جس کے ذریعے کلام میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جو ایک ہی رعایت یا ایک ہی قبیل کے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ مثال ملاحظہ کیجیے:

غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پُر فشاں ہو جا

غبار، آلودہ، بال، پر، مرغ اور اڑنا کے الفاظ میں خاص رعایت ہے۔

صنعتِ مبالغہ: کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن سے مبالغے کا پہلو نکلتا ہو تو ایسی صنعت کو صنعتِ مبالغہ کہتے ہیں۔ مثلاً میر انیس، میدانِ کربلا میں گرمی کی شدّت کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
ماہی جو سیخِ موج تک آئی ، کباب تھی

دانے کا زمین پر گرتے ہی بھُن جانے اور مچھلی کے لہروں کی سیخوں میں پرو کر کباب بننے میں مبالغہ ہے۔

صنعتِ حسنِ تعلیل: شاعری کی ایسی صنعت ہے جس میں شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علّت (وجہ) فرض کر لیتا ہے جو درحقیقت اس کی علّت نہیں ہوتی مگر اس پر باور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً میر انیس کا یہ شعر دیکھیے:

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

دریائے فرات کی موجیں ساحل سے اس لیے سر نہیں پٹکتی تھیں کہ انھیں سپاہِ خدا کا غم تھا بلکہ یہ تو مظہرِ قدرت ہے کہ موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔

تفہیمِ عبارت

ابلاغ میں زبان بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اس سلسلے میں طلبہ کی زبان دانی کی قوت واخذ کا جائزہ لینے کے لیے نصاب کے علاوہ کسی بھی تحریر، مضمون یا نظم کا کوئی اقتباس دے دیا جاتا ہے جس کے حوالے سے چند سوالات ترتیب دے کر طلبہ سے درست جواب کے گرد دائرہ لگانے کو کہا جاتا ہے، جس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ طلبہ نادیدہ اقتباس کے مفہوم کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔اس ضمن میں درج ذیل باتوں کو پیشِ نظر رکھیے:

1- سب سے پہلے عبارت کو ایک دو مرتبہ غور سے پڑھیے اور عبارت کے مفہوم اور نفسِ مضمون کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

2- پوچھے گئے تمام سوالوں کے جواب بالعموم عبارت کے اندر ہی موجود ہوتے ہیں، جو ذرا سی سوچ بچار کے بعد ذہن میں آ جاتے ہیں۔

3- اگر بفرضِ محال کسی سوال کا جواب عبارت میں موجود نہیں تو ایسی صورت میں عبارت کے مجموعی نفسِ مضمون پر غور کر کے جواب دیجیے۔

4- تمام جواب عبارت کے مطابق ہوں۔حقائق کو مسخ مت کیجیے اور ایک ہی درست ترین جواب کے گرد دائرہ لگایے۔

5- اگر عبارت کا عنوان بھی پوچھا گیا ہے تو یاد رکھیے کہ سب سے بہتر عنوان وہ ہوتا ہے جو اصل عبارت کے مجموعی تاثر کو ظاہر کرتا ہے یا اصل عبارت ہی میں موجود ہوتا ہے۔

آیندہ صفحات میں ہم نے طلبہ کی مزید رہنمائی کے لیے نمونے کے دو تین اقتباس اور معروضی انداز کے سوال لکھ دیے ہیں، ان میں سے ایک جواب صحیح ترین ہے۔طلبہ انھیں بغور پڑھیں۔اگر درست جواب تلاش کرنے میں تذبذب محسوس کریں تو باب کے آخر میں درست جوابات لکھ دیے گئے ہیں۔ان سے رہنمائی حاصل کریں۔

❁

(1) عبارت

”تعلیمی نصاب میں علاقائی شخصیتوں کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ ان کو پورے پاکستان کے لوگ اپنی عظمتوں کی فہرست میں شامل کریں۔خوشحال خان خٹک صرف پشتونوں کے ہی ہیرو کیوں ٹھہرائے جائیں، کیوں نہ پورا پاکستان ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھے؟ زبان کا مسئلہ بھی اسی طرح سوچا جا سکتا ہے۔مقامی زبانوں کے باوجود مرکزی قومی تحفظ اور فروغ کو تمام علاقوں کے

لوگ اپنا فریضہ خیال کریں۔ اردو زبان ڈیڑھ سو سال تک دورِ غلامی میں مسلمانانِ ہند کی وحدت کا نشان رہی ہے۔ اس کے لیے اجتماعی احساسات بھرپور طریقے سے ظاہر ہوئے ہیں۔ بڑا ستم ہوگا اگر اب علاقائی تعصب میں آ کر ہم وحدت کے اس نشان کو ضائع کردیں۔"

سوالات

-1 خوشحال خان خٹک کس زبان کے شاعر ہیں؟

(A) پنجابی (B) سرائیکی (C) پشتو (D) بلوچی

-2 قومی زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے کس کو کوشش کرنی چاہیے؟

(A) سب لوگوں کو (B) پنجاب کے لوگوں کو (C) بڑے شہروں کے لوگوں کو (D) سب علاقوں کو

-3 خوشحال خان خٹک کو ہم کون سا درجہ دے سکتے ہیں؟

(A) قومی لیڈر کا (B) قومی شاعر کا (C) قومی رہنما کا (D) قومی ہیرو کا

-4 اردو زبان کتنے عرصے تک برِصغیر کے مسلمانوں کی وحدت کا نشان رہی؟

(A) ایک سو سال (B) ڈیڑھ سو سال (C) دو سو سال (D) ڈھائی سو سال

-5 اس پیراگراف کے لیے کون سا عنوان موزوں ہے؟

(A) خوشحال خان خٹک (B) زبان کا مسئلہ (C) قومی زبان (D) علاقائی تعصب

عبارت (2)

"دوستی، کسی معاہدے کا نام نہیں اور نہ معاہدوں کی دوستی کبھی کامیاب ثابت ہوسکتی ہے، نہ وفاداری اور خلوص کے قول وقرار کسی کام کے ہیں۔ دوستی کی صحیح اور جامع تعریف یہ ہے کہ آدمیوں کے ذہنی اور اخلاقی معاملات میں ایک طرح کی یکسانیت اور توافق پیدا ہوجائے۔ یہ توافق جتنا ایک دوسرے کے زیادہ قریب، زیادہ ہم آہنگ ہوگا، اتنے ہی دوستانہ تعلقات بھی زیادہ مضبوط، زیادہ دیرپا ہوں گے۔ جن لوگوں کے ذہنی، اخلاقی اور معاشی حالات یکساں نہیں اور جن میں اختلاف زیادہ ہے، وہ اپنی روحوں کو ہم آہنگ نہیں کرسکیں گے۔ ایک کامیاب دوستی کے متمنی کو دیکھنا چاہیے کہ وہ جس آدمی کو اپنا دوست بنانا چاہتا ہے، اس کے حالات کی سطح کیسی ہے؟ سطح برابر ہو تو بہتر ورنہ بالعموم ایسی دوستی کے حصول پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ایک قدرتی ساجذبہ ہے کہ جس آدمی کو ہم اپنا دوست سمجھتے ہیں یا بناتے ہیں، اُس کے ساتھ اپنی بہت سی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ دوستی جتنی گہری ہو، امیدیں بھی اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔ ہماری بعض امیدوں کا پورا کرنا بعض دفعہ ہمارے دوست کے امکان ہی میں نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں ہماری امیدیں ہی ناجائز ہوتی ہیں۔"

سوالات

-1 اس عبارت کے لیے کون سا عنوان موزوں ہو سکتا ہے؟

(A) دوستی (B) اختلاف رائے (C) دوستی کے اصول (D) بھائی چارہ

-2 دوستی کے لیے معاشی حالات کی سطح کا یکساں ہونا کس قدر اہم ہے؟

(A) بہت زیادہ (B) زیادہ (C) بالکل نہیں (D) بہت کم

-3 ایک کامیاب دوستی کے لیے کیا بات مدِ نظر رکھنی چاہیے؟

(A) وفاداری (B) ذہنی ہم آہنگی (C) قول و قرار (D) معاشی ہم آہنگی

-4 جن لوگوں کی اخلاقی سطح کا معیار ایک جیسا ہوتا ہے، ان کی دوستی؟

(A) بہت گہری ہوگی (B) گہری ہوگی (C) نہیں ہوگی (D) بالکل نہیں ہوگی

-5 دوستوں سے امیدیں وابستہ کرنی چاہئیں؟

(A) بہت زیادہ (B) بالکل نہیں (C) بہت کم (D) ہمیشہ

❀

عبارت (3)

"اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی، ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا، جب ان سے ملتے تو ان کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں، جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں، ان کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آ سکتے ہیں، ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں، مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!"

سوالات

-1 سب سے بڑھ کر تعلیم کیا ہے؟

(A) نیکی اور بدی میں فرق سمجھانا (B) علم وفضل ظاہر کرنا (C) رعب دبدبے سے بات کرنا (D) حسن سلوک سے پیش آنا

-2 نکتہ چیں کیا کیے بغیر نہیں مانتے؟

(A) غیبت (B) عیب گیری (C) چغلی کھائے (D) فضول باتیں

-3 اخلاق کہاں سیکھا جاسکتا ہے؟

(A) پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں (B) والدین کے ہاں (C) اساتذہ سے (D) کتابوں سے

-4 دنیا میں پندونصائح کی کس قدر کمی ہے؟

(A) بہت کمی ہے (B) کوئی کمی نہیں (C) زیادہ کمی نہیں (D) شاید کمی ہے

-5 دنیا اچھوں سے کب خالی ہوتی ہے؟

(A) کبھی نہیں (B) کبھی کبھی (C) ہمیشہ (D) ہمیشہ نہیں

❁

(4)عبارت

انسان کے اردگرد کا ماحول اس کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ صحت مند انسانوں سے صحت مند معاشرے جنم لیتے ہیں۔ صحت کی قیمت پر کوئی بھی ترقی خوش آیند نہیں ہوا کرتی۔ انسان دوستی اور پائدار معاشرے کے شفاف تصور کے لیے ہر شخص کو، جہاں تک اس کی دسترس ہے، اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ چناں چہ ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنی ضرورتیں اس طرح پوری کریں جن سے وسائل پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے آج کے آرام وآسائش کا خمیازہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔ اس کی ابتدا کا پہلا آسان اور سب سے مناسب راستہ یہ ہے کہ ہم ماحولیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے پانی، توانائی اور باقی سب چیزوں کو کفایت سے استعمال کریں۔ اگر ماحول کی تبدیلی موجودہ رفتار سے جاری رہی تو زیادہ امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے تباہ و برباد شدہ ماحولیاتی نظام ہی باقی رہ جائے گا۔

سوالات

-1 کیسا ماحول فطرت کا عکاس ہوتا ہے؟

(A) دیہات کا (B) انسان کے اردگرد کا (C) خوب صورت وادیوں کا (D) جنگل ویرانے کا

-2 کوئی ترقی خوش آیند کب ہوتی ہے؟

(A) ہمیشہ (B) ہر حال میں (C) صحت کی قیمت پر (D) صحت کی قیمت پر نہیں

-3 ہم اپنی ضرورتیں کیسے پوری کریں؟

(A) وسائل کے استعمال کے بغیر (B) وسائل پر کم سے کم بوجھ ڈال کر

(C) وسائل کا بے تحاشا استعمال کر کے (D) وسائل کا نصف استعمال کر کے

-4 ہم اپنے ماحول کو آلودگی سے کیسے بچا سکتے ہیں؟

(A) بہتات سے درخت لگا کر (B) شمسی توانائی کے ذریعے

(C) پانی کو آلودگی سے بچا کر (D) ماحولیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کر کے

-5 اگر ماحول کی تبدیلی موجودہ رفتار سے جاری رہی تو ماحول برباد ہونے کا کس قدر امکان ہے؟

(A) زیادہ امکان ہے (B) معمولی امکان ہے (C) بالکل امکان نہیں (D) کسی قدر امکان ہے

❁

عبارت (5)

مسجد اس ''عروس البلاد'' کا دل تھی۔ اندر قدم دھرتے ہی اس کی عظمت کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ لاتعداد ستون اور محراب حجم اور پائے داری کا تاثر دیتے ہیں۔ ان کی حسنِ ترتیب سے مسجد کی دل کشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ وسعت کا تقاضا تھا کہ مسجد بلند بام ہو، اونچی چھت اور ستونوں کی کثرت سے بے پایاں کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ مسجد کی خوب صورتی، اس کی سادگی اور پہنائی میں پنہاں ہے۔ اطراف میں نظر بے محابا دوڑتی ہے۔ سنگِ یشب، سنگِ موسیٰ، سنگِ سرخ کے ستونوں کی طویل روشیں، ملگجے سایوں میں کھو جاتی ہیں۔ چار سُو ایک حسین جھٹپٹا ہے۔ اَن جانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے۔

سوالات

-1 مسجد کی عظمت کا نقش کس پر ثبت ہوتا ہے؟

(A) دماغ پر (B) ذہن پر (C) دل پر (D) دل و دماغ دونوں پر

-2 لاتعداد ستون اور محراب کس چیز کا تاثر دیتے ہیں؟

(A) حجم کا (B) پائے داری کا (C) حجم اور پائے داری کا (D) عظمت کا

-3 کس بات کا تقاضا تھا کہ مسجد بلند بام ہو؟

(A) محرابوں کا (B) ستونوں کا (C) فراخی کا (D) وسعت کا

-4 مسجد کی تعمیر میں کتنی قسم کے پتھر استعمال ہوئے ہیں؟

(A) دو قسم کے (B) تین قسم کے (C) چار قسم کے (D) کئی قسموں کے

-5 مسجد میں روشنی کہاں سے آتی ہے؟

(A) روشن دانوں سے (B) کھڑکیوں سے (C) دروازوں سے (D) ان جانے گوشوں سے

❁

درست جوابات

(1) عبارت	C-1	D -2	D -3	B -4	D -5
(2) عبارت	C-1	B -2	B -3	A -4	C -5
(3) عبارت	D-1	B -2	A -3	B -4	A -5
(4) عبارت	B-1	C -2	B -3	C -4	A -5
(5) عبارت	A-1	C -2	D -3	B -4	D -5

❁

(6)عبارت

''مختلف انسان مختلف زبانیں بولتے ہیں۔زبانوں کو ان کے ماہروں نے مختلف خاندانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ان میں دو خاندان بہت مشہور ہیں: ایک سامی اور دوسرا آریائی۔سامی خاندان میں عربی اور عبرانی وغیرہ شامل ہیں۔آریائی خاندان میں نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کی بہت سی زبانیں شامل ہیں بلکہ یونانی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کا شمار بھی اسی خاندان میں ہوتا ہے۔دراصل آریائی خاندان زبانوں کا بہت بڑا خاندان ہے اور اس سلسلے کا کوئی دوسرا خاندان اس کی وسعت کی برابری نہیں کر سکتا۔زبانوں کے آریائی خاندان کی شعاعیں پاکستان، ہندوستان، ایران، انگلستان اور یورپ کے مختلف ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں۔''

سوالات

-1 زبانوں کے ماہرین نے زبانوں کو کتنے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے؟

(A) پانچ خاندانوں میں (B) تین خاندانوں میں (C) صرف دو خاندانوں میں (D) مختلف خاندانوں میں

-2 زبانوں کا ایک خاندان سامی ہے، دوسرا کون سا ہے؟

(A) لاطینی (B) عربی (C) آریائی (D) عبرانی

-3 ہماری قومی زبان اردو کا تعلق کس خاندان سے ہے؟

(A) سامی (B) آریائی (C) لاطینی (D) عبرانی

-4 عربی اور انگریزی کا تعلق ایک ہی خاندان ہے۔وہ کون سا خاندان ہے؟

(A) آریائی (B) سامی (C) لاطینی (D) عبرانی

-5 اس پیراگراف کا عنوان کیا ہونا چاہیے؟

(A) زبان دان (B) قومی زبانیں (C) زبانوں کے خاندان (D) ہم اور ہماری زبان

❀❀

عبارت (7)

"ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفت گو کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں، ان کی دل کھول کر داد دی ہے، مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لاہور میں کرنل ہالرائیڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے، ان میں آزاد اور حالی نے طبع آزمائی کی۔ برکھارت، حبِ وطن، نشاطِ امید اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ آزاد اپنے رنگ میں بے مثال نثار ہیں مگر شعر کے کوچے میں اُن کا قدم نہیں اٹھتا، لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے کہ کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھا ہے۔"

سوالات

-1 اس عبارت میں مولانا سے کون مراد ہیں؟

(A) مولانا شبلی نعمانی (B) مولانا حالی (C) مولانا محمد حسین آزاد (D) کوئی جواب درست نہیں

-2 مولانا کس عیب سے بری تھے؟

(A) غیبت سے (B) دروغ گوئی سے (C) بے انصافی سے (D) رقابت سے

-3 جدید رنگ کے مشاعرے کس کی زیرِ ہدایت ہوئے؟

(A) کرنل ہالرائیڈ (B) کرنل جانسن (C) کرنل آرنلڈ (D) کرنل ایڈورڈ

-4 اس عبارت میں مولانا کی کون سی تین نظموں کا ذکر آیا ہے؟

(A) برکھارت، حب وطن، رحم و انصاف (B) برکھارت، حبِ وطن، نشاطِ امید

(C) برکھارت حب وطن، مناجات بیوہ (D) برکھارت، حبِ وطن، مسدسِ حالی

-5 نثار کے معنی کیا ہیں؟

(A) قربان ہونے والا (B) نثر نگار (C) مضمون نگار (D) شاعر

(8)عبارت

''قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ قائداعظم ؒ کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے لیکن قائداعظم ؒ نے اپنی بصیرت اور محنت سے ان سازشوں کو خاک میں ملا دیا اور ایک ملک، ایک قوم، ایک معاشرے اور ایک تہذیب کی ایسی تعمیر کی اور عوام میں ایک ایسا جوش اور جذبہ پیدا کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں اس زمانے میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ قائداعظم ؒ کی بصیرت، آہنی عزم وارادہ اور جذب وجنون نے تعمیرِ ملت کے لیے جو کچھ کیا وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے حد درجہ ناسازگار حالات میں ایک ملک بنایا، ایک قوم کی تعمیر کی، ایک نئے معاشرے اور ایک نئی تہذیب کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس کی بدولت نہ صرف برعظیم پاکستان و ہند اور عالمِ اسلام کا نقشہ بدلا بلکہ ساری دنیا میں سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری اعتبار سے ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی جس کو ایک معجزہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔''

سوالات

-1 کون سا زمانہ قائداعظم ؒ کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا؟

(A) الیکشن کا زمانہ (B) قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ (C) انگریزوں کی حکومت کا زمانہ (D) قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ

-2 قائداعظم ؒ نے اپنی بصیرت اور محنت سے کس چیز کی تعمیر کی؟

(A) تعمیرِ ملت (B) تعمیرِ ملک (C) تعمیرِ وطن (D) تعمیرِ عمارت

-3 قائداعظم ؒ کی عظیم جدوجہد کو کیا نام دینا بے جا نہیں؟

(A) کرشمہ (B) کرامت (C) معجزہ (D) حیرت

-4 عوام کے جوش وجذبہ کی ایسی مثال کہاں نہیں ملتی؟

(A) تاریخ میں (B) جغرافیہ میں (C) ادبِ عالیہ میں (D) کسی زبان میں

-5 مصنف کس کے بارے میں اکثر سوچتا تھا؟

(A) پاکستان کے بارے میں (B) قائداعظم ؒ کے بارے میں (C) مسلمانوں کے بارے میں (D) برصغیر کے بارے میں

❀❀

عبارت (9)

اس وقت ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ عدمِ مساوات ہے، باقی تمام مسائل اسی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ہم پاکستان کو مملکتِ اسلامیہ قرار دیتے نہیں تھکتے اور دوسری جانب مغربی جمہوریت ہماری نظروں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے ہزاروں اختلاف رکھنے کے باوجود سماجی مساوات کے نکتے پر اتفاق کرتے ہیں۔ ایک طرف گورے، کالے، عربی، عجمی، خلیفہ و بدو، محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب بڑی بڑی سپر پاوروں کے حکمران سائیکل پہ سواری کرتے اور بازار سے سبزی خریدتے نظر آتے ہیں، لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ساڑھے چھے دہائیوں سے کسی ایک نظام کو مکمل طور پر متعارف یا نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، جس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے ہاں کی نسل در نسل منتقل و مضبوط ہوتی وڈیرہ شاہی اور غریبوں کے خون پہ پلتی سرمایہ داری ہے۔

سوالات

سوال نمبر 1۔ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

(A) عدمِ تحفظ (B) عدمِ اتفاق (C) عدمِ مساوات (D) عدمِ برداشت

سوال نمبر 2۔ ہماری نظروں کو کس چیز نے خیرہ کیا ہوا ہے؟

(A) مغربی ثقافت (B) مغربی موسیقی (C) مغربی جمہوریت (D) مغرب ادب

سوال نمبر 3۔ مغربی اور مشرقی نظام کس نکتے پر اتفاق کرتے ہیں؟

(A) سماجی سوچ (B) سماجی رنگ (C) سماجی مسائل (D) سماجی مساوات

سوال نمبر 4۔ بڑی بڑی سپر پاوروں کے حکمران کس کی سواری کرتے ہیں؟

(A) گھوڑے کی (B) سائیکل کی (C) کار کی (D) جہاز کی

سوال نمبر 5۔ درج بالا پیراگراف کا عنوان ہے:

(A) عدمِ مساوات (B) معاشرتی مسائل (C) سرمایہ داری (D) المیہ

❁❁

عبارت (10)

تاریخ شاہد ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی طرح اردو طنز و مزاح پہ بھی کئی بار پیغمبری وقت آیا اور ہر بار اس نے: "پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں" کے مصداق استقامت پکڑی۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ اردو کی سرزمین پہ طنز و مزاح کا بیج آج سے ساڑھے تین سو سال قبل جنم لینے والے میر جعفر زٹلی نے کاشت کیا تھا، جو اپنی ساری ذہانت و فطانت کے باوجود یہ اندازہ نہ کر سکا کہ برِ عظیم کی آمرانہ و شاطرانہ آب و ہوا ابھی اس لطیف و لذیذ پودے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کے ہاں تخت کشی کا روایتی سلسلہ جاری تھا۔ ان کثیف حالات میں شاعرِ خوش گفتار کی شوخی و حق گوئی کو خود سری و سرکشی پر محمول کیا گیا اور اردو دنیا کے پہلے مزاح نگار کو راج ہٹ سے جنم لینے والی احمقانہ وسفاکانہ "تسمہ کشی" کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

اس طرح جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں برِ عظیم میں آزاد میڈیا کے اولین علم بردار کا خونیں انجام ہندوستان کے ادبی ماحول کو کامل سوگوار بنا گیا۔ خدائے سخن میر تقی میر کا یہ استفسار کسی ایسے ہی قومی و علمی سانحے کی کوکھ سے پھوٹا دکھائی دیتا ہے:

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

سوالات

1- پیغمبری وقت کس پہ آیا؟
(A) ہر پیغمبر پہ (B) طنز و مزاح پہ (C) تاریخ پہ (D) پاکستان پہ

2- اردو میں طنز و مزاح کا بیج کاشت کیا:
(A) پطرس بخاری نے (B) مرزا غالب نے (C) جعفر زٹلی نے (D) ایک کسان نے

3- اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں میں کون سا سلسلہ جاری تھا؟
(A) خودکشی کا (B) رسہ کشی کا (C) وراثت کا (D) تخت کشی کا

4- آزاد میڈیا کے اولین علم بردار کا کیسا انجام ہوا؟
(A) خونیں (B) خوفناک (C) خوش گوار (D) باعثِ عبرت

5- کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی یہ شعر کس کا ہے؟
(A) میر انیس (B) خواجہ میر درد (C) میر تقی میر (D) میر سوز

آٹھواں باب

اردو زبان اور ابلاغ

Communication and Urdu Language

''ابلاغ'' کے معنی، سمجھنا، سمجھانا، پہچانا یا بھیجنا کے لیے جاتے ہیں۔ ادبی اور اصطلاحی طور پر یہ لفظ عموماً، اپنے خیالات، افکار اور احساسات و تاثرات، دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

انسان روزِ ازل سے اپنے عمل، آواز، حرکات و سکنات سے دوسروں کو متاثر کرتا رہا ہے۔ اپنے احساسات و جذبات کی ترسیل کو بھی ابلاغ قرار دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اشاروں، کنایوں اور آواز کے علاوہ لفظوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

شاعر، ادیب اور لکھنے والے اپنے اردگرد کے حالات، واقعات، مشاہدات، اپنے باطنی احساسات، جذبات اور اپنی تخلیقات میں اس طرح سموتے ہیں کہ قاری بھی اُس سے کیف و انبساط حاصل کرتا ہے۔ شاعری کا ذوق رکھنے والے اشعار سے دل کی کیفیات بھانپ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو کوئی شعر یا مصرع، دل کی کیفیت کو زیادہ مؤثر طریقے سے دوسروں پر واضح کر دیتا ہے:

ے میرا احوال پوچھنے والے
میری صورت نظر نہیں آتی

گویا انسان صورت دیکھ کر بھی دل کے حال سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ پھر شعروں میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ سے احساسات و جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ بعض اوقات بہت باریک بات بھی شعر میں ڈھل کر پُر لطف بن جاتی ہے:

ے نظر ٹھہرتی نہیں ہے کہ اُس کے عارض کو
نظر بھی چھو لے تو اُس پر نشان پڑتا ہے

کہتے ہیں، آنکھیں بھی کلام کرتی ہیں۔ جاننے والے آنکھوں سے دل کی کیفیات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

ے جس کی آنکھیں کلام کرتی تھیں
یاد ہے اُس کی بات بات مجھے

شعر کا مفہوم آپ پر واضح ہو گیا تو ہم کہیں گے کہ آپ پر شعر کا ''ابلاغ'' ہو گیا ہے۔

ابلاغ سے مراد لفظوں، رنگوں اور صوتی کیفیات کا اظہار ہے۔ ابلاغ کی کئی صورتیں ہیں:

1۔ اشاروں کنایوں سے اظہار　　2۔ آواز کے ذریعے اظہار　　3۔ لفظوں سے اظہار

مسکراہٹ، آنکھوں کی حرکات و سکنات، ہاتھ ہلا کر، سر کو جنبش دے کر، ہوا میں مُکا لہرا کر، انگلیوں سے وکٹری نشان بنا کر،

مختلف رنگوں کو دکھا کر، بہت سے اشارے جنم لیتے ہیں اور ان کا بھی ایک مفہوم ہوا کرتا ہے۔ اشاروں کی باقاعدہ ایک زبان ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا گونگے، بہروں کو آنکھ اور ہاتھ کے اشاروں سے بات سمجھائی جاتی ہے۔

آواز، عطیۂ خداوندی ہے۔ انسان اپنی آواز سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے شعرا آواز سے تصویر بنانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ جان کاشمیری نے کیا خوب کہا ہے:

پسِ پردہ بھی تکلم سے گریزاں رہنا
لوگ آواز کی تصویر بنا لیتے ہیں

یا پھر میر تقی میر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی گا کر بھی کی جاتی ہے۔ انسان ہی نہیں پرندے بھی گاتے ہیں۔ سننے والے تو ہواؤں کے گیت بھی سُن لیتے ہیں۔ شاخ پر جھولتا اور جھومتا پھول، بلبل کی خوش الحانی سے لطف اٹھاتا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دلوں پر غم اور خوشی کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں آواز سے کام لیا جاتا ہے۔ گفتگو، مکالمہ، تقریر، بحث و تکرار کی صورتوں میں بھی انسان اپنے باطن کا اظہار کرتا ہے اور سننے والے ہر ادا سے متاثر ہوتے ہیں۔

جدید دور میں ذرائع ابلاغ کی کئی شکلیں سامنے آچکی ہیں۔ ترسیل اظہار کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم، وائرلیس کے بعد سمارٹ موبائل نے تو اظہار کی تازہ دم صورتیں فراہم کردی ہیں۔

آواز کو الفاظ کا جامہ پہنا دیں تو اظہار کی ایک اور جہت نمایاں ہوتی ہے۔ گویا زبانی ابلاغ کی دوسری صورت تحریری ابلاغ قرار پائی۔ اس میں ہمارے ادب کا ذخیرہ بھی شامل ہوتا ہے۔ شاعری، افسانہ، ڈراما، مضامین سبھی اظہار کے وسیلے ہیں۔ ہر عہد کے ادب کا ایک مسئلہ ابلاغ بھی ہوتا ہے مگر ہر شعر، ہر شخص کے ذوق، معیار پر پورا نہیں اترتا۔

انسان اپنے آس پاس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر موسموں کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ گرمی، سردی، بہار، خزاں اور برسات میں اس کی کیفیات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ حُسن اور جمالیات اُس کے دل کو تسکین دیتے ہیں۔ دھوپ، بادل، ہوائیں، پہاڑ، دریا، چاند، سمندر، پھول، سرسبز و شاداب مناظر ہوں یا رات کا پُرہول سناٹا، خوف، دہشت، طوفان، زلزلے، ایک ایک چیز سے انسان متاثر ہوتا ہے اور جب یہ سب کچھ کسی ادب پارے یا شعر میں ڈھل کر اس کے دل کی ترجمانی کرنے لگے تو وہ اس فن پارے سے حظ اٹھاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

شاعر اپنے قلبی احساسات، جذبات کو کسی بھی صورت میں لفظوں میں ڈھال کر ایک تصویر بنا دیتا ہے۔ ایک تخلیق کار جب اپنے باطنی احساسات اور جذبوں کو فن میں سموتا ہے تو وہ قارئین کے دلوں کو چھو لیتا ہے۔

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

شاعر، ادیب اپنی باطنی دنیاؤں کو فن میں ڈھال کر اَمر کر دیتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے، جذبے اور فکر کو لفظوں کا ایسا روپ دیتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے، بے اختیار واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔ شاعر کا مشاہدہ دوسروں کے دلوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ یوں شعر بھی ذات سے کائنات میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

شعر و ادب کا ابلاغ، قاری کے فہم و ادراک، تعلیم اور مشاہدے سے بھی ہوتا ہے۔

پس اشاروں، کنایوں اور آواز کے ابلاغ کی قدر و قیمت مسلّم مگر الفاظ و معانی کی تحریری صورت یا لفظی ابلاغ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس وقت ابلاغ و اظہار کی درج ذیل شکلیں زیادہ نمایاں ہیں:

خطوط، ٹیلی فون، فیکس، ای میل، موبائل، ایس ایم ایس، فیس بک، فیس ٹائم، ٹویٹر، وائبر، میسنجر، انسٹا گرام، سکائپ، اخبار، رسائل و جرائد اور کتب وغیرہ

ابلاغ کے عناصر، ارکان، مراحل

اظہار و ابلاغ کا عمل مکمل ہونے میں مختلف مراحل سے واسطہ پڑتا ہے:

بھیجنے والا (Sender) پیغام (Message) ذریعہ (Medium) وصول کرنے والا (Receiver)

ابلاغ کی اقسام:

عام طور پر ابلاغ کی چار اقسام ہوتی ہیں:

1۔ ذاتی 2۔ دوطرفہ 3۔ گروہی 4۔ ابلاغ عامہ

1-ذاتی ابلاغ Intra Personal Communication

یہ بالکل ذاتی احساسات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے، اپنی پسند ناپسند، نظریات، خواب اور آرزوؤں کی تفہیم کسی بھی صورت میں بیان کرے تو اسے ذاتی ابلاغ کہا جائے گا۔

2-دوطرفہ ابلاغ: Inter Personal Communication

یہ دو افراد کے درمیان ابلاغ کی ایک صورت ہے۔ جب دو انسان آپس میں بات چیت یا مکالمہ کرتے ہیں وہ بالمشافہ گفتگو کریں یا ٹیلیفون پر، بہرحال اپنے مافی الضمیر کو ایک دوسرے پر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ کہا گیا کہ ہماری زندگی ایک بیل گاڑی ہے، جسے مکالمے کے چابک سے ہانکا جاتا ہے۔ معاشرے میں ہر عمر کے فرد، خاندان کے لوگ، عزیز و اقارب، دوست دشمن، افسر، ماتحت، استاد شاگرد، مالک ملازم، قوم، سیاستدان ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہے اور یہاں کوئی ایک شخص اپنا مافی الضمیر، یا وارداتِ قلبی اپنی ذات کو بیان نہیں کرتا بلکہ دونوں طرف سے احساسات و جذبات کو ایک دوسرے پر عیاں کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال ؒ کی کئی نظموں میں دوطرفہ ابلاغ ہی کی صورت نظر آتی ہے۔ انسان کا اپنے رب سے شکوہ پھر جواب شکوہ، جبریل کا ابلیس سے، ابلیس کا اپنے مشیروں سے، باغی مرید کا پیر سے، پہاڑ کا گلہری سے، گائے کا بکری سے، بلبل کا جگنو سے، مکڑے کا مکھی سے مکالمہ فن کی معراج پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ٹیلی فون، موبائل، وائس چیٹنگ، میسجز بھی دوطرفہ ابلاغ کی صورتیں ہیں۔

3- گروہی ابلاغ Group Communication

دو سے زائد افراد کے درمیان گفتگو، مکالمے یا اظہار کو گروہی ابلاغ کا نام دیا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں گروپ کمیونیکیشن Group Communication کہتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر مثلاً کلاس روم میں، کسی دفتر کے شرکائے اجلاس کے درمیان، تقریری مقابلہ جات، بحث و مناظرہ، سیاسی جلسوں، کانفرنسوں، سیمینارز، مذہبی یا تبلیغی اجتماع میں مختلف مباحث و مکالمہ آرائی گروہی ابلاغ کے زمرے میں آتے ہیں۔

4-ابلاغ عامہ: Mass Communication

یہ براہ راست بہت سے لوگوں تک اظہار رسائی کی ایک صورت ہے۔ دنیا بھر میں ابلاغ عامہ کو موثر ترین ہتھیار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے اثرات دو چند اور براہ راست لوگوں کی زندگی پر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے یہ ابلاغ کی یہ صورت (ابلاغ عامہ) اپنے اندر بے پناہ وسعت و تاثیر رکھتی ہے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی وژن اور سوشل میڈیا پر شائع ہونے یا نشر ہونے والے پیغامات، اشتہارات، خبریں، مضامین، کالم، تجزیے اور تفریحی دلچسپیاں، حیات انسانی پر لازمی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اب تو ابلاغ عامہ کی ترقی نے ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) کا روپ عطا کر دیا ہے۔ کوئی واقعہ ہمارے ملک سے ہزاروں میل دور کسی خطے میں یا دنیا کے آخری کونے میں رونما ہو تو چشم زدن میں اس کی خبر ابلاغ عامہ کے ذریعے جنگل میں آگ کی طرح دنیا بھر میں پھیل جاتی ہے۔

نواں باب

مکتوب نگاری (خطوط نویسی)

ضروری باتیں

مکتوب کے لغوی معنی "لکھا گیا" یا "لکھا ہوا" کے ہیں لیکن عام طور پر مکتوب سے مراد خط لیا جاتا ہے۔ مکتوب نگاری ایک اہم صنفِ نثر ہے بلکہ یہ ایک فن ہے، ایسا فن جس سے ہر پڑھے لکھے کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ہر چند آج الیکٹرانک کا دور ہے اور ہر جانب اسی کا راج ہے اور کسی حد تک مکتوب کی جگہ الیکٹرانک میڈیا نے لے لی ہے تاہم کسی شخص کے بارے میں اس کے خیالات و کیفیات سے آگاہ ہونے کے لیے آج بھی مکتوب نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی بنا پر مکتوب نگاری ہر زبان کے نصاب میں شامل ہے۔

خط یا مکتوب تحریری گفت گو کا دوسرا نام ہے۔ اسی وجہ سے خط کو "نصف ملاقات" کا نام دیا جاتا ہے، کیوں کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ تو نہیں پاتے مگر ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ خط کی زبان روز مرّہ بات چیت کی طرح، سادہ، شگفتہ اور رواں ہونی چاہیے، تاکہ اسے پڑھ کر وہی لطف یا فائدہ حاصل ہو جو آپس کی ملاقات سے حاصل ہوتا ہے۔ خط میں لمبی چوڑی تمہید باندھنے اور لا حاصل باتیں لکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے تاکہ آپ کا اور دوسرے کا وقت ضائع نہ ہو۔ خط یہ سمجھ کر لکھا جاتا ہے کہ مکتوب الیہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور آپ اس سے دو بدو گفت گو کر رہے ہیں۔ اشراف گھرانوں کے لوگ نہ تو کبھی اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات کرتے ہیں اور نہ ہی لکھتے ہیں، اس لیے خط میں بھی آدابِ گفت گو کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مکتوب نگاری میں مہارت پیدا کرنے کے لیے چند بلند پایہ ادیبوں مثلاً: مرزا غالب، ڈپٹی نذیر احمد، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق اور علامہ اقبال جیسے کے خطوط کا مطالعہ مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

ہر پڑھے لکھے آدمی کے خط لکھنے کا انداز کم و بیش جدا ہوتا ہے تاہم بالعموم خط کے بنیادی حصے مندرجہ ذیل ہیں۔

خط کے حصے

1۔ مقامِ روانگی اور تاریخ

جس جگہ سے خط لکھا جائے، اس مقام کا نام خط کی پیشانی پر اوپر کونے میں دائیں جانب لکھا جاتا ہے اور اس کے نیچے خط لکھنے کی تاریخ درج کی جاتی ہے۔ ہر خط میں، چاہے وہ کسی کے بھی نام ہو، یہی انداز اپنانا زیادہ بہتر ہے۔ امتحان میں خط ہر چند فرضی ہوتا ہے مگر اسے یہ سمجھ کر لکھا جاتا ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہو۔ یہاں تک کمرۂ امتحان یا امتحانی مرکز کی جگہ، ایسا فرضی پتا لکھنا:

چاہیے جس پر اصل کا گمان گزرے۔ جب کہ تاریخ لکھتے ہوئے مہینے کا نام لفظوں میں لکھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ مثلاً:

92۔نو بہار کالونی

ملتان روڈ، لاہور

27۔دسمبر 2021ء

2۔القاب و آداب:

مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، انھیں القاب کہتے ہیں۔ القاب کی نوعیت مکتوب الیہ کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہوتی ہے اور مکتوب نگار سے اس کے تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً:

واجب الاحترام، محترم و مکرم، محترمہ، عزیزم، برخوردار وغیرہ۔ القاب کے الفاظ چونکہ تخاطب کے زُمرے میں آتے ہیں، اس لیے ان کے بعد ندائیہ کی علامت ''!'' لکھی جاتی ہے۔

القاب کے بعد آداب کے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ لکھنے میں مکتوب الیہ کی عمر اور حیثیت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً:

السلام علیکم، سلامِ مسنون، آداب و تسلیمات، عمر طویل ہو، دعا، وغیرہ۔ آداب کے بعد بھی فجائیہ کی علامت ''!'' دی جاتی ہے۔

3۔خط کا مضمون:

یہ خط کا مرکزی حصہ ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے Body of the Letter کہتے ہیں۔ مکتوب نگار مکتوب الیہ کو جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اس حصے میں لکھتا ہے۔ خط کے مضمون کو القاب و آداب کے نیچے نئی سطر سے شروع کیا جاتا ہے اور ابتدا میں بالعموم ایک دو تمہیدی جملے لکھے جاتے ہیں اور پھر خط لکھنے کا اصل مُدّعا بیان کیا جاتا ہے۔ خط کا یہ حصہ نہایت موثر اور جاندار ہونا چاہیے۔ ایک عمدہ خط کا اندازہ اس کے نفسِ مضمون ہی سے تو لگایا جاتا ہے۔

4۔خط کا اختتام:

جب خط کا مضمون تمام ہو جائے تو مکتوب الیہ کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑوں کے لیے ''والسلام'' اور چھوٹوں کے لیے ''دعا گو'' یا ''زیادہ دعا'' وغیرہ کے الفاظ لکھ کر بات ختم کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مکتوب نگار ''نیاز مند''، ''خیر اندیش''، ''آپ کا مخلص'' وغیرہ کے الفاظ لکھ کر اپنا نام لکھ دیتا ہے۔ مکتوب نگار کا نام قدرے بائیں جانب ہونا چاہیے۔ امتحان میں اصل نام یا عام سا فرضی نام لکھا جا سکتا ہے۔ نام کی جگہ الف ب ج وغیرہ لکھنے سے اچھا تاثر نہیں ملتا۔

خطوط کی اقسام

یوں تو خطوں کی بہت سی قسمیں ہیں اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہر خط ہی منفرد ہوتا ہے تاہم طلبہ کی آسانی کے لیے ہم جملہ اقسام کے خطوط کو پانچ قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ **نجی یا شخصی یا ذاتی خطوط:** مثلاً: اپنے والدین، بہن بھائیوں، نزدیکی رشتے داروں، دوست احباب، اساتذہ کرام کے نام۔ علمی وادبی اعتبار سے اس نوعیت کے خط بہت اہم ہوتے ہیں۔

2۔ **عمومی خطوط:** ایسے خطوں میں معاشری، ملکی یا علاقائی مسائل وغیرہ پر اپنی رائے کا اظہار ہوتا ہے، اخبارات اور رسائل وجرائد کے مدیروں کے نام جو خط لکھے جاتے ہیں، وہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

3۔ **کاروباری خطوط:** جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے ایسے خطوط کا تعلق کاروبار سے ہوتا ہے۔ ایسے خطوط میں زبان وادب کے بجائے معاملے کی نوعیت اور اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

4۔ **رسمی خطوط:** اس قبیل کے خط مختلف نوعیت کی تقریبات سے متعلق ہوتے ہیں اور عام طور پر ان خطوں کا مقصد تقریب میں شرکت کی دعوت دینا ہوتا ہے۔

5۔ **سرکاری خطوط:** ایسے خطوط کا تعلق حکومت، سرکاری اداروں یا ان کے ذیلی شعبوں سے ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے خطوں کے ذریعے سرکاری احکامات، ہدایات یا اطلاعات کو دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔

خط لکھنے کے بارے میں چند ضروری باتیں

1۔ لمبے چوڑے القاب وآداب سے اجتناب کرنا چاہیے۔
2۔ خط کم وبیش ایک صفحے پر مشتمل ہونا چاہیے۔
3۔ اندازِ تحریر سبک، رواں اور عام فہم ہو۔
4۔ اسلوبِ بیان شگفتہ اور بے تکلف ہو۔
5۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کیا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

چنانچہ ایک تو خط میں صرف کام کی باتیں لکھنی چاہئیں، دوسرے تکرار سے بچنا چاہیے اور تیسرے طوالت سے گریز کرنا چاہیے۔

6۔ خط کا نفسِ مضمون ایک ہی پیراگراف کے بجائے حسبِ ضرورت ایک سے زیادہ پیراگرافوں میں تقسیم ہو تو وہ نظر پر بوجھ نہیں بنتا۔

7۔ املا و انشا درست ہو اور حتی الوسع کاٹ چھانٹ سے بچنا چاہیے۔

ب کی رہنمائی کے لیے چند نمونے کے خط شامل کیے جاتے ہیں۔ انھیں بغور پڑھیے اور پھر اسی انداز میں خط لکھنے کی کوشش کیجیے:

1۔ والدہ کے نام

(صحت کے بارے میں استفسار)

ایف سی کالج (یونیورسٹی)

یکم جنوری 2021ء

محترمہ امی جان!

السلام علیکم!

کل ابا جان کا خط آیا تھا، جس میں انھوں نے آپ کی علالت کا ذکر کیا ہے۔ مجھے پڑھ کر آپ کی صحت کے بارے میں بڑی تشویش ہوئی۔ ابا جان نے لکھا ہے کہ آپ کو ہر وقت بخار رہتا ہے جو باوجود ہزار جتن کے اترنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ بڑی فکر کی بات ہے۔ اس بارے میں میری رائے تو، اگرچہ میں کیا اور میری رائے کیا، یہ ہے کہ آپ ایک تو کسی اچھی لیب سے خون کے تمام ٹیسٹ کرائیں اور دوسرے کسی سپیشلسٹ (Specialist) سے اپنا چیک اپ کرائیں تاکہ تشخیص ہو سکے کہ معاملہ کیا ہے۔

امی جان! خدا تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھے! آپ تو ماشاءاللہ پڑھی لکھی خاتون ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو فہم و فراست سے بھی خوب نوازا ہے۔ آپ ہر بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور فوراً ہی بات کی تہ تک پہنچ جاتی ہیں، پھر آپ اپنی صحت کی طرف سے غافل کیوں ہیں؟ میں آپ کی طبیعت کو خوب سمجھتا ہوں۔ آپ حد درجہ کفایت شعار ہیں۔ سوچتی ہوں گی کہ بلڈ ٹیسٹ کرانے میں خرچ اٹھے گا اور ماہر ڈاکٹر کی فیس ادا کرنا پڑے گی، تو امی جان! اس کی فکر مت کیجیے گا۔ کفایت شعار ماں کے کفایت شعار بیٹے نے اپنے جیب خرچ میں بچا بچا کر کچھ رقم پس انداز کی ہے، اس میں سے میں نے پانچ ہزار روپے ابا جان کے اکاؤنٹ میں آن لائن ٹرانسفر کر دیے ہیں، انھیں بلا جھجک استعمال کیجیے۔

پیاری امی جان! آج مئی کی تیس تاریخ اور ہفتے کا دن ہے۔ آج سے پندرہ دن بعد 13 ۔ جون کو بھی ہفتہ ہوگا اور ہماری گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو جائیں گی۔ میں ان شاءاللہ اسی دن شام تک آپ کی خدمت میں سرگودھا پہنچ جاؤں گا۔ میری طرف سے ابا جان کو سلام اور ننھی عارفہ کو پیار۔ فقط والسلام!

آپ کا بیٹا

قاسم جاوید

2۔ چھوٹے بھائی کے نام

(محنت سے پڑھنے کی تلقین)

12۔ کچہری روڈ، میانوالی

15۔ جنوری 2021ء

عزیزم علی عمران!

سدا سلامت رہو!

دو تین روز ہوئے ابا جان کا خط آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ آپ اپنی پڑھائی کی طرف سے بہت غفلت برتتے ہیں اور سکول سے آنے کے بعد کھانا کھاتے ہی آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور کرکٹ کھیلنے کے لیے گھر سے نکل جاتے ہیں اور شام کو لوٹتے ہیں۔ ہر چند انھوں نے آپ کو سمجھایا ہے مگر آپ ان کی باتیں ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں اور امی جان کی باتوں کی بھی بالکل پروا نہیں کرتے۔

عزیزِ من! آپ ایک شریف اور پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ہماری بہت سی امیدیں آپ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور خاندان کا نام روشن کریں مگر آپ کا یہی وتیرہ رہا اور آپ نے اپنی پڑھائی کی طرف بے توجہی برتی تو آپ سب کے دل سے اتر جائیں گے اور ہماری امیدیں بھی دم توڑ دیں گی۔

میرے پیارے بھائی! مجھے آپ کے بارے میں یہ سب کچھ جان کر بے حد افسوس ہوا ہے۔ ابا جان اپنی سرکاری مصروفیات کی بنا پر آپ کو زیادہ روک ٹوک نہیں سکتے کیونکہ وہ دفتر سے رات گئے لوٹتے ہیں۔ امی جان کا آپ کہا نہیں مانتے۔ غالباً آپ کو بری صحبت کے تباہ کن نتائج کا اندازہ نہیں۔ بری صحبت بڑے بڑے ذہین اور ہونہار نوجوانوں کو لے ڈوبتی ہے۔

عزیزم! بڑا بھائی ہونے کے ناتے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو برے دوستوں اور آوارہ لڑکوں کی صحبت سے بچنے کی تلقین کروں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور اس خط کے پڑھتے ہی اپنی پڑھائی کی طرف بھرپور توجہ دیں گے۔ چھٹی ملنے پر میں جب بھی لاہور آیا تو آپ کے اساتذہ سے بھی ملوں گا اور ان سے آپ کی تعلیمی حالت کے بارے میں پوچھوں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں اچھی رپورٹ کا انتظار رہے گا۔ زیادہ دعا!

آپ کا بھائی

رضوان احمد

3۔ چھوٹے بھائی کے نام

(ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تاکید کا خط)

22۔ آغا خان روڈ

4/6۔ F اسلام آباد

25۔ دسمبر 2021ء

برادرِ عزیزم محمد عاطف!

سدا سلامت رہو!

کل آپ کے سکول کے پرنسپل کی طرف سے آپ کے دسمبر ٹیسٹ کا رزلٹ موصول ہوا جسے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے تمام مضامین میں اسی فی صد سے زیادہ جب کہ ریاضی میں صد فی صد نمبر حاصل کیے ہیں۔ ہمیں آپ سے یہی توقع تھی مگر آپ کے رزلٹ کارڈ میں یہ لکھا دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ آپ ہم نصابی سرگرمیوں میں قطعاً حصہ نہیں لیتے اور آپ نے اپنے آپ کو صرف اور صرف پڑھائی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

عزیزم عاطف! یاد رکھیے ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا ایک طالب علم کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ نصابی تعلیم حاصل کرنا۔ اس کے بغیر شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے اور وہ عملی زندگی میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتا ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ سپورٹس میں بھی لازمی طور پر حصہ لیا کریں، اس سے صحت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ:

"صحت مند جسم ہی میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔"

چنانچہ بڑا بھائی ہونے کے ناتے میں آپ کو تاکید کرتا ہوں کہ آپ فوری طور پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں اور اپنی طبیعت کے مطابق کسی ایک کھیل میں بھی حصہ لیا کریں۔ امی اور ابو کی بھی یہی خواہش ہے۔ امی اور ابو کی طرف سے ڈھیروں دعائیں۔ فقط والسلام!

آپ کا بڑا بھائی

محمد کاشف

4۔ چچا جان کے نام

(لیپ ٹاپ کا تحفہ موصول ہونے پر شکریے کا خط)

5۔ علی منزل، نو بہار کالونی

ظفر علی خاں روڈ، لاہور

21۔ دسمبر 2021ء

محترم جناب چچا جان!

السلام علیکم!

کل اتوار تھا، چھٹی کا دن۔ ہم سب گھر والے گھر پر موجود تھے اور باہر صحن میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے کہ آپ کے دوست انکل نوید کا فون آیا، وہ ہمارے گھر آنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد تشریف لائے، کچھ دیر بیٹھے رہے، مزاج پرسی کی اور جاتے ہوئے اپنی گاڑی کی ڈکی میں سے ایک بڑا سا پیکٹ نکالا اور کچھ کہے بغیر مجھے تھما کر چلے گئے۔ مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ اس پیکٹ میں، جس پر میرا نام لکھا تھا اور لکھا تھا کہ میری سال گرہ کا تحفہ ہے، کیا ہے۔ جلدی جلدی کھولا تو لیپ ٹاپ نکلا۔

چچا جان! بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، جن سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں گزشتہ ایک سال سے ضد کر رہا تھا کہ مجھے لیپ ٹاپ لے کر دیں لیکن ابا جان کا مقدور نہیں تھا۔ اب مجھے لیپ ٹاپ مُیسر آیا ہے، تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

لیپ ٹاپ عہدِ حاضر کی بے حد مفید ایجاد ہے۔ یہ نہ صرف میری پڑھائی میں ممد و معاون ثابت ہوگا بلکہ اس کی وجہ سے میرا وقت بھی بچے گا، جسے میں دوسرے مفید کاموں میں صرف کر سکوں گا۔

چچا جان! میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ایسے عظیم و محسن چچا کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھے! چچی جان کو میرا مودبانہ سلام اور ننھی فرزانہ کے لیے دعائیں۔ فقط والسلام!

آپ کا بھتیجا

معظم علی

❁

5۔ دوست کے نام

(گرمیوں کی چھٹیاں اپنے ہاں گزارنے کی دعوت)

7۔ چغتائی سٹریٹ،

ملتان روڈ، لاہور

25۔ مئی 2021ء

پیارے دوست امجد علی!

السلام علیکم!

بہت دنوں سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ آپ خدانخواستہ ناراض تو نہیں ہیں؟ دوستوں میں اکثر و بیشتر آپ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب ہم ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ اکٹھے سکول آتے جاتے۔ اکٹھے ہوم ورک کرتے اور شام کو کرکٹ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ وہ زمانہ تو اب آنے سے رہا لیکن یہ تو ضرور ہو سکتا ہے کہ اس بار آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں کم از کم ایک ماہ کے لیے لاہور آ جائیں تاکہ ماضی کی خوشگوار یادیں ایک بار پھر تازہ ہو جائیں۔

جب سے ابا جان ٹرانسفر ہو کر لاہور آئے ہیں، وہ حد سے زیادہ مصروف ہو گئے ہیں لیکن انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہماری پڑھائی میں مدد کریں گے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ بچے گرمیوں کی چھٹیوں کا بھرپور استعمال کریں تو وہ لائق ہو جاتے ہیں اور اگر تمام چھٹیوں کو کھیل کود میں برباد کر دیں تو وہ نالائق ہو جاتے اور کلاس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میں نے پڑھائی کے لیے ایک سٹڈی روم بنا لیا ہے جو بڑا آرام دہ ہے۔ امید ہے کہ آپ کے والدِ محترم آپ کو ہمارے پاس آنے کی بخوشی اجازت دے دیں گے۔

پیارے دوست! آپ جانتے ہیں کہ لاہور تاریخی آثار کا مرکز ہے۔ لوگ دور دراز سے اس شہر کی سیر کو آتے ہیں۔ آپ کی آمد پر ہم اہم تاریخی عمارات کی سیاحت کا پروگرام بھی بنائیں گے اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ سیریں بھی خوب کریں گے۔ براہِ کرم ضرور تشریف لائیں۔ چھٹیوں کی آمد آمد ہے۔ جلد پروگرام بنائیں اور اپنی آمد کی تاریخ سے پیشگی مطلع کر دیں تاکہ میں آپ کو سٹیشن پر لینے آ جاؤں۔

میری طرف سے اپنے والدین کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ فقط والسلام!

آپ کا دوست

ازور علی

6۔ دوست کے نام
(اس کی والدہ کے انتقال پر تعزیت کا خط)

92۔ گل گشت کالونی

ملتان روڈ، لاہور

یکم دسمبر 2021ء

پیارے دوست امجد ادریس!

السلام علیکم!

کل مجھے سرِ راہ اچانک معظم علی مل گئے۔ انھوں نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ گزشتہ دنوں آپ کی والدہ ماجدہ کا ناگہانی طور پر انتقال ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یہ خبر سنتے ہی میں سکتے میں آ گیا۔ حیران ہوں یہ اچانک افتاد کیسے آ پڑی۔ لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ:

جب احمد مُرسل ﷺ نہ رہے کون رہے گا

دل کو سمجھا لیا کہ مرنا تو نبیوں کا ورثہ ہے، جلد یا بدیر رخصت تو سب کو ہونا ہے لیکن اس بات سے سخت حیران ہوں کہ مرحومہ کی صحت تو بہت اچھی تھی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ تو کبھی بیمار بھی نہ ہوئی تھیں اور دور دور تک گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ کچھ ہی عرصے بعد ہمیں یوں داغِ مفارقت دے جائیں گی، پھر یہ سانحہ یک لخت کیسے رونما ہوا؟ ہر چند ان باتوں سے اب کچھ حاصل نہیں، بس ذرا دل کی تشفی کے لیے پوچھ لیا ہے۔

پیارے دوست! میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی والدہ میری بھی والدہ تھیں۔ وہ مجھے بھی اپنا بیٹا سمجھتی تھیں، اس لیے مجھے بھی ان کی وفات کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو ہے۔ ماں دنیا کی عظیم ترین ہستی ہے۔ جو دعائیں ماں کے دل سے اپنی اولاد کے لیے نکلتی ہیں، وہ کہیں اور سے نہیں نکلتیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ آپ لوگ بشمول میرے، ان کی دعاؤں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے ہیں۔

دوست! میں دست بہ دعا ہوں کہ باری تعالیٰ مرحومہ کو اپنی رحمت سے جنت الفردوس میں جگہ دے اور سب پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے! میری طرف سے اپنے ابا جان اور دیگر اقربا سے بھی تعزیت کیجیے گا۔ فقط والسلام!

آپ کے غم میں برابر کا شریک

آپ کا دوست

علی احمد

7۔ دوست کے نام

(کسی تاریخی عمارت کی سیر کا حال)

ایف سی کالج (یونیورسٹی)

علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

27۔ جنوری 2021ء

پیاری دوست عائشہ رشید!

السلام علیکم!

میں خیریت سے ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ بھی خیریت سے ہوں گی۔

سیر و تفریح کی سرگرمیاں طالب علموں کی ذہنی تربیت کرنے میں یقیناً معاون ہوتی ہیں اور ان سے شخصیت میں نکھار آتا ہے اور ایسی سرگرمیوں کے لحاظ سے ہمارے سکول کا بڑا شہرہ ہے۔ گزشتہ اتوار کو ہمارے سکول نے تاریخی قلعہ روہتاس کا چالیس بچوں کے ٹرپ کا انتظام کر رکھا تھا، جس میں والدین کی اجازت کے بعد میں بھی شامل تھی۔

عائشہ! مجھے قلعہ روہتاس کی سیر کا بڑا مزہ آیا۔ میں نے سوچا کہ آپ کو بھی یہاں کی سیر کا حال سناؤں۔ قلعہ روہتاس ضلع جہلم میں دینہ سے بجانب مغرب سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں جی ٹی روڈ روہتاس سے ہوتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس قلعے کو شیر شاہ سوری نے سولھویں صدی عیسوی میں درہ خیبر کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں سے روکنے کی خاطر ان کی راہ میں بڑا مضبوط تعمیر کرایا تھا۔ اس کے آثار آج بھی بڑے متاثر کن ہیں۔ قلعہ روہتاس تقریباً چار مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

ہم تقریباً گیارہ بجے وہاں پہنچ گئے تھے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ ہے۔ قدرتی مناظر کو دیکھ کر عجب کی طرح تازگی اور طراوت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم نے قلعہ ذوق شوق سے دیکھا اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا، جسے ہم اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ یہ جگہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ بھی روہتاس کی سیر ضرور کریں، آپ کو میرے کہنے کی صداقت کا یقین آ جائے گا۔ میری طرف سے اپنی امی، ابو، بھائی اور بہن کو سلام ضرور کہیے گا۔ فقط والسلام!

آپ کی دوست

مہ نور احمد

8۔ مالک مکان کے نام

(مکان کی ضروری مرمت کے لیے)

786۔ ملتان روڈ، لاہور

27۔ جولائی 2021ء

محترم جناب چودھری صاحب!

السلام علیکم!

تقریباً دو ماہ پہلے جب آپ سرگودھا سے لاہور تشریف لائے تھے اور آپ نے مکان کے کرائے میں اضافے کا تقاضا کیا تھا تو میں نے اس شرط پر کہ گھر کی خستہ حالی پر فوری توجہ مبذول کریں گے اور گھر کی ضروری مرمت کرا دیں گے، کرایہ بڑھا دیا تھا لیکن وہ دن اور آج کا دن، اس بات پر عمل نہیں ہوا، جب کہ میں آپ کے کارندے کو باقاعدگی سے کرایہ ادا کر رہا ہوں۔

محترم چودھری صاحب! گھر کی حالت کچھ آپ سے پوشیدہ نہیں لیکن پھر بھی گوش گزار کیے دیتا ہوں کہ تمام گھر میں رنگ و روغن ہونے والا ہے۔ دو کمروں کی چھتیں ٹپکتی ہیں۔ اب جب کہ برسات کا موسم نزدیک آ رہا ہے تو دل میں ہول اٹھتے ہیں کہ ہمارا کیا بنے گا۔ میں بچوں اور اسباب کو لے کر کہاں جاؤں گا۔ علاوہ ازیں کچن اور دونوں غسل خانوں کے پائپ پرانے ہونے کی وجہ سے لیک کرتے ہیں، انھیں بدلوانا ہے۔ ایک دو جگہ سے فرش بھی خراب ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر یہ تمام مسائل فقط آپ کی توجہ ہی سے حل ہوں گے۔

جناب چودھری صاحب! اگر آپ کے پاس ادھر توجہ دینے کا وقت نہیں تو مجھے حکم کیجیے، میں گھر کی تمام ضروری مرمت اور رنگ روغن اپنی نگرانی میں خود کرا لیتا ہوں۔ جو خرچ اٹھے گا میں اس کی رسیدیں پیش کر دوں گا۔ آپ مجھے ادائیگی کر دیجیے گا یا پھر میں کرائے میں سے وضع کر لوں گا۔ بہر کیف جو کچھ بھی فیصلہ کرنا ہے، آپ کو کرنا ہے لیکن خدارا اس معاملے میں غفلت مت برتیے گا۔

مجھے آپ کے فیصلے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ فقط والسلام!

آپ کا مخلص

محمد اسلم خاں

❁

9۔ کسی فیکٹری کے منتظم کے نام

(فیکٹری دیکھنے کی اجازت طلب کرنے کے لیے خط)

الف سی کالج (یونیورسٹی)

30۔نومبر 2021ء

محترم جناب منیجر صاحب!

والز آئس کریم فیکٹری لاہور

السلام علیکم!

سب لوگ جانتے ہیں کہ آئس کریم بچوں کو بہت زیادہ پسند ہے اور پاکستان میں آئس کریم بنانے والوں میں والز سرِ فہرست ہے۔ بچوں سے جب بھی ان کی پسندیدہ آئس کریم پوچھی جاتی ہے تو وہ والز آئس کریم کا نام لیتے ہیں۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والز ایک کوالٹی آئس کریم ہے اور اس میں وہ تمام فلیور ملتے ہیں جو بچوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔

جناب منیجر صاحب! ہم کافی عرصے سے اس کوشش میں تھے کہ آپ کی فیکٹری وزٹ کریں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں آئس کریم کے عناصر کیا ہیں اور یہ کن کن مراحل سے گزر کر تیار ہوتی ہے، پھر اسے پیک (Pack) اور سٹور کیسے کیا جاتا ہے اور مارکیٹ میں پہنچانے کا کیا انتظام ہے؟ ہم مورخہ 13۔دسمبر 2021ء بروز پیر آپ کی فیکٹری دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔ ہماری جماعت میں کل 35 طالبات ہیں اور میڈم جویریہ اشفاق صاحبہ اور میڈم عذرا پروین صاحبہ بچوں کی نگران کے طور پر ہمارے ہم راہ ہوں گی۔

براہِ کرم 13۔دسمبر 2021ء کو صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک ہمارے لیے کوئی وقت مقرر فرما دیجیے۔ ہمیں آپ کی طرف سے اجازت نامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ فقط والسلام!

ممنونِ احسان

جملہ طالبات، سیکشن "اے"

بوساطت سائرہ احمد مانیٹر سیکشن

10۔ کسی پبلشر کے نام

(بذریعہ ڈاک کتابیں منگوانے کے لیے)

786۔ بہار کالونی

مین روڈ، پھول نگر

27۔نومبر 2021ء

مکرمی جناب منتظمِ اعلیٰ علمی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور

السلام علیکم!

میں نے بہ تحقیق سنا ہے کہ آپ کا ادارہ کسی بھی سطح کے طالب علموں کے لیے خصوصی رعائتی نرخ پر کتابیں مہیا کرتا ہے۔ میں جماعت دہم کا طالب علم ہوں اور مجھے اسی عمر میں اپنی درسی کتابوں کے علاوہ اردو زبان وادب کی زندہ اور سدا بہار، کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی ذاتی لائبریری میں کافی کتابیں جمع کر لی ہیں۔ براہِ کرم مجھے درج ذیل کتابیں بذریعہ وی پی پی ارسال فرما دیجیے۔ میں ادائیگی کر کے بلٹی چھڑا لوں گا اور تا عمر آپ کا یہ احسان فراموش نہ کر پاؤں گا۔

آپ کا مخلص

رضوان احمد

فہرست کتب

1۔ علمی اردو لغت (جامع) مرتبہ وارث سرہندی مطبوعہ علمی کتاب خانہ اردو بازار، لاہور
2۔ کلیاتِ اقبال (اردو) مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
3۔ فردوسِ بریں از مولانا عبدالحلیم شرر مرتبہ ڈاکٹر علی محمد خاں مطبوعہ الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب
4۔ دیوانِ غالب (اردو) مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
5۔ شعرِ دلآویز مرتبہ طاہر حمید تنولی مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

کتابیں ارسال کرنے پر میں آپ کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مخلص

رضوان احمد

11۔ کسی اخبار کے مدیر کے نام

(ٹریفک کی بدانتظامی کی طرف توجہ دلانے کے لیے)

313۔این، ثمن آباد، لاہور

27۔جنوری 2021ء

جنابِ مدیر روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

سلامِ مسنون!

میں آپ کے اخبار کی وساطت سے حکومتِ پنجاب بالخصوص لاہور کی ٹریفک پولیس کے اربابِ اختیار کی توجہ ٹریفک کی بد انتظامی کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کو کسی قریبی اشاعت میں شائع فرما دیں گے۔

جنابِ من! ہمارے علاقے ثمن آباد میں ٹریفک بہت زیادہ ہوتی ہے۔ خصوصاً صبح آٹھ سے دس بجے تک اور بعد دوپہر ایک تا تین بجے اس قدر ٹریفک ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! دراصل لوگ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ٹریفک پھنس جاتی ہے۔ ندیم شہید روڈ پر تو یہ حال ہوتا ہے کہ پانچ منٹ کا راستہ مشکل سے ایک گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا اپنے سکولوں کالجوں کو وقت پر نہیں پہنچ پاتے اور ان کی پڑھائی کا نقصان ہوتا ہے۔

جنابِ مدیر! ثمن آباد موڑ سے ثمن آباد کی طرف آئیں تو دو گول چکر اور کئی چوراہے آتے ہیں مگر ٹریفک کا برا حال ہے۔ ٹریفک وارڈنز کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہوتا۔ رش کے متذکرہ اوقات میں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس علاقے پر قدرت کی طرف سے عذاب نازل ہوا ہے اور یہ ایک دن کا نہیں بلکہ روز کا معمول ہے۔ بعض اوقات ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شاید ثمن آباد، لاہور کا حصہ نہیں ہے تبھی تو ٹریفک پولیس اس علاقے میں نہیں آتی اور اگر کوئی ٹریفک وارڈن بھولے سے ادھر کا رخ کر لیتا ہے، تو اسے ٹریفک کے بہاؤ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

جنابِ مدیر! آپ کے موقر روزنامے کی وساطت سے میری حکومتِ پنجاب سے گزارش ہے کہ اس علاقے میں مناسب تعداد میں مستعد ٹریفک وارڈنز تعینات کیے جائیں جو اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کریں اور آپ کا اخبار لوگوں میں ٹریفک کے اصولوں کا شعور پیدا کرنے کے لیے ان کی رہنمائی کرے! فقط والسلام!

خیر اندیش

حسنات احمد

12۔ کسی اخبار کے مدیر کے نام

(وَن ویلنگ کے نتیجے میں حادثات رونما ہونے کے بارے میں)

786۔ اتحاد کالونی

ملتان روڈ، لاہور

27۔ دسمبر 2021ء

جنابِ مدیر روزنامہ ''جنگ'' لاہور

السلام علیکم!

میں آپ کے اخبار کی وساطت سے حکومتِ پنجاب خصوصاً لاہور کی ٹریفک پولیس کے اربابِ اختیار کی توجہ آج کل نئی وبا یعنی وَن ویلنگ کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ میری ان گزارشات کو کسی قریبی اشاعت میں مناسب جگہ پر شائع فرمادیں گے۔

جنابِ من! آج سے صرف دو دن پہلے 25۔ دسمبر کا ذکر ہے کہ میں صبح سویرے اپنے ابا جان کے ہم راہ نہر کنارے سیر کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں دس بارہ لڑکوں کا غول ون ویلنگ کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا۔ ان میں سے بعض لڑکے ون ویلنگ کے ذریعے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کرتب دکھا رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے ایک لڑکا اپنی موٹر سائیکل پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور اس کی موٹر سائیکل پھسل گئی اور آدھ فرلانگ تک گھسٹتی چلی گئی اور سوار لڑکے کا سر فٹ پاتھ کے کنارے سے اس زور سے لگا کہ سر پھٹ گیا اور اس نے اسی لمحے تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ آن واحد میں لوگوں کا ایک جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ بہر کیف کوئی کیا کر سکتا تھا، اس لیے کہ لڑکا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

جنابِ مدیر! اس نوعیت کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ لاہور میں ہر پبلک ہالیڈے کے روز اور ہر اتوار کو بالعموم وَن ویلنگ کے تماشے لازمی طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں اور جان لیوا حادثات بھی ضرور ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کب تک چلے گا؟ کیا ان دنوں اور ان اوقات میں پولیس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ قانون کی بالادستی قائم کرے؟ اس کے ساتھ ساتھ میری والدین سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنی اولاد پر کڑی نظر رکھیں اور اپنے نونہالوں کو وَن ویلنگ سے روکیں۔ فقط والسلام!

آپ کا مخلص

عابد علی

دسواں باب

صحافتی اردو

انسانی خیالات اور جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے زبان مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ مذہب کے بعد سب سے بہترین رابطے کا وسیلہ بھی زبان ہوتی ہے۔ کسی قوم کی ثقافت اور تہذیب کی شناخت بھی زبان ہی کے ذریعے ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنی زبان کو عزیز تر رکھتی ہے اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہے۔ یہ بات انگریزی، عربی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، چینی، جاپانی، فارسی، ولندیزی اور ترکی زبانوں کی تاریخ سے بخوبی عیاں ہے کہ ان ممالک نے اپنی زبان کو ہر حال میں عزیز رکھا اور اس کی ترقی کے لیے ہر جتن کیا۔ انھوں نے یہ کام اس لیے بھی کیا کہ ہر قوم جانتی ہے کہ یہ زبان ہی ہوتی ہے جو کسی قوم کو انتشار سے بچاتی اور اس کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ حلقۂ اثر کے اعتبار سے یہ دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے بھارت کے علاوہ سارک کے دوسرے ممالک برطانیہ، جرمنی، ناروے، فرانس، امریکہ، کینیڈا، سعودی عرب، کویت، متحدہ عرب امارات، آسٹریلیا اور کچھ دیگر ممالک میں بکثرت موجود ہیں مگر اس کا مرکز ومحور بلاشبہ پاکستان ہے۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ اردو پاکستان میں تادمِ تحریر دفتری زبان نہیں بن سکی مگر کاروباری اور تجارتی روابط کے لیے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کو استعمال کیا جاتا ہے بلکہ ہمارے معاشرے میں میڈیا کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کردار نے اردو زبان کی اہمیت کو ایک مرتبہ پھر اجاگر کیا ہے۔ آج پاکستان میں، ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات اور رسائل وجرائد میں بطور ذریعہ ابلاغ اردو کو انگریزی پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی شاید دو فی صد سے بھی کم آبادی انگریزی کو جب کہ اٹھانوے فی صد آبادی اردو سمجھتی ہے۔

ہر چند پاکستان کے پانچوں صوبوں میں بالعموم اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانیں: پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، براہوی، پوٹھوہاری یا بلتی وغیرہ بولی جاتی ہیں مگر یہ علاقائی بولیاں ہیں اور رابطے کا بڑا ذریعہ اردو ہی ہے بلکہ اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے ایک ماں باپ کی کئی اولادیں ہوں اور وہ ایک دوسرے کے ایسے ہی مددگار ہوں جیسے ایک گھرانے کے تمام افراد باہم شیر وشکر ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ ان میں اردو کا درجہ والدین کا ہے۔ ظاہر ہے کہ والدین اپنی اولاد کا برا کبھی نہ چاہیں گے، دوسرے لفظوں میں اردو تمام علاقائی زبانوں کی سرپرست ہے اور ان کی مُربی و محسن ہے۔

اردو نہ صرف پاکستان بلکہ تمام برصغیر میں ابلاغ اور رابطے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ بی بی سی کی اردو سروس سے وابستہ معروف براڈ کاسٹر جناب رضا علی عابدی اپنی کتاب ''اردو کا حال'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے دُور افتادہ علاقے دیکھے ہیں مگر ایک عجیب بات دیکھی۔ میں جہاں کہیں بھی پہنچا، اردو مجھ سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ ہمالیہ کے پچھواڑے لداخ میں ایک بڑے نالے جیسے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں وہاں پہنچا، جس کے آگے تبت ہے۔ میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچا جس کا نام ''اُپسی'' تھا۔ مجھے دیکھ کر گاؤں والے میرے گرد جمع ہو گئے۔ جی چاہا ان سے باتیں کروں مگر خیال آیا کہ خدا جانے کون سی زبان بولتے ہوں گے؟ مگر میرے ''السلام علیکم'' کہنے کی دیر تھی کہ اب جو وہ بولے تو بالکل میری ہی جیسی اردو بولے۔ ان میں سے کسی نے مدرسے کی صورت بھی نہیں دیکھی، لکھنا پڑھنا نام کو بھی نہیں آتا، مگر اردو روانی سے بول رہے تھے جیسے ان میدانوں میں عمر گزار کر آئے ہوں۔ اس گفت گو میں اردو روزمرّہ اور محاورہ پوری آن بان سے کارفرما تھا۔ بات میں سلاست تھی، روانی تھی، لفظوں کی نشست و برخاست زبان دانی کے تمام اصولوں پر پوری اترتی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ چین کی سرحد پر رہنے والے یہ اَن پڑھ دیہاتی نہیں بول رہے ہیں، اردو کا اعجاز بول رہا ہے۔ یہ کیسا چمتکار ہے کہ ہمالیہ کے اُس پار جہاں مون سون گھٹائیں بھی نہیں پہنچ پاتیں، وہاں اردو کی جھڑی لگی ہے۔''

عام بول چال کی زبان ہونے کے علاوہ علم و فن کا سب سے زیادہ سرمایہ بھی اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) میں پوسٹ گریجوایشن کی سطح تک تمام سائنسی مضامین کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین، جنھوں نے پاکستان میں ایٹمی توانائی کا ڈول ڈالا تھا، اس جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ آج بھی پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے اور سائنسی اور علمی و ادبی شعبوں میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ صحافتی میدان میں صرف اردو کا سکّہ چلتا ہے اور اس کی قدر و قیمت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

مشاہدے کی بات ہے کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے ایک آدھ چینلوں کے سوا تمام ٹی وی چینلز اردو میں ہیں۔ چند سال پہلے ایک انگریزی چینل "DAWN" کا اجرا ہوا تھا جسے ہار مان کر اردو چینل میں منتقل کرنا پڑا کیوں کہ انگریزی چینل عوام الناس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی حال اخبارات کا ہے۔ ہمارے ہاں ایک دو کے سوا تمام اخبارات اردو میں چھپتے ہیں۔ انگریزی میں چھپنے والے روزناموں کی اشاعت چند ہزار ہے جب کہ جو اخبارات اردو میں چھپتے ہیں ان کی اشاعت لاکھوں میں ہے اور طرۂ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اخبارات دبئی، لندن اور نیو یارک میں بھی چھپتے ہیں۔ آئے دن نئے نئے اخبارات اور رسائل و

جرائد منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں، وہ بھی اردو ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں۔ جو اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو میں بطور صحافتی زبان کتنی سکت ہے اور اسے مؤثر ترین ذریعۂ ابلاغ کے طور پر کس حد تک برتا جا سکتا ہے، تو اس کا جائزہ ہم ذیل کی سطور میں لیتے ہیں:

1- اردو صحافتی زبان سائنسی اور علمی و ادبی زبان سے قدرے مختلف ہے۔ سائنسی و علمی زبان میں موضوع کے حوالے سے مشکل اصطلاحات آتی ہیں۔ سائنسی اور علمی زبان کسی حد تک متانت اور استدلالی انداز بیان کی حامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ادبی زبان بھی روزمرّہ زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ ادیب یا شاعر بہترین الفاظ کے انتخاب کے ذریعے لفظی مصوّری کرتا ہے جب کہ صحافتی زبان میں تزئین و آرائش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

2- صحافت کا بنیادی کام ابلاغ یا پیغام رسانی ہے چناں چہ صحافتی زبان میں شوکتِ بیان پر مؤثر ابلاغ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ صحافی جو کچھ دیکھتا ہے اسے بلاکم و کاست بیان کرتا ہے اور ہمیشہ ایسا پیرایۂ بیان استعمال کرتا ہے، جس سے اس کا پیغام واضح طور پر وصول کنندہ تک پہنچ جائے۔

3- صحافتی زبان چوں کہ پیغام رسانی کی زبان ہے اس لیے یہ پیچیدہ دار گفت گو کی متحمل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عمارت سادگی اور سلاست پر قائم ہوتی ہے۔ ادیب یا شاعر خاص کے لیے ہوتا ہے جب کہ صحافی کی راہ و رسم عوام کے ساتھ ہے۔ ایک صحافی کے لیے لازم ہے کہ وہ دانش وروں سے لے کر کسانوں، مزدوروں اور پھیری لگانے والوں تک سب کو اپنی نظروں کے سامنے رکھے کیوں کہ اس کے پڑھنے والوں میں ہر طبقے اور ہر نوع کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

4- صحافی سیدھی سادی زبان استعمال کرتا ہے جب کہ نثری ادب میں ادبی اصطلاحات کا استعمال ضروری ہے، جس کا سمجھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں اور شعری ادب میں تو شعری اصطلاحات کے علاوہ علمِ بیان اور صنائع بدائع کا استعمال بھی ناگزیر ہے جب کہ غزل کی زبان تو زبان ہی علائم و رموز کی ہوتی ہے اور بادہ و ساغر کے رنگ میں نا معلوم کیا کیا بیان کر دیا جاتا ہے۔

5 صحافت کی اوّلین شرط غیر جانب دارانہ روّیہ ہوتا ہے جب کہ بالعموم ادیب یا شاعر کچھ اپنے نظریات رکھتے ہیں جن کے اظہار کے لیے وہ خاص قرینے استعمال کرتے ہیں۔ ادیب یا شاعر نت نئے الفاظ ایجاد کرتے رہتے ہیں اور نئے سے نیا ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ صحافی ان سب باتوں سے بالا ہوتا ہے، اس کا واسطہ فقط اپنے قارئین سے ہوتا ہے، جس میں ہر نوع کے لوگ شامل ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ایسی زبان لکھتا ہے جسے سب لوگ بخوبی سمجھیں۔

❀❀

خبر نویسی

خبر کیا ہے؟

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اِسے بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے، وہاں اس کے خمیر میں مل جُل کر رہنے کا جزو بھی گوندھا ہے اور معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کے لیے اسے خیر اور شر کا تصور بھی دے دیا ہے۔ اِن تمام عوامل نے انسان کی ضرورت بنا دیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے بارے میں بلکہ اردگرد کے لوگوں سے لے کر کائنات میں چھپے اور بکھرے تمام بھیدوں کو جان لینا چاہتا ہے۔ وہ صبح سویرے اُٹھتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ باہر کی دنیا میں آج تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟ وہ اس بارے میں بھی متجسس ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کے حالات و واقعات کیا ہیں؟ موسم کیسا ہے؟ آب و ہوا کیا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ وغیرہ اِن تمام معلومات کو ہر انسان اپنے ذوق اور دلچسپی کے حساب سے جاننا چاہتا ہے اور جہاں اِن تمام باتوں کے جواب ایک ساتھ ملتے ہیں، اُسے خبر کہا جاتا ہے۔

خبر کی تعریف

''آکسفورڈ ڈکشنری'' کے مطابق "New Information or report of latest incidents"

''جامع فیروز اللغات'' کے مطابق خبر سے مراد اطلاع، آگاہی اور واقفیت ہے۔

''نُور اللغات'' از مولوی نور الحسن مرحوم کے مطابق خبر کے معنی پیغام، افواہ، شہرت، پتا، نشان اور سراغ کے ہیں۔

''فرہنگ آصفیہ'' کے مطابق خبر سے مراد پتا اور نشان، سندیسا اور پیغام کے ہیں۔ اس کے علاوہ خبر کے معنی ہوش، اوسان، سمجھ اور عقل کے بھی ہیں۔

سدھ بدھ جیسے اسے اپنی بھی خبر نہیں
کس کی خبر کہوں ، مجھے اپنی بھی خبر نہیں

''جامع نسیم اللغات اردو'' کے مطابق خبر سے افواہ، شہرت اور کسی امر یا معاملے کی واقفیت حال کی اطلاع (ملنا) وغیرہ ہے۔

''قومی انگریزی اردو لغت'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے مطابق: خبریں، جس چیز کے متعلق اطلاع جو واقع ہو چکی ہو یا جس کے متعلق پہلے علم نہ ہو، حالیہ معلومات، کسی واقعے کے متعلق حالیہ اطلاع، بالخصوص وہ جسے ذرائع ابلاغ، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن نے فراہم کیا ہے، کوئی بات یا شخص جسے ذرائع ابلاغ قابل اعتنا و پیشکش تصور کریں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی کتاب ''فنِ صحافت'' میں لکھتے ہیں: ''خبر کا تعلق ایسے واقعات اور مشاہدات سے ہوتا ہے جو معمول سے ہٹ کر ہوں۔''

پروفیسر ڈاکٹر مسکین علی حجازی کے مطابق: ''خبر ایسے واقعہ کا فوری، صحیح اور بے لاگ بیان ہے جس میں قارئین کے لیے دلچسپی یا اطلاع موجود ہو۔''

حامد جلال اپنی کتاب "Here is the News" میں لکھتے ہیں: ''خبر اس نئی یا اہم اطلاع کو کہتے ہیں، جو سامعین کی دلچسپی کا باعث ہو یا اس سے ان کی کچھ تربیت ہو۔''

جیرالڈ ڈبلیو جانسن اپنی کتاب "What is news" میں رقم طراز ہیں:

"News is such an account of such events as a first rate news paper man acting as such finds satisfaction in writing and publishing."

یعنی خبر ایسے واقعات کا بیان ہے جسے لکھنے اور شائع کرنے میں ایک اعلیٰ پایے کا اخبار نویس اطمینان محسوس کرتا ہے۔

کارل وارن (Carrel Warren) نے "Radio News Writing" میں خبر کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"A news is usually a report which is not known to layman before its presentation. This report deals with such a activities of man as a source of interest entertainment or information to the readers."

یعنی خبر عموماً وہ رپورٹ ہوتی ہے، جو اس سے پہلے عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی۔ یہ رپورٹ پوری انسانیت کی ایسی سرگرمیوں کے متعلق ہوتی ہے، جو قارئین یا سامعین کے لیے دلچسپی، تفریحِ طبع یا معلومات کا موجب ہوتی ہے۔ نیو انٹرنیشنل ویبسٹر ڈکشنری، انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن کے مطابق خبر سے مراد تازہ ترین واقعہ کی رپورٹ یا معلومات ہے۔ مختلف ماہرینِ صحافت کے مطابق خبر کی تعریف مختلف ہے اور اس میں زمانی اعتبار سے تغیرات بھی آتے رہے ہیں لیکن مشرق و مغرب کے تمام ماہرینِ صحافت اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ خبر سے مراد ایسے واقعہ کی رپورٹ ہے جو تازہ ترین، غیر متوقع، معمول سے ہٹ کر، معلومات سے بھرپور اور قارئین اور سامعین کی دلچسپی کے مطابق ہو۔

خبر کی ہیئت: اس سے مراد خبر لکھنے کا طریقہ ہے۔ جسے ہر اخبار اپنی پالیسی کے مطابق استعمال میں لاتا ہے۔ اس کا انحصار مدیر اعلیٰ کی مرضی پر ہوتا ہے۔ خبر بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے: 1- ابتدائیہ 2- متن

ابتدائیہ: خبر کا ابتدائی حصہ، ابتدائیہ کہلاتا ہے۔ اسے خبر کی سُرخی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خبر کا اہم حصہ ہوتا ہے جس میں پوری خبر کا

نچوڑ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ خبر جتنی طویل ہوتی ہے اس کا ابتدائیہ بھی اُتنا ہی طویل ہوتا ہے۔ اسی کو پڑھ، دیکھ یا سُن کے قارئین اور سامعین متوجہ ہوتے ہیں اور اخبار خریدنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ابتدائیہ جس قدر دلچسپ اور پُر مغز ہوگا، اسی قدر اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ ابتدائیہ چھے استفہامیہ الفاظ کے جواب سے ترتیب پاتا ہے۔ یہ استفہامیہ کیا، کون، کہاں، کیسے، کب، کیوں کے جوابات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان سوالوں کے جواب مختصر ترین ہوتے ہیں۔ ابتدائیے کا مختصر ہونے کے ساتھ ادھورا اور نامکمل ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تجسس کو ابھارا جا سکے۔ اس کی زبان عام فہم، سادہ اور سلیس ہونا ضروری ہے تاکہ کم پڑھا لکھا فرد بھی اسے آسانی سے پڑھ سکے۔ مشکل اور پیچیدہ الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جاتا ہے۔ ابتدائیے میں جہاں تشنگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے، وہاں اس میں عوام کی دلچسپی کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے کیوں کہ اس کا پُرکشش ہونا لازمی ہوتا ہے تاکہ عام آدمی کی توجہ کو کھینچا جا سکے۔ الفاظ سادہ، واضح اور پُر مغز ہوں گے، تبھی عوام میں مقبولیت کا باعث بنے گا۔ کم پڑھے لکھے فرد سے لے کر دانشور تک کی زبان کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یعنی نہ تو لفظ اتنے دشوار ہوں کہ لغت کھولنا پڑ جائے اور نہ ہی اتنے عامیانہ کہ ذوقِ سلیم پر گراں گزریں۔

متن: خبر کے متن سے مراد خبر کی تفصیلات ہیں جس کے لیے مخصوص طریقہ متعین ہے۔ اس میں خبر کے مواد کو مخصوص طریقے سے بیان کیا جاتا ہے، جسے کوئی بھی مدیر اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ خبر کی ترتیب کے طریقے درج ذیل ہیں:

(i) زمانی ترتیب: اس میں خبر کی ترتیب میں وقت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خبر کو وقت کے اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی بھی واقعہ کو شروع سے آخر تک اسی ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے جس طرح وہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس طریقے میں زمانے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک دن کی خبریں اخبار میں شامل ہیں تو پہلے اُن واقعات کی خبریں لگائی جائیں گی جو پہلے رونما ہوئے ہوں گے۔

(ii) صعودی ترتیب: اس میں خبر کی ترتیب اہمیت کے اعتبار سے دی جاتی ہے لیکن ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے غیر اہم سے اہم کی جانب سفر کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے کم اہم واقعات شروع میں بیان کیے جاتے ہیں اور آخر میں اہم واقعات تحریر کیے جاتے ہیں۔ یہ ترتیب موجودہ اخبارات میں بہت کم استعمال ہوتی ہے۔

(iii) تدریجی ترتیب: خبر کی ترتیب کے اس طریقے میں بھی اہمیت اہم واقعات کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس میں اہم سے غیر اہم کی جانب سفر کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے اہم واقعات پھر کم اہم اور پھر غیر اہم واقعات ترتیب دیے جاتے ہیں۔

(iv) اجتماعی ترتیب: متن کی ترتیب کا یہ طریقہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ہے۔ مدیر یا معاون مدیر اس ترتیب میں اپنی مرضی سے دو یا دو سے زائد طریقے استعمال کر کے متن کو ترتیب دیتا ہے۔ مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خبر کو کسی بھی انداز سے تحریر کیا جائے اس کے لیے کوئی خاص قاعدہ متعین نہیں ہے بلکہ یہ سراسر ایڈیٹر کی مرضی پر منحصر

ہوتا ہے، تاہم خبر کی ترتیب کے طریقوں سے خبر کی ترتیب کو کسی خاص شکل میں ڈھالنے میں مدد ملتی ہے۔

خبر کی خصوصیات: خبر کی خصوصیات سے مراد خبر میں موجود وہ عناصر ہیں جن کے نہ ہونے سے خبر، خبر نہیں رہتی اور ہونے سے خبر مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے ان لوازمات کا ہونا خبر میں ضروری ہے اور ان خصوصیات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

1- خبر کی تعریف تمام ماہرینِ صحافت کے مطابق واقعات کی تازہ ترین رپورٹ ہے، اس لیے یہ لازمی بات ہے کہ خبر پڑھنے یا سننے والے کے لیے بالکل نئی ہو۔ اس کے بارے میں اُسے پہلے سے علم نہ ہو، جن باتوں کے بارے میں لوگ پہلے سے جانتے ہوں، وہ خبر نہیں ہوتی۔

2- خبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ معمول سے ہٹ کر ہو، یعنی اس میں کسی ایسی بات یا واقعہ کا ہونا ضروری ہے جو روزمرہ زندگی سے ہٹ کر ہو اور اس میں غیر معمولی پن پایا جائے۔

3- خبر میں معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر خبر میں موجود مواد کے بارے میں عوام کو پہلے سے معلوم ہو تو یہ چیز اس کے لیے عدمِ دل چسپی کا باعث ہوگی۔

4- اختصار خبر کا حُسن ہے۔ اس لیے خبر میں زائد اور غیر ضروری الفاظ سے احتراز کرنا چاہیے۔ جملوں میں اختصار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

5- خبر میں جامعیت بنیادی جزو ہے۔ اسے بہر صورت مکمل ہونا چاہیے تاکہ عوام کسی بھی واقعہ سے مکمل آگاہی حاصل کر سکیں۔

6- خبر میں دلچسپی کا عنصر اسے عوام کے لیے پُرکشش بناتا ہے۔ یعنی خبر کو عوام کے ذوق اور دل چسپی کے مطابق ہونا چاہیے۔

7- خبر تحریر کرتے وقت سادگی اور سلاست کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مشکل اور پیچیدہ الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔

8- تکرارِ لفظی اور اعداد و شمار سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

9- مترادف و متضاد الفاظ، تشبیہات و استعارات، محاورات وغیرہ سے اجتناب برتنا چاہیے۔ ادبی زبان کے بجائے صحافتی انداز کو اپناتے ہوئے خبر کو تحریر کرنا چاہیے۔ عام آدمی کو سامنے رکھتے ہوئے روزمرّہ کی زبان استعمال کرنی چاہیے۔

10- غیر جانبداری خبر کا بنیادی لازمہ ہے۔ حقیقت کا بیان خبر کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے بارے میں مدیر، معاون مدیر، رپورٹر یا اخباری ادارے کی اپنی رائے نہیں ہونی چاہیے۔

11- خبر کی تکنیک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ابتدائیہ اور متن کے لوازمات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی ابتدائیے میں اگر ادھورا پن، قارئین کے تجسس کو بڑھانے کے لیے رکھا جائے تو متن میں مکمل تفصیل موجود ہونی چاہیے۔ اسی طرح خبر کی ہیئت کے مطابق مواد کو احسن طریقے سے ترتیب دینا چاہیے۔

❋❋

گیارھواں باب

اشتہار سازی یا تشہیر

موجودہ دور میں تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ معیشت اور صنعتی ترقی نے اشتہار سازی کی اہمیت کو ضرورت بنا دیا ہے۔ تشہیر کے ذریعے خرید و فروخت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پرانے وقتوں میں اشیا کی فروخت پھیری لگاتے وقت مختلف آوازوں کے ذریعے گاہکوں کو متوجہ کرنا، وال چاکنگ یا ڈھول پیٹ کر پیغام دینا تشہیر کی قدیم صورتیں ہیں۔ تشہیر سے مراد لوگوں کو خرید و فروخت کی طرف راغب کرنا ہے۔ دراصل عوام کو اشیائے صرف سے متعارف کروانے اور معلومات فراہم کرنے کا سب سے مفید ذریعہ تشہیر ہے۔ اس سلسلے میں ''فیروز اللغات'' میں درج ہے کہ: اشتہار دینا، مشہور کرنا، اشتہار کے ذریعے عوام کو مطلع کرنا۔

مصنف ''فرہنگِ آصفیہ'' نے تشہیر کے معنی لکھے ہیں: مشہور کرنا، شہرت دینا، آشکارا کرنا، ڈھنڈورا پیٹنا، شادی کرنا، کسی مجرم کا مُنھ کالا کر کے رُسوائی کے ساتھ گدھے کی سواری پر بازار در بازار پھرانا۔

''نور اللغات'' کے مطابق: اشتہار: اعلان، نوٹس۔ اُس چھپے ہوئے کاغذ کو بھی لیتے ہیں جس میں کسی امر کا اعلان ہو۔

''جامع نسیم اللغات اردو'' کے مطابق: اشتہار: اعلان یا اعلان کی غرض سے چھپا ہوا کاغذ، ہینڈ بل، اشتہار کے ذریعہ عام اطلاع دینا۔

''قومی انگریزی اردو لغت'' کے مطابق: اشتہار، مشتہرہ، اعلان یا پیغام جس کا مقصد یہ ہو کہ کسی چیز کی خوبیاں اور مطلوبہ فوائد لوگوں کو معلوم ہو جائیں خصوصاً وہ اعلان جس کا معاوضہ دیا گیا ہو اور جو کسی اخبار یا میگزین میں شائع ہوا ہو یا ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے نشر کیا گیا ہو، اشتہار بازی، کاروبارِ اشتہار (Advertising) کسی موضوع یا خدمت گزاری وغیرہ کی جانب اجرتی اعلانات، نشریات یا مطبوعہ مواد کے ذریعے لوگوں کی توجہ مبذول کرنا، اشتہارات کی ترتیب کاری، تحریر کاری، خاکہ بندی اور توقیت سے متعلق کاروبار وغیرہ۔

''ویبسٹر ڈکشنری انسائیکلوپیڈیا'' کے مطابق اشتہار کا مفہوم ہے:

1. A public notice, as in a news paper or on a radio, or television programme.
2. A giving notice: notification; information also advertisement.

   Advertising:
3. Any system or method of attracting public notice to an event to be

attended, or the desirability of commercial product for sale; promotion, also advertisement collectively.

4. The business of writing and publicizing advertisements; promoting also advertising.

چنانچہ تشہیر سے مراد عوام کو اشیائے صرف کے بارے میں اس طریقے سے معلومات فراہم کرنا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی طرف مائل ہوں بلکہ اشتہار اس قدر پرکشش ہو کہ قارئین یا سامعین اُس متعلقہ شے کے آرزومند ہو جائیں اور اس کو خرید لیں۔ گویا تشہیر سے مراد اشیائے صَرف سے نہ صرف مطلوبہ لوگوں کو متعارف کروانا ہے بلکہ اُن کو اس طرح راغب کرنا ہے کہ اُس شے کی ضرورت عوام سے وابستہ ہو جائے اور لوگ اس کے لیے روپے خرچ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اشتہار میں نہ صرف ضروری معلومات درج ہوں بلکہ وہ لوگوں کے ذوق و شوق، تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار کے مطابق بھی ہو، تبھی کشش کو مسلسل برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں عارضی کشش خرید و فروخت کے عمل پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے تو یہ بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ لوگ آپ کی شے کو دیکھیں پھر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بارے میں دلچسپی لیں اور پھر دلچسپی اس قدر بڑھے کہ وہ خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے لیے جہاں توجہ کا برقرار رکھنا ضروری ہے وہاں نظر اور ذوق کا مسلسل رہنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایک اچھے اشتہار میں نہ صرف کشش کا ہونا لازم ہے بلکہ اشیا کے بارے میں مکمل معلومات کے ساتھ اُن کے خریدنے کے ذرائع بھی موجود ہونا ضروری ہیں۔ ایک وقت تھا جب اشتہار بازی پر کچھ اعتراضات بھی ہوئے اور ماہرین معاشیات نے یہ بھی کہا کہ تشہیر سراسر وقت اور روپے کا زیاں ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جتنا روپیا پیسا اشیا کی تشہیر پر خرچ ہو جاتا ہے، اس سے اس شے کی پیداوار اور معیار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن موجودہ دور میں جس تیزی سے صنعتی ترقی ہوئی ہے اور سائنسی ایجادات نے انسان کو مصروف کر کے رکھ دیا ہے، ایسی صورت میں تشہیر ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے عوام کو اشیائے صرف سے بہتر طور پر نہ صرف متعارف کروایا جا سکتا ہے بلکہ مکمل معلومات بھی پہنچائی جا سکتی ہیں۔

تشہیر کے مقاصد: سائنسی اور صنعتی ترقی نے زمانے کی رفتار کو تیز تر کر دیا ہے۔ ہر صبح نئی نئی اشیا کا تعارف ہمارا منتظر ہوتا ہے۔ ان میں کچھ اشیا ہماری ضرورت کی ہوتی ہیں اور کچھ کو دیکھ کر ان اشیا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن ہم اُن کے بارے میں لاعلم ہوتے ہیں کہ وہ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟ اور اُن کے فوائد کیا کچھ ہو سکتے ہیں؟ اُن کی خوبیوں اور خامیوں سے تعارف اشتہارات کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ تشہیر کے مقاصد درج ذیل ہیں:

1- تشہیر کا مقصد عوام کو مارکیٹ میں آنے والی اشیا سے متعارف کروانا ہے۔

اشیا کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرنا ہے۔

-2 خرید و فروخت کے عمل کو آسان بنانا ہے۔

-3 عوام کو ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتے وقت کے تقاضوں سے متعارف کروانا ہے۔

-4 ایک فرد اور معاشرے کے تعلق کو استوار کرنا ہے کہ اگر کوئی فرد بدلتے وقت کے تقاضوں کے بارے میں کم علمی کا شکار

-5 ہے یا زمانے کے رجحانات کو نہیں سمجھتا تو وہ اشتہارات کے ذریعے سے سمجھ لیتا ہے۔

-6 جب کسی بھی شے کا اشتہار بنایا جاتا ہے تو اس شے کے استعمال کے طریقوں سے بھی متعارف کروایا جاتا ہے جس سے عوام اشیا کو استعمال کرنے کے صحیح طریقوں سے واقف ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹوتھ برش کے اشتہار میں دانتوں کو برش کرنے کے صحیح طریقے کے بارے میں بتایا گیا۔ اسی طرح چائے کے اشتہار میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ چائے بچوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔

تشہیر کے ذرائع: تشہیر میں اشتہار سازی کے ذرائع بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو اشیا کی مقبولیت میں کمی بیشی کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے صنعتی اور تجارتی ادارے یا اشیا کے مالکان کی ذرائع کی طرف خاص توجہ ہوتی ہے۔ اشتہار سازی کے بڑے بڑے ذرائع درج ذیل ہیں:

اخبارات: اخبار بڑی تعداد میں چھپتے ہیں اور اس کا ٹارگٹ بہت سے عوام ہوتے ہیں۔ اخبارات ہر طبقے اور شعبے کے فرد کے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔ اس لیے یہ تشہیر کا ایک بڑا اور کارآمد ذریعہ ہے۔ بعض اوقات لوگ خصوصی طور پر اشتہارات دیکھنے کے لیے بھی اخبارات خریدتے ہیں اور اخبار کی قیمت بھی اتنی زیادہ نہیں ہوتی، اس لیے عوام سستے داموں مختلف اشتہارات سے مستفید ہوتے ہیں۔

رسائل: تعلیم و تدریس کا معاملہ ہو یا فیشن اور ملبوسات کا، رسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علمی، ادبی، سائنسی، سیاسی، رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی تعلیمی ادارے کا سٹاف روم ہو یا ڈاکٹر کے کلینک کا ویٹنگ روم، رسائل کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ان رسائل میں طرح طرح کے اشتہارات نہ صرف رسائل کے اجرا میں مددگار ثابت ہوتے ہیں بلکہ رسائل کی خوبصورتی اور مقبولیت میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ رسالہ یا میگزین جہاں بھی موجود ہو، لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لیے انھیں تشہیر کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ٹیلی وژن: ٹیلی وژن کے ذریعے وسیع پیمانے پر تشہیر کی جا سکتی ہے۔ ٹیلی وژن کے رنگارنگ پروگراموں کے دوران میں آنے والے اشتہارات عوام میں مقبولیت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ اشیائے مالکان پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اشتہار کے لیے کتنا وقت لیتے ہیں۔ کون سے پروگرام کے دوران میں اُن کا اشتہار چلایا جاتا ہے، کیوں کہ وقت کے حساب یا

مناسبت سے معاوضہ مقرر کیا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ پروگرام عوام میں مقبول ہوگا، اسی قدر اُس کے دوران میں چلنے والے اشتہار کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور اس جنس کی خرید و فروخت کا رجحان بڑھے گا۔ اس لیے اس میں وقت کا بہتر انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ریڈیو: ریڈیو ایک اہم ذریعۂ تشہیر ہے۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران میں گاڑیوں میں ریڈیو سننے کے رجحان میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے درمیانی عرصے میں جو ریڈیو کی مقبولیت ماند پڑی تھی وہ اب دو چند ہوگئی ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران میں خاص طور پر ریڈیو سُنا جاتا ہے اور اس اثنا میں چلنے والے اشتہارات کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اب تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ریڈیو سنتے ہوئے اشتہار ساتھ ساتھ گنگنایا بھی جا رہا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈیو میں اگرچہ بصری رابطہ نہیں ہوتا لیکن آوازوں کے ذریعے بھی تشہیر کا عمل کامیابی سے جاری رہتا ہے اور دیرپا اثرات رکھتا ہے۔ ریڈیو میں صوتی اثرات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر ریڈیو کے پروگراموں کی کامیابی کا انحصار پروگرام کے میزبان پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اکثر میزبان اشتہار سے پہلے اور بعد میں جو تاثر دیتے ہیں، وہ بھی عوام پر اثر کرتا ہے۔ اس لیے اس میں اشتہار کی پیش کش کی جگہ بہت معنی رکھتی ہے کہ کس پروگرام کے دوران میں اشتہار پیش کیے جا رہے ہیں۔

انٹرنیٹ: موجودہ دور میں انٹرنیٹ کا استعمال ضرورت بن گیا ہے۔ ایسے میں مختلف اہم سائٹس کھولتے ہوئے بہت سے اشتہارات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ Google, Hotmail, Yahoo, urdupoint.com اور Face Book کہیں بھی جانا ہو بہت سے اشتہارات نظر سے گزرتے ہیں۔ بعض اوقات انسان انھی میں کھو کر رہ جاتا ہے اور اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دورِ جدید میں انٹرنیٹ تشہیر کا بہت وسیع اور اہم ذریعہ ہے۔

موبائل: تشہیر کا کام آج کل موبائل پر پیغامات بھیج کر بھی کیا جاتا ہے۔ sms کے ذریعے ہم مارکیٹ میں آنے والی بہت سی اجناس (پروڈکٹس) کے بارے میں جانتے ہیں۔ معلومات حاصل کرتے ہیں اور اکثر اوقات خریدتے بھی ہیں۔ اشیا کی قیمتوں میں کمی بیشی کے بارے میں بھی پیغام ہمیں موبائل پر وصول ہو جاتے ہیں۔ سیل کے شروع اور ختم ہونے کے بارے میں پتا چل جاتا ہے۔ مثلاً میں نے کشش بوتیک (Kashish Boutique) کے دیدہ زیب ملبوسات اور Breeze کے موسمی ملبوسات کے آنے کی اطلاع کا پیغام موبائل کے ذریعے ہی وصول کیا۔ اسی طرح Salt n Pepper لبرٹی مارکیٹ لاہور کی پارکنگ بننے کی اطلاع بھی موبائل کے ذریعے ہی وصول ہوئی۔ موبائل چوں کہ ہر وقت استعمال میں رہتا ہے اس لیے یہ تشہیر کا کارآمد ذریعہ ہے۔

ہینڈ بل، پمفلٹ، بینر: تشہیر کا یہ طریقہ ہر چند قدیم ہے مگر اب تک مقبول ہے۔ گھروں، دفاتر، سڑکوں پر، گاڑیوں پر، یہ

سرعت سے تشہیر کا کام کرتے ہیں۔ ان سے اشیا کے بارے میں مکمل معلومات ملتی ہیں۔

وال چاکنگ: یہ رجحان اب قدرے کم ہو گیا ہے لیکن کچھ علاقوں میں ابھی تک جاری ہے۔ جہاں دیواروں پر لکھ کر اشیا کے بارے میں معلومات دی جاتی ہیں۔

نیون سائن بورڈز، ہورڈنگز: یہ تشہیر کا مقبول ذریعہ ہے۔ اکثر لوگ دورانِ سفر میں، سڑکوں پر انھیں دیکھ کر اپنے لیے خرید و فروخت کا ذہن بناتے ہیں۔ عام طور پر شہروں کی مصروف طرزِ زندگی میں یہ بورڈز بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نئی شے جیسے ہی دکان پر آتی ہے، اس کے بورڈز پہلے ہی سڑکوں پر آویزاں کر دیے جاتے ہیں۔ اس میں بھی سڑک یا جگہ کا انتخاب بہت معنی رکھتا ہے۔ جہاں زیادہ آمد و رفت ہو، عام طور پر وہیں یہ ہورڈنگز کامیاب رہتے ہیں۔

سینما: سینما ایک سستی تفریح ہے۔ فلم میں وقفے کے دوران میں اشتہارات عوام میں مقبولیت کا باعث بنتے ہیں اور اس سینما گھر کے باہر اور اندر لگنے والے پوسٹرز بھی تشہیر میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

نمائشی میلے: قومی، ملکی، علاقائی، صوبائی اور بین الاقوامی نمائشی میلوں کے ذریعے بھی تشہیر کی جاتی ہے۔ کتابوں، ملبوسات، فیشن، کھیل اور تہذیبی اور ثقافتی میلوں کے دوران میں بعض اوقات کوئی ایک یا ایک سے زیادہ افراد اپنی مخصوص جنس یا شے کی تشہیر کے لیے اُس کا خرچہ اٹھا لیتے ہیں اور ان میلوں کے ذریعے اپنی شے کی تشہیر، بینر، بورڈز، پمفلٹ بنا کر اور جگہ جگہ آویزاں کرتے ہیں۔ اس طرح سے اشیا کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ میلوں میں آنے والے لوگ ان اشیا سے واقف ہوتے ہیں اور اگر یہ دلوں کو لبھا لیں تو ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مثلاً اکثر میلوں میں کوئی ڈرنک مفت تقسیم کر دی جاتی ہے یا کافی (Coffee) کا سٹال لگا کر نہ صرف مفت پلائی جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساشے تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کتابوں کی نمائش کو کوئی پبلشر، سپانسر کرتا ہے اور اس کا انتظام بہتر طریقے سے کرتا ہے تو وہ ادارہ نمائش کے ذریعے سے علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اس جگہ کو جہاں پر میلہ ہو، ہر اینگل سے بینر لگا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ اسے بار بار دیکھیں، پڑھیں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔

درج بالا نمایاں اشتہار سازی کے ذرائع کے علاوہ دیگر ذرائع میں کیلنڈر، ڈائریاں، پن، پنسل، گھڑیاں، بیگ، کی رنگز، خط کتابت، ڈاک، کتابچے، ایش ٹرے، شرٹس، ماڈل، ٹرانسپورٹ، ویڈیو کیسٹ وغیرہ شامل ہیں۔

عام طور پر ادارے تشہیر کے لیے، اشتہار ساز کمپنی سے رابطہ کر کے یا تحقیق کر کے ایک تشہیری کمیٹی کی تشکیل کرتے ہیں تاکہ وسیع پیمانے پر [illegible] بات سب سے زیادہ اہم

ہوتی ہے کہ اس صنعت یا کارخانے کا ٹارگٹ کیا ہے؟ شے کا معیار یا تعداد، کیا وہ مخصوص لوگوں تک معیاری شے زیادہ روپوں میں پہنچانا چاہتے ہیں یا اُن کا ٹارگٹ کم روپوں میں زیادہ سیل ہے۔ ان تمام نکات کو سامنے رکھ کر ہی تشہیر کی بہتر منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔

اشتہار سازی کے فوائد: اشتہار سازی کے بہت سے فائدے ہیں جو درج ذیل ہیں:

1- اشتہارات کے ذریعے ہمیں مارکیٹ میں آنے والی نت نئی چیزوں کے بارے میں پتا چلتا ہے یعنی ہمارا ان سے تعارف ہوتا ہے۔

2- تشہیر کے ذریعے ہمیں اشیا کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

3- تشہیر کے ذریعے لوگوں میں جب کوئی شے مقبول ہوتی ہے تو اُس کی خرید وفروخت میں اضافہ اس کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح سے فیکٹریوں اور کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سے لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔

4- تشہیر کی مدد سے ہم بہت سی ایسی اشیا اور مقامات سے واقف ہوتے ہیں جن تک ہماری رسائی بظاہر ناممکن نظر آتی ہے۔ بعض مختلف فرموں اور اداروں کی طرف سے سہولیات سے واقفیت بھی اشتہارات کے ذریعے ہوتی ہے۔

5- تشہیر میں حصہ لینے والے تمام افراد اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ مثلاً مالکان، ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں، اشتہار بنانے والے، اس میں کام کرنے والے، اس اشتہار سے متاثر ہونے اور پیداوار بنانے والے۔ اس طرح ایک اشتہار بہت سے افراد کی ذہنی نفسیاتی اور مالی آسودگی کا باعث بنتا ہے۔

6- اشتہار کے ذریعے ہم تاریخی، روایتی، مذہبی اقدار سے واقف ہوتے ہیں۔ جیسے سپریم چائے کے اشتہار میں سید امتیاز علی تاج کے ڈرامے انارکلی کا قصہ، اسی طرح شان بناسپتی گھی ہماری روایت اور کلچر اور Dairy Milk Chocolate میں ہمارا رہن سہن، رشتوں میں اپنائیت اور مولٹی فوم کے اشتہار میں ہماری تہذیب نظر آتی ہے۔

7- بعض اوقات اشتہارات کے ذریعے کچھ ایسی پروڈکٹس کے استعمال سے روکا جاتا ہے جن کے عام استعمال کے نقصانات سے ہم ناواقف ہوتے ہیں بلکہ انرجی سیور، بلب اور عام بلب کے استعمال کے بارے میں بتایا جانا عوام کے لیے بہت مفید رہا۔ اسی طرح بعض ملکی سطح پر فائدہ پہنچانے والے اشتہارات مثلاً چھ بجے کے بعد استری اور ہیٹر

چلانے سے منع کرنے کا، اے سی کا درجہ حرارت 26 ڈگری سنٹی گریڈ تک رکھنے کا اشتہار بھی عوام میں بے حد مقبول ہوا۔ جس سے بجلی کی بچت کے بارے میں عوام کو مختلف طریقوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔

8- اشتہار کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے، اس کو بنانے والی کمپنی ہمیشہ یہ کوشش کرتی ہے کہ اس میں جدت اور ندرت ہو، تا کہ لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا جا سکے۔ اس لیے اشتہارات کے ذریعے جہاں عوام کو اشیائے ضرورت سے آگاہی ملتی ہے، وہاں خوب صورت اور وجیہہ چہرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ موجودہ دور کے نئے طریقوں، انداز اور طرز زندگی سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ فیشن اِن اور آؤٹ اور نئے ٹرینڈز کا پتا چلتا ہے۔

9- اشتہارات عوام کی دلچسپی اور تفریح کا باعث بھی بنتے ہیں۔ اشتہارات کی افسانوی دنیا قارئین، ناظرین اور سامعین کے لیے تسکین کا باعث بنتی ہے اور اچھے اشتہار عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔

10- اشتہارات کے ذریعے گاہکوں کو آسانی بہم پہنچائی جاتی ہے۔ ان کا قیمتی وقت بچایا جاتا ہے۔ اشیا کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر کے خرید و فروخت کی طرف مائل کیا جاتا ہے، جس سے لوگوں کو خریداری میں سہولت ہوتی ہے۔

11- تشہیر نہ صرف معاشرے میں موجود تمام لوگوں کے لیے خریداری میں سہولت کا باعث بنتی ہے بلکہ معاشرے میں بعض افراد جو تنہا ہوتے ہیں یا بہت مصروف ہوتے ہیں لیکن پرکشش دکھائی دینا چاہتے ہیں اور سوسائٹی میں بہتر طریقے سے رہنا چاہتے ہیں، وہ افراد ان اشتہارات کی مدد سے کم وقت میں کسی دوسرے فرد کی رائے کے بغیر اچھی خریداری کر لیتے ہیں، کیوں کہ ایک معیاری اشتہار میں "شے کے بارے میں تمام معلومات موجود ہوتی ہیں اور وہ اس انداز سے دیکھنے اور پڑھنے کو متاثر کرتی ہیں کہ وہ چیز کو خریدے بغیر نہیں رہ سکتا۔

12- تشہیر فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ فرض کریں کہ اگر کوئی فرد ایک جگہ پر نیا ہو اور وہاں کے کلچر، رہن سہن، لباس، طرزِ زندگی سے ناواقف ہو تو وہ اشتہارات کی مدد سے اُس جگہ کے، وہاں کے لوگوں کے رجحانات، لباس، تہذیب، پسند اور ناپسند سے واقف ہو سکتا ہے اور نہ صرف ان اشیا کو خرید سکتا ہے بلکہ اُن کو اپنانے کے انداز سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ اشتہار سازی کے بہت سے فوائد ہیں جن میں سے انسان میں اشیا کی کشش پیدا کر کے خریدنے کی طرف راغب کرنا بھی شامل ہے، جو انسان میں زندگی بلکہ عملی زندگی کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے، جس سے انسان تسکین حاصل کرتا ہے۔ اس لیے تشہیر کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

13- اشتہارات کی مدد سے بہت سے فلاحی اداروں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے ادارے مثلاً اخبارات، رسائل، ٹی وی، سینما، ریڈیو یا ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں اشتہارات کی مدد سے بہت سارا روپیا اکٹھا کر لیتی ہیں اور پھر انھیں فلاحی

کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ معذور افراد کے لیے ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔ فلاحی اداروں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور یوں ان اشتہارات کی وجہ سے اکٹھا ہونے والے روپے سے معاشرے میں فلاحی خدمات انجام دی جاتی ہیں۔

14- اشتہارات سے سڑکوں، بازاروں، شہروں کو سجایا جاتا ہے۔ روشنیاں لگائی جاتی ہیں جس سے شہر کی نہ صرف خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ چلتے پھرتے عوام نت نئی اشیا سے متعارف ہوتے ہیں۔

15- مارکیٹ میں مقابلے کے رجحان نے اشیا کی کوالٹی کو بہتر بنانے میں مدد کی ہے۔ اس طرح عوام کو ہر شے کا علم اشتہارات کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ مثلاً غیر معیاری اشیا بنانے والے کارخانوں کے بارے میں علم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مقابلے اور مسابقت نے مالکان کو اشیا کے معیار کو بہتر بنانے پر مجبور کر دیا ہے، جیسے گورے بیکری کے کچن کی ویڈیو بازار میں آ جانے سے وقتی طور پر لوگوں نے دھیان دیا لیکن اس کے تردیدی بیانات اور کچن کے معیاری ثبوت نے لوگوں کو پھر سے اُس کی طرف مائل کر دیا۔ یہ ویڈیو بھلے سے بالکل Fake تھی لیکن اس سے شہر کے تمام بیکرز کے کان کھڑے ہو گئے اور عوام کو معیاری اشیا کی دستیابی یقینی ہو گئی۔

اشتہار سازی کے نقصانات:

1- اشتہار سازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے عوام میں منفی رجحانات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب ایک آدھ مرلے کے گھر میں لگے تخت پر بیٹھے آٹھ بچے ٹیلی وژن میں چلنے والا پرتعیش ماحول میں بننے والا اشتہار دیکھتے ہیں تو ان پر کئی طرح کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کوئی ان میں سے چور، کوئی ڈاکو، کوئی جیب کترا، کوئی احساسِ کمتری میں ڈوبا ہوا بے بس انسان بن جاتا ہے۔ اس لیے اشتہارات نے اس طبقے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

2- اشتہارات کی دنیا نے اپنا الگ ہی دیس بنا لیا ہے، جس کا بسا اوقات حقیقی دنیا سے تعلق نہیں ہوتا اور یہ خواب و خیال کا سفر جب ٹوٹتا ہے تو نہ دنیا رہتی ہے اور نہ ہی آخرت۔ اس لیے سب سے زیادہ نقصان ان اشتہارات میں کام کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کو پہنچتا ہے۔

3- اشتہارات کے ذریعے سے بعض بہت سی غیر معیاری اشیا کو اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ عوام اس کے نقصانات کی طرف سے بے خبر ہو کر مہنگے داموں غیر معیاری اشیا کو خرید لیں۔

4- اشتہارات میں مذہب اور کلچر سے ہٹ کر طرزِ زندگی دکھایا جاتا ہے جس سے خاص طور پر نئی نسل بری طرح متاثر ہو کر اپنی اقدار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

5- اشتہارات میں استعمال ہونے والی زبان، لباس اور اشارے ہماری قومی اور ملکی شناخت کے بالکل برعکس ہوتے ہیں،

جس سے یہ شعور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری اور غیر ملکی تہذیب میں فرق کیا ہے۔ ہمارے بچے کیا اور بڑے کیا، اندھا دھند غیر ملکی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں۔

-6 عورت کا بے جا استعمال، عریانیت، فحاشی کو اشتہارات کے ذریعے ہمارے کلچر کا حصہ بنایا جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

-7 اشیائے صرف کی بجائے مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ پر روپیا خرچ کرنے کا رجحان بھی معاشرے کے لیے مُضر ہے جس سے غیر معیاری اور گھٹیا اشتہار کو عوام میں مقبول بنایا جا رہا ہے۔ یہ روپیا اشیا کے معیار کو بہتر بنانے کی مد میں خرچ ہو سکتا ہے۔

-8 ایسی اشیا جو صحت کے لیے مضر ہیں، ان کی تشہیر کے لیے ایسے ماڈل کو لینا جو بہت مقبول ہو، یہ معاشرے کے لیے خاص طور پر نئی نسل کے لیے، نقصان دہ ہے۔ مثلاً ریڈی میڈ گارمنٹس کے اشتہار یا مُضر مشروبات کے اشتہارات میں نئی نسل کے ہیروز کو لینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس سے خاص طور پر نوجوان بچے متاثر ہوتے ہیں۔

-9 ملک میں بجلی کے بحران کے باوجود یہ اشتہارات روشن و متحرک رہتے ہیں کیوں کہ ان کے مالکان نے بھاری معاوضہ دے کر یہ بجلی خریدی ہوتی ہے۔ یہ بھی عوام کے ساتھ زیادتی ہے۔

-10 بعض مصنوعات کی تشہیر سے جو عوام ان کو حاصل نہیں کر سکتے، ان میں فرسٹریشن بڑھتی ہے اور معاشرے میں منفی کردار جنم لیتے ہیں۔

-11 اشتہارات معاشرے میں رجحانات کو بنانے اور بگاڑنے میں مدد کرتے ہیں، اس لیے ہماری نئی نسل کی زبان، لباس، رہن سہن میں بگاڑ ان اشتہارات کی وجہ ہی سے ہے۔

-12 اشتہارات کی مدد سے غیر معیاری اشیا کو مہنگے داموں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک شے کے ساتھ ایک مفت کا لالچ دے کر بھولے بھالے عوام کو پھانس لیا جاتا ہے، جس سے ایک طرف تو اُن میں لالچ پیدا ہوتا ہے، جو اخلاقی تباہی کا باعث بنتا ہے اور دوسری طرف وہ غیر معیاری اشیا کے استعمال سے نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔

بارھواں باب

کہانی یا افسانے کی ڈرامائی تشکیل

یہ حقیقت ہے کہ تمام تر تخلیقی ادب کے بنیادی ماخذ تین ہیں:

1- تجربہ (Experience)　2- مشاہدہ (Observation)　3- متخیلہ یا تخیل (Imagination)

کسی بھی تخلیقی ادب پارے کی بنیاد ان میں سے کسی ایک یا دو ماخذوں پر ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات یہ تینوں عناصر مل کر کسی فن پارے کی تکمیل کرتے ہیں۔ افسانے اور ڈرامے میں بھی کم و بیش یہی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

ڈرامے اور افسانے میں فرق:

ادب میں افسانے اور ڈرامے، دونوں کا تعلق فکشن سے ہے، دونوں کی بنیاد کسی نہ کسی کہانی یا واقعے پر ہوتی ہے، لیکن دونوں کی پیشکش تکنیکی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے، جس کا ہم ذیل کی سطور میں جائزہ لیتے ہیں۔

- ڈراما، یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "کر کے دکھانا" کے ہیں۔ افسانے اور ڈرامے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ افسانہ کسی ایک کردار یا خود مصنف کی زبان سے بھی بیان ہو سکتا ہے، جب کہ ڈرامے میں تمام تر کہانی یا صورتِ حال کو مختلف کرداروں کی حرکات و سکنات سے واضح کیا جاتا ہے۔
- افسانہ، ایک بیانیہ ہے جب کہ ڈراما زندگی گزارنے کا عمل ہے۔
- افسانہ بنیادی طور پر پڑھی یا زیادہ سے زیادہ کسی محفل میں سنائی جانے والی چیز ہے، جب کہ ڈراما قول سے زیادہ عمل کا تقاضا کرتا ہے۔
- افسانہ زندگی کی لفظی تصویر جب کہ ڈراما زندگی کی عملی تصویر کا نام ہے۔
- ڈراما، افسانے کی نسبت مشکل اور باریک بینی کا متقاضی ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں افسانے کے برعکس، مکالے کی ادائیگی اور کرداروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ منظر نامہ بھی تحریر کرنا پڑتا ہے، جس میں بعض اوقات سٹیج یا مقام کی مکمل جزئیات، کرداروں کا لباس اور حلیہ نیز ان کے موڈ، مزاج اور چہرے کے تأثرات کی بھی وضاحت کرنا پڑتی ہے۔ معروف افسانہ و ڈراما نگار اشفاق احمد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عموماً اپنے ڈراموں کے ایک ایک منظر کے ساتھ بعض اوقات چار چار صفحات کا منظر نامہ (Scenario) تحریر کیا کرتے تھے۔
- کسی افسانے یا ناول کی ڈرامائی تشکیل کرتے وقت متعدد مقامات پر ڈرامائی مفاہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان پر معروف لوک کہانی، علی بابا چالیس چور، کی ڈرامائی تشکیل ہو رہی تھی۔ اس کہانی

میں ایک نہایت اہم کردار ایک موچی بابے کا ہے، جو اپنی بیٹھک میں آدھی آدھی رات تک جوتے سیتا ہے۔ وہ کردار نہ صرف پُراسرار ہے بلکہ علی بابا کے بہت سے رازوں سے بھی واقف ہے۔ ڈرامے کی ریکارڈنگ کے وقت یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ موچی بابے کے کردار یا اس جملے:

''آدھی رات کو جب چاروں جانب ہُو کا عام تھا، ایک بوڑھا موچی اپنی بیٹھک میں بیٹھا جوتے سی رہا تھا۔''

کو سامعین تک کیسے پہنچایا جائے؟ کیوں کہ ریڈیو میں تو پیشکش کا سارا دارو مدار آواز پر ہوتا ہے، اب سوئی سے جوتے سینے کے عمل کو ٹیلی وژن پہ تو دیکھا جا سکتا ہے، کتاب میں بھی لکھا جا سکتا ہے، اور کہانی سنانے والا بھی اپنی زبان سے اس منظر کی وضاحت کر سکتا ہے، لیکن ریڈیو سے اس کردار یا صورتِ حال کی پیشکش مشکل عمل تھا۔ آخر بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ موچی کو درزی کے کردار میں بدل دیا جائے، جس کی مشین کی آواز کردار کی نشاندہی کر سکتی ہے۔

افسانہ نگار اپنی نگارش میں نہایت آسانی اور روانی سے اس طرح کے جملے تحریر کرتا چلا جاتا ہے کہ: پھر اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا/ ایک دفعہ کا ذکر ہے/ وہ بھی کیا وقت تھا جب....../ اس کے بعد وہ لندن، واشنگٹن، پیرس یا آگرہ جا کے رہنے لگا/ تاریخ گواہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بظاہر نہایت سادہ اور آسان جملے ہیں لیکن ان رواں اور سہل جملوں کی ڈرامائی تشکیل اکثر اوقات پروڈیوسر، ڈائریکٹر کے لیے پہاڑ ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما نگار کو سکرپٹ لکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر چند مختصر افسانوں کی ڈرامائی تشکیل پیش کی جاتی ہے۔ انھیں بہ غور پڑھ لینے سے کسی افسانے کی ڈرامائی تشکیل میں بڑی مدد ملے گی۔

❁

افسانہ

پیش بندی

سعادت حسن منٹو (1913ء-1955ء)

پہلی واردات ناکے والے ہوٹل کے پاس ہوئی۔ فوراً ہی وہاں ایک سپاہی کا پہرہ لگا دیا گیا۔ دوسری واردات، دوسرے ہی روز شام کو سپر سٹور کے سامنے ہوئی۔ سپاہی کو پہلی جگہ سے ہٹا کر دوسری واردات کے مقام پر تعینات کر دیا گیا۔ تیسرا کیس رات کے بارہ بجے لانڈری کے پاس ہوا۔ جب انسپکٹر نے سپاہی کو اُس نئی جگہ پہرہ دینے کا حکم دیا تو اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا:

''سر! آپ مجھے وہاں کیوں نہیں کھڑا کرتے، جہاں نئی واردات ہونے والی ہو؟''

ڈرامائی تشکیل

سین نمبر:1

(اِن ڈور) وقت: سہ پہر

کردار: ڈیوٹی حوالدار، سپاہی (منظور احمد)

منظر: (تھانے کے ایک چوکور کمرے میں بیٹھا ڈیوٹی حوالدار شہر کے مختلف حساس مقامات پر سپاہیوں کو ڈیوٹیاں تفویض کر رہا ہے۔ وہ ایک ایک سپاہی کو پکارتا جاتا ہے، اس سے رجسٹر پر دستخط لیتا ہے اور اسے رات کی ڈیوٹی کا مقام بتا کر روانہ کر دیتا ہے۔)

مکالمہ:

ڈیوٹی حوالدار: سپاہی محمد منظور!

سپاہی: لیس سر!

ڈیوٹی حوالدار: اوئے جُھورے! تمھیں کچھ پتہ ہے کہ پچھلی رات بھیجے والے ہوٹل کے پاس ڈاکہ پڑا ہے؟

سپاہی: پتہ ہے سر جی!

ڈیوٹی حوالدار: بس آج رات تمھاری اسی جگہ ڈیوٹی ہے۔

سپاہی: جی سر جی!!

سین نمبر:2

(اِن ڈور) وقت: سہ پہر

کردار: ڈیوٹی حوالدار، سپاہی (منظور احمد)

منظر: (تھانے کا وہی چوکور اور بوسیدہ کمرا)

مکالمہ:

ڈیوٹی حوالدار: سپاہی محمد منظور!

سپاہی: حاضر جناب!

ڈیوٹی حوالدار: اوئے جُھورے! تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ کل شام و شام ہی سُپر سٹور کے سامنے واردات ہو گئی تھی؟

سپاہی: بالکل پتہ ہے جی!

ڈیوٹی حوالدار: تو آج پھر تم اسی سُپر سٹور کے پاس ڈیوٹی کرو گے۔

سپاہی: جو حکم میری سرکار!!

سین نمبر:3

(اِن ڈور) وقت: سہ پہر

کردار: ڈیوٹی حوالدار، سپاہی (منظور احمد)

منظر: (تھانے کا ٹوٹے پھوٹے فرنیچر والا چوکور کمرا، جس میں ایک کرسی پر پتلون کے اوپر بنیان پہنے حوالدار، ماتحت عملے سے مخاطب ہے۔)

مکالمہ:

ڈیوٹی حوالدار: سپاہی محمد منظور!

سپاہی: آ گیا سر جی!

ڈیوٹی حوالدار: اوئے جُھورے! تمھیں پتہ ہے رات کو لانڈری کے پاس سیاپا پڑ گیا ہے؟

سپاہی: پتہ چل گیا ہے سر جی!

ڈیوٹی حوالدار: تو آج پھر اپنی ڈیوٹی اُسی لانڈری کے پاس سمجھو!

سپاہی: سر جی! گستاخی نہ ہو تو ایک بات عرض کروں؟

ڈیوٹی حوالدار: بولو بولو...... پُھوپُھو!!! لیکن ایک بات یاد رہے چُھٹی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سپاہی: وہ تو مجھے پتہ ہے سر جی! لیکن بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ہر روز میری ڈیوٹی، اس جگہ لگاتے ہیں جہاں واردات ہو چکی ہوتی ہے۔ آپ مجھے کسی ایسی جگہ تعینات کیوں نہیں کرتے، جہاں واردات ہونے کا خدشہ یا امکان ہوتا ہے۔

(سپاہی کی بات سن کر حوالدار کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

❁

<u>افسانہ</u>

جُوتا

سعادت حسن منٹو (1913ء-1955ء)

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے منہ پر تارکول مَل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کیے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لیے آگے بڑھا مگر پولیس آ گئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا، چناں چہ مرہم پٹی کے لیے اُسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

ڈرامائی تشکیل

سین نمبر: 1

(آؤٹ ڈور) وقت: دوپہر

کردار: پہلا شخص، دوسرا شخص، تیسرا شخص، چوتھا شخص

منظر: (بتوں اور مجسموں کی توڑ پھوڑ کے لیے پُر جوش تقریریں کرنے والے لوگوں کا ایک جلوس چیئرنگ کراس سے فاطمہ جناح روڈ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مشتعل ہجوم سے اس طرح کی آوازیں آرہی ہیں۔)

پہلا شخص: لاٹھیاں مار مار کے توڑ دو اس کمینے کو!!!

دوسرا شخص: اس پر اتنی اینٹیں اور پتھر برساؤ کہ اس کی شکل نہ پہچانی جائے۔

تیسرا شخص: ذرا تارکول کا ڈبہ اٹھاؤ اور اس کا منھ کالا کر دو......

چوتھا شخص: وہ جوتوں کا ہار کدھر ہے جو اِس خبیث کے گلے میں ڈالنا ہے؟؟؟

سین نمبر:2

(آؤٹ ڈور) وقت: دوپہر

منظر: جلوس کی خبر سن کر پولیس وہاں پہنچتی ہے، مشتعل اور بے قابو افراد کو نقصان سے باز رکھنے کے لیے آنسو گیس اور گولیوں کا استعمال کیا جاتا ہے، جس سے جوتوں کا ہار پہنانے والا شخص شدید زخمی ہو کر گر پڑتا ہے اور ہجوم سے صدا اٹھتی ہے ....)

پہلا شخص: یار اس کا تو بہت خون بہہ گیا، کہیں مر ہی نہ جائے!!!

دوسرا شخص: اب اس کا کیا کِیا جائے؟؟؟

تیسرا شخص: چلو اسے اُٹھا کر گنگا رام ہسپتال لے چلتے ہیں، شاید جان بچ جائے۔

(پردہ گرتا ہے)

❁❁

تیرھواں باب

مضمون نویسی

مضمون نویسی اہم صنفِ نثر ہے۔ اس کی تعریف، اہمیت، لوازمات اور اردو میں مضمون نویسی کے ارتقا کی تفصیل اصنافِ نثر میں پیش کر دی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ اسے ایک بار پھر پڑھ لیں۔

مضمون، نثر کی ایسی قسم ہے جس میں کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ مضمون میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس موضوع پر آپ لکھ رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ کتنی معلومات رکھتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

ہر مضمون ہمیشہ تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

ابتدائیہ: موضوع کے انتخاب کے بعد مضمون کی ابتدا میں موضوع کا تعارف لکھا جاتا ہے۔ ابتدائیہ نہایت جامع اور مختصر ہونا چاہیے اور ایسے دل نشین انداز میں لکھنا چاہیے کہ اس کے پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف نفسِ مضمون سے ایک حد تک آگاہ ہو جائے بلکہ وہ اپنے آپ کو آیندہ مضمون پڑھنے کے لیے بھی آمادہ پائے۔

نفسِ مضمون: یہ حصہ مضمون کی مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کو ایک خاص ترتیب کے مطابق پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھے۔ مشکل الفاظ و تراکیب کے بجائے سادہ، عام فہم اور بول چال کی زبان لکھے، البتہ جہاں ضروری ہو وہاں تشبیہات، اشعار، ضرب الامثال، مشاہیر کے قول اقوال، احادیث اور قرآنی آیات سے بھی کام لے مگر ایک بات کو بار بار نہ دہرائے۔ جہاں تک ممکن ہو املا و انشا کی اغلاط سے بچے اور جملوں کو بے ربط نہ ہونے دے کیوں کہ زبان کی اغلاط سے مضمون کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔

اختتام: مضمون کے خاتمے پر موضوع کی تمام تفاصیل کو سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کرنا چاہیے۔ مضمون کا خاتمہ ایسا مؤثر اور دل پذیر ہونا چاہیے کہ موضوع کے تمام ضروری نِکات قاری کی نظروں کے سامنے آ جائیں۔

آیندہ صفحات میں نمونے کے چند مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

Communicative Urdu (ابلاغِ اردو) کی فائنل ٹرم اور یونیورسٹی میں بی ایس آنرز (اُردو) کے امتحانات کے تقاضوں کے پیشِ نظر ہر مضمون دو سو سے تین سو الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ انھیں بغور پڑھیے اور پھر اس نوعیت کے مضامین لکھنے کی مشق کیجیے۔

یاد رکھیے کسی بھی موضوع پر مضمون اس وقت لکھا جاتا ہے جب آدمی اس موضوع سے متعلق ضروری معلومات یکجا کر لیتا ہے اور پھر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مضمون لکھ کر اپنے اساتذہ کرام سے مشورہ طلب کیجیے۔ اس طرح آپ کے لیے مضمون لکھنا آسان اور دل چسپ ہو جائے گا۔ انسان کے دل میں طلب صادق ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

❁

پابندیِ وقت

کسی کام کو بروقت انجام دینا پابندیِ وقت کہلاتا ہے۔ دنیا میں فقط وہی شخص کامیاب اور مطمئن زندگی بسر کرتا ہے، جو وقت کا پابند ہے۔ بادشاہ ہو یا وزیر، حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، زمیندار ہو یا مزارع، کارخانہ دار ہو یا مزدور، استاد ہو یا طالب علم، سب وقت کی پابندی کرتے ہیں تو اپنے مقصد کو پالیتے ہیں۔ ورنہ دنیا میں محض بھیڑ کرنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مشہور فاتح نپولین کا سپہ سالار میدانِ جنگ میں چند منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے شکست ہوئی اور نپولین کو اس تاخیر کی سزا ساری عمر بھگتنا پڑی۔

وقت بہت قیمتی شے ہے۔ اس کو ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہیے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ کمان سے نکلا ہوا تیر، مُنھ سے نکلی ہوئی بات، دریا کا گزرا ہوا پانی، ہوا کا گزرا ہوا جھونکا اور گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ:

جو وقت گزر گیا اکارت افسوس ہوا خزانہ غارت

اگر ہم اپنے گردوپیش پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مظاہرِ فطرت بھی ہمیں وقت کی پابندی کا درس دیتے ہیں۔ سورج اور چاند کا طلوع وغروب، دن رات کا ڈھلنا، موسموں کا تغیر وتبدل، فصلوں، پھلوں اور سبزیوں کا موسم کے مطابق پکنا، وقت کی پابندی کے تحت ہوتا ہے۔ گویا وقت کی پابندی فطرت کا منشا اور نظامِ قدرت کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا اطلاق فرد پر بھی ہوتا ہے اور قوم پر بھی۔ جو کوئی اس پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہی عزت ووقار پاتا ہے۔ ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج دنیا میں امریکہ، بعض یورپی ممالک کینیڈا، چین، جاپان اور آسٹریلیا اقوامِ عالم میں بلند رتبے کے حامل ہیں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان ممالک نے وقت کو برباد نہیں کیا بلکہ وقت کی قدر کی ہے۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

یونہی وقت سوسو کے ہیں جو گنواتے وہ خرگوش، کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

کسی حکیم کا قول ہے کہ وقت انسان کا بہت بڑا دشمن بھی ہے اور بہت اچھا دوست بھی۔ دشمن ان معنوں میں کہ انسان ذرا بھی غفلت سے کام لے اور اپنے کام کاج میں وقت کی پابندی نہ کرے تو وقت اس کی زندگی برباد کر دیتا ہے اور بہت اچھا دوست ان معنوں میں کہ جو انسان وقت کی عزت یعنی قدر کرتا ہے یہ اسے فتح وکامرانی سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ وقت اور جوار بھاٹا کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ جو شخص آگے بڑھ کر وقت کا دامن تھام لیتا ہے، وقت اس کا مطیع وفرماں بردار ہو جاتا ہے۔

طلبہ کے لیے وقت کی پابندی از بس ضروری ہے۔ جو طلبہ وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں وہ زندگی میں کامیاب اور بامراد ہوتے ہیں اور جو وقت ضائع کر دیتے ہیں وہ اپنا مستقبل تاریک کر لیتے ہیں۔ اس لیے طلبہ پر لازم آتا ہے کہ وہ وقت کی قدر کرنا سیکھیں اور اپنا کوئی بھی لمحہ غفلت میں نہ گزاریں۔

❁

سختی میں سُدھار ہے

سختی سے مراد ہر وقت کی مار پیٹ یا تیوری چڑھے رہنا نہیں اور نہ ہی اس سے مراد غیظ وغضب ہے بلکہ اس کا مفہوم نظم وضبط پرکاربند رہنا ہے۔ گویا "سختی میں سُدھار ہے" کا مطلب یہ ہے کہ سختی میں فلاح ہے، سختی میں اصلاح ہے اور اسی میں اچھائی کے تمام پہلو مضمر ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسرے سختی کریں بلکہ سمجھ دار لوگ اپنے عمل و کردار کا محاسبہ خود بھی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بے مثال ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بے مثال لوگوں کے بارے میں مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں　　　جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا　　　نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکم رانوں کی طرح

اپنے نفس پر سختی کی بات نہ صرف انفرادی طور پر درست ہے بلکہ قومی سطح پر بھی سچ ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں فقط وہی قومیں اوجِ کمال تک پہنچتی ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنا محاسبہ خود کرتی رہتی ہیں جیسا کہ مفکرِ مشرق نے فرمایا ہے:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم　　　کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اگر کوئی فرد مادر پدر آزاد ہو جائے تو بربادی اس کا مقدر ہے اور اگر کوئی قوم بے راہ ہو جائے اور اس کے قول و فعل پر کوئی قدغن نہ ہو تو کوئی شخص اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا اور جب چند قوموں کا یہ حال ہو جائے تو دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ اور تو اور مظاہر فطرت بھی سختی سے اپنے اپنے راستے پر گام زن ہیں اور وہ ذرّہ برابر بھی اپنی اپنی راہ سے نہیں ہٹتے۔ ان سے بھی سختی یا نظم وضبط کا درس ملتا ہے۔

اسلام نے بھی بعض کاموں میں سختی کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً تربیتِ اولاد کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ اُس کو اجرِ عظیم عطا کرے گا جو اپنی اولاد کی تربیت کے لیے دروازے پر کوڑا لٹکائے رکھتا ہے۔"

حضرت عمرِ فاروق ؓ کے عہدِ حکومت کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ رعایا کو اپنی اولاد سمجھتے تھے مگر اُن کے مزاج میں سختی تھی اس لیے ان کا دورِ حکومت مثالی تھا۔ تجربہ اور مشاہدہ اس کا ضامن اور گواہ ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں بے جا لاڈ پیار کو روا رکھا جاتا ہے اور بچوں کے چونچلے برداشت کیے جاتے ہیں، وہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کر پاتے مگر جہاں نظم و نسق اور پڑھائی کے بارے میں سختی روا رکھی جاتی ہے وہ ادارے دراصل عبادت گاہیں ہیں۔ وہاں علم کا نور برستا ہے اور اس کی خوشبو دور دور تک پھیلتی ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان ہے: خیر الاشغال تہذیب الاطفال ﷺ یعنی جتنے بھی کام دھندے یا

پیشے ہیں، اُن میں سب سے افضل بچوں کو مہذب بنانا یا اُن کی عمدہ تربیت کرنا ہے لیکن اس ضمن میں لاڈ پیار ہوگا تو تربیت و تہذیب میں یقیناً کمی رہ جائے گی اور اساتذہ اپنا فرض بہ حسن وخوبی ادا نہ کر پائیں گے۔ اگر والدین یا اساتذہ بچوں پر سختی روا رکھتے ہیں اور ان کو نظم و ضبط کے اصولوں پر کاربند کرتے ہیں تو دراصل یہ بچوں کے مفاد میں ہے اور اسی میں سب کی بھلائی اور جیت ہے۔

❁

روشن خیال پاکستان میں نوجوانوں کا کردار

ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان ہزاروں لاکھوں قربانیوں کے بعد اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بہت سی تقریروں میں اس امر کی تصدیق کی کہ پاکستان اسلامی نظام کے لیے حاصل کیا جا رہا ہے، چناں چہ 13 رجنوری 1948ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے دوٹوک انداز میں فرمایا:

''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''

دراصل قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ اسلام ایک روشن خیال اور ترقی پسند مذہب ہے۔ اسی بنا پر اگر آج ہم پاکستان کو ایک روشن خیال ملک قرار دیتے ہیں تو یہ مبنی بر حقیقت ہوگا۔

یہ بات عالم گیر سطح پر تسلیم شدہ ہے کہ کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی میں نوجوان ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا کرتے ہیں، چناں چہ روشن خیال پاکستان کی تعمیر و ترقی میں بھی نوجوان ہی اصل کردار ادا کریں گے۔ وہ جہالت، توہم پرستی اور تعصب کو ترک کر کے علم، عقل اور روشن ضمیری کو فروغ دیں گے۔ اسی بنا پر پاکستان کے بائیس کروڑ عوام نے ملالہ یوسف جیسی بہادر لڑکی کو خراج تحسین پیش کیا ہے، جس نے علم کی شمع روشن رکھنے میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کی۔

روشن خیال پاکستان میں نوجوانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معمارِ پاکستان کے اس قول کو مضبوطی کے ساتھ اپنے دانتوں میں پکڑ لیں: ''کام، کام اور کام'' اور اپنی محنت سے دُنیا پر ثابت کر دیں کہ ایٹم اور کمپیوٹر کے اس دور میں بھی اسلام زمانے کی اسی طرح رہنمائی کر سکتا ہے، جس طرح اس نے پندرہ سو سال پہلے کی تھی۔

جس قوم کے نوجوانوں میں محنت اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی لگن پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کتاب سے محبت کرنے لگتے ہیں تو وہ قوم اقوامِ عالم میں عزت و وقار کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے نوجوان اپنے اندر عقاب یا شاہین کی صفات پیدا کریں۔ علامہ اقبال ؒ کو شاہین سے بڑی محبت ہے، وہ اس لیے کہ شاہین بلند پرواز ہے، اس کی نظر بہت تیز ہے، خود شکار کرتا ہے، درویش صفت اور سخت کوش ہے، چناں چہ یہاں علامہ اقبال ؒ چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان بھی سخت محنت کو اپنا شعار بنائیں، غیرت مند بنیں، سادگی اور درویشی اختیار کریں تاکہ ان کا ملک ترقی وخوشحالی کی طرف گام زن ہو۔

پاکستان صحیح معنوں میں روشن خیال اُس روز بنے گا جب یہاں کے نوجوان محنت مشقت کو اپنائیں گے، فضول کاموں میں وقت برباد نہیں کریں گے، اعلیٰ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو پروان چڑھائیں گے، دیانت، سچائی اور انصاف کے اصولوں پر عمل کریں گے اور جھوٹ، فریب، بددیانتی، مکاری اور ظلم وزیادتی کے خلاف جہاد کریں گے۔ علامہ اقبال ؒ نے بالکل درست کہا ہے:

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

فضائی آلودگی اور ہماری ذمہ داریاں

(یہ مضمون پاکستان کے فضائی ماحول کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔)

فضائی آلودگی سے مراد وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے قدرتی فضا خراب ہوتی ہے۔ اگر انسان فضا کو، جس میں ہم سانس لیتے ہیں، بگاڑنے ہی میں لگا رہے اور اسے متوازن حالت میں لانے کی تدبیریں نہ کرے تو اس کا نقصان بھی انسان ہی کو، چہ جائیکہ وہ انسان کی ہلاکت کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو، برداشت کرنا پڑتا ہے۔

قدرتی طور پر کرۂ ارض کے اردگرد گیسوں کا ایک غلاف موجود ہے، جس میں نائٹروجن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور چند دوسری گیسیں بلحاظ وزن ایک خاص تناسب سے فضا کا حصہ بنتی ہیں اور بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں، مگر بے تحاشا انسانی آبادی اور چاروں طرف صنعتوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے فضا میں ان گیسوں کا تناسب بگڑ گیا ہے اور فضا میں مختلف قسم کی مضرِ صحت گیسیں جمع ہوگئی ہیں، جن کی مقدار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ صنعتی چمنیوں سے نکلنے والی گیسیں، ٹریفک کی لاتعداد گاڑیاں اور خشت سازی کے بھٹوں سے نکلنے والا دھواں، کچے راستوں اور شکستہ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی آمدورفت سے اُٹھنے والے گردوغبار کے بادل فضا کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ یہ آلودگی متاثرین کی صحت پر نہایت مضر اثرات مرتب کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فضائی آلودگی سے نباتات بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں اور قریبی عمارات کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

کثافت زدہ ماحول سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ امریکہ، روس، چین، جاپان، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ کے کچھ ممالک کی طرح ہم بھی اپنے ہاں معدنی ایندھن کا متبادل تلاش کریں۔ مثلاً: سولر انرجی، پانی اور ہوا کی قوت سے حاصل شدہ توانائی کا استعمال نہ صرف معاشی اعتبار سے سودمند ہوگا بلکہ اس طرح فضائی آلودگی میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوگی۔ اس کے علاوہ فضائی آلودگی سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ ان کارخانوں میں، جو فضائی آلودگی کا زیادہ سبب بنتے ہیں، مضرِ صحت گیسوں کے کیمیائی معالجے کے لیے Treatment Plant نصب کیے جائیں اور یہ کام ٹھوس بنیادوں اور حکومتی سطح پر ہو۔ اسی طرح زہریلے دھوئیں کے مضرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک تو سیسے سے مبرّا پٹرول کے استعمال کو فوقیت دی جائے، دوسرے گاڑیوں کو درست حالت میں رکھا جائے اور دھواں دینے والی گاڑیوں کو قانون کی گرفت میں لیا جائے۔

درخت قدرت کا انمول عطیہ ہیں۔ درخت نہ صرف فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے صحت مند آکسیجن خارج کرتے ہیں بلکہ یہ قدرتی طور پر شور جذب کرنے کی بھی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں، بارش کا سبب بنتے ہیں اور ماحول کو خوش گوار بناتے ہیں، چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی جگہوں پر، جہاں کارخانوں کی بہتات ہے یا بے تحاشا گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں، کثرت سے درخت پیدا کیے جائیں۔ علاوہ ازیں کارخانوں کی وجہ سے فضا کو آلودگی سے بچانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ کارخانے آبادی سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر لگائے جائیں اور کارخانوں کے اردگرد اور آبادی کے درمیان بہتات سے درخت لگائے جائیں۔

❁

آبی آلودگی کیا ہے اور اس سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

یہ مضمون لاہور اور گردونواح کے آبی حالات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے تاہم ہمارے ملک کے دوسرے شہروں یا قصبات کی صورتِ حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے آرام و سکون کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت اپنے اردگرد کے ماحول میں تغیر و تبدل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ انسان نے نت نئی دریافتیں اور بے شمار ایجادیں کیں جن کی بنا پر اس نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی مگر کائنات کا اصول ہے کہ فطرت کی تباہی کبھی ترقی کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ آج ہمارے ملک خصوصاً پنجاب کے تمام بڑے بڑے شہروں میں زرعی و صنعتی اور گھریلو آلودگی اور قدرتی وسائل کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے ماحول مسخ سے مسخ تر ہوتا جا رہا ہے، جسے ماحولیاتی آلودگی کا نام دیا جاتا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کو ہم عناصرِ فطرت کی بنیاد پر چار قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: فضائی آلودگی، آبی آلودگی، زمینی آلودگی اور شور کی آلودگی۔ ہم فضائی آلودگی کے بارے میں پہلے لکھ

چکے ہیں، اس وقت ہمارا روئے سخن آبی آلودگی کی طرف ہے۔

صاف پانی قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو میسّر نہ ہو تو انسان چند دنوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بیشتر صنعتوں خاص طور پر چمڑا سازی، شکر سازی، کھاد، ادویات، کاغذ اور گتہ بنانے کے کارخانوں میں پانی کا بہت زیادہ استعمال ناگزیر ہے۔ استعمال کے بعد بچا کھچا آلودہ پانی یا تو کھلی زمین پر پھینک دیا جاتا ہے، جہاں سے یہ رس رس کر زیرِ زمین پانی سے جا ملتا ہے یا آہستہ آہستہ بخارات بن کر فضا میں شامل ہو جاتا ہے یا پھر پبلک سیوریج کے ذریعے یا پھر براہِ راست اسے صاف کیے بغیر کسی ندی نالے یا دریا میں ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے۔

آبی آلودگی کی ایک مثال تو یہ ہے کہ کالا شاہ کاکو کے تمام صنعتی کارخانوں کا آلودہ پانی ندی ''ڈیک'' میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ''ڈیک'' ندی کشمیر کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے اور کالا شاہ کاکو کے قریب سے گزرتی ہوئی دریائے راوی میں جا ملتی ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے اس قدرتی ندی میں مچھلیوں کی بہتات تھی مگر آج آبی جاندار ناپید ہیں۔ دوسری بڑی مثال دریائے راوی کی ہے، جس میں لاہور اور گردونواح کی تمام صنعتوں کے فالتو پانی کے علاوہ لاہور کی آبادی کا تمام آلودہ پانی، جس کی مقدار پانچ سو ملین گیلن یومیہ سے زیادہ ہے، بغیر صاف کیے اور بلا کسی جھجک کے دریائے راوی میں ڈال دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے آبی جانداروں کا زندہ رہنا دشوار ہو گیا ہے چنانچہ جب یہ دریا لاہور سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ''بلوکی'' کے مقام پر پہنچتا ہے، جو کسی زمانے میں ''مچھلی گھر'' کہلاتا تھا، تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں دریائے راوی میں مچھلی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور جب یہ آلودہ پانی زیریں علاقوں کی طرف پہنچتا ہے، جہاں اسے فصلوں کو سیراب کرنے اور پینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کی آلودگی انسانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

جب دریاؤں، ندی نالوں اور جوہڑوں میں صنعتی مادے حد سے تجاوز کر جائیں تو بہت سی خطرناک بیماریاں پھیلانے کا موجب بنتے ہیں، جن سے بچے اور بوڑھے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان پلاننگ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں چالیس فی صد اموات آلودہ پانی کے استعمال کی وجہ سے ہوتی ہیں اور اسی بنا پر دس فی صد بچے ایک سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں اور یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔

آبی آلودگی سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ اُن صنعتوں پر، جو پانی کا وافر استعمال کرتی ہیں اور آلودہ پانی کو بغیر صاف کیے ٹھکانے لگاتی ہیں، سرکاری سطح پر قدغن لگا دی جائے کہ وہ معالجی پلانٹ (Treatment Plant) لگائیں۔ شہر کے سیوریج سسٹم میں کوڑا کرکٹ پھینکنے سے پائپ بند ہو جاتے ہیں، جس سے ہر طرف گندگی پھیل جاتی ہے، چناں چہ لازم ہے کہ سیوریج کے نظام میں اصلاح کی جائے اور سیوریج کے پانی کو، اس کی آلودگی کم کیے بغیر، ندی نالوں اور دریاؤں میں نہ پھینکا جائے۔ ان اقدامات سے آبی آلودگی میں خاصی حد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔

❁

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہُوا

دنیا دارالعمل ہے یعنی دنیا ایک ایسا میدانِ عمل ہے جہاں قدرت ہر انسان کو، جسے اُس نے اشرف المخلوقات، بنایا ہے، مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی قوتوں کو بروئے کار لا کر اس میدان میں بڑھ چڑھ کر قدم مارے اور ترقی کی منازل طے کرے۔ قدرت کا اصول ہے کہ محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی یعنی انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی وہ سعی کرتا ہے۔ اگر انسان کم محنت کرے گا تو تھوڑا پھل پائے گا اور اگر سخت جدو جہد کرے گا تو نہ صرف یہ کہ اپنا دامن موتیوں سے بھر لے گا بلکہ عزت و آبرو کا حقدار بھی قرار پائے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ محنت میں عظمت ہے یعنی عظمت اور سرخ روئی فقط اُن لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو شبانہ روز محنت اور جدو جہد کرتے ہیں۔ تاریخِ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی سہل پسند فرد یا تن آسان قوم کو سربلندی حاصل ہوئی ہو بلکہ دنیا میں جس کسی نے فضیلت اور عزت پائی ہے، اس نے اپنا بلند مقام و مرتبہ محنت و مشقت سے حاصل کیا ہے۔ مولانا حالی نے اس حقیقت کو بڑے سادہ اور دل آویز الفاظ میں بیان کیا ہے:

مشقت کی ذلّت جنھوں نے اٹھائی　　جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی　　فضیلت نہ عزت، نہ فرماں روائی

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اُوپر چڑھے ہیں

اگر ہم تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو ہماری نظروں کے سامنے سیکڑوں ہزاروں ایسے لوگوں کے نام آتے ہیں جنھوں نے ابتدائے عمر میں محنت مشقت کو اپنا شعار بنایا تو اُن میں سے کوئی بطلیموس، کوئی سُقراط، کوئی بُقراط، کوئی افلاطون، کوئی ارسطو، کوئی کولمبس، کوئی ابنِ بطوطہ، کوئی مارکو پولو، کوئی واسکوڈے گاما، کوئی نیوٹن، کوئی شیکسپیئر، کوئی ورڈز ورتھ، کوئی امام غزالی، کوئی مولانا روم، کوئی ابنِ رُشد، کوئی نطشے، کوئی سرسید احمد خاں، کوئی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور کوئی محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کہلایا۔ مولانا حالی نے ایسے لوگوں کی محنت کی عظمت کو سراہتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

نہ بو نصر تھا نوع میں ہم سے بالا　　نہ تھا بو علی کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا　　ہوئے اس لیے صاحبِ قدر والا

اگر فکرِ کسبِ ہنر تم کو بھی ہو
تمھی پھر ابو نصر اور بو علی ہو

جو لوگ محنت سے جی چراتے اور اپنی کاہلی کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ معاشرے میں نہ نام کما سکتے ہیں اور نہ ہی سر بلند ہو سکتے ہیں۔ عقیق ایک پتھر ہے مگر جب اس کو تراشتے ہیں تو وہ نگینہ بن جاتا ہے اور سونا بھٹی میں پڑتا ہے تو کندن ہو جاتا ہے یہی عالم گیر سچائی ہے:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا　　سو بار جب عقیق کٹا، تب نگیں ہوا

محنت کے برعکس کام چوری کی عادت کی مثال دیمک کی سی ہے جو فرد کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور یہی قوموں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے یعنی جس ملک و ملت کے افراد میں کام کرنے کی سچی لگن اور سختیاں جھیلنے کی عادت نہ ہو وہ قوم پس ماندہ رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال ؒ نے کیا خوب کہا ہے:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا　　روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

❋

تعلیمِ نسواں

''نسواں'' کا لفظ ''نساء'' کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ''عورت'' کے ہیں۔ چنانچہ تعلیمِ نسواں کا مفہوم ہے عورتوں کی تعلیم۔ علم ایک ایسی دولت ہے، جس کا ہر انسان، خواہ وہ مرد ہے یا عورت محتاج ہے۔ علم روشنی ہے، علم نور ہے۔ کہتے ہیں: ''ہر کمالے را زوالے'' لیکن علم ایسی دولت ہے جس کو زوال نہیں۔ علم ایسا دوست ہے جو سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ علم انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان ہے: ''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' دورِ جدید کے مہذب اور متمدن معاشرے میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت سے انکار جہالت اور کم عقلی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیا بھی ناکارہ ہو جائے گا تو زندگی کی گاڑی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ ہر گھر ایک چھوٹی سی سلطنت کی مانند ہے جس میں شوہر بادشاہ اور بیوی وزیر ہوتی ہے۔ بادشاہ خواہ کتنا ہی منتظم اور لائق کیوں نہ ہو اگر اس کا وزیر دانا نہیں تو وہ امورِ سلطنت میں بادشاہ کو صحیح مشورہ نہیں دے سکے گا، چناں چہ ایسی سلطنت کا روبہ زوال ہونا فطری امر ہے۔ اس لیے ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کا حاصل کرنا بھی از بس ضروری ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقوامِ عالم میں صفِ اول کی قومیں سب سے آگے ہیں جن

کی عورتیں حصولِ علم میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

کسی دانا حکیم کا قول ہے کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے۔ بچہ جو کچھ ماں کی گود میں سیکھتا ہے، وہ اس کی آئندہ تمام زندگی پر اثر انداز رہتا ہے۔ اس لیے بچے کی بہتر نشوونما اور تہذیب وتربیت کے لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا بہت اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ نپولین نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''آپ مجھے اچھی مائیں دے دیں، میں آپ کو بہترین قوم دے دوں گا۔'' نپولین کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ ماں ہی اپنی اولاد کی صحیح معنوں میں تعلیم و تربیت کر سکتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ایک جاہل عورت اپنی جہالت کے سبب نہ صرف قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے بلکہ اپنے بچوں کا مستقبل بھی تاریک کر دیتی ہے۔

یہ بات بڑی خوش آیند ہے کہ آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں پاکستانی خواتین زیورِ علم سے آراستہ ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی دکھا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ سیاست کے خارزار میں بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کی ایک مثال محترمہ فاطمہ جناح اور دوسری مثال محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہے جو ملک کی وزیرِ اعظم تھیں۔ آج ملک کی مرکزی وصوبائی سروسز میں پاکستانی خواتین نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔ کوئی بینک ہو یا سرکاری وغیر سرکاری دفتر کہیں بھی خواتین کی کارکردگی مردوں سے کم نہیں ہے خصوصاً ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خواتین اپنے فرائض بطریقِ احسن انجام دے رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کائنات کا سارا حسن عورت کے وجود کا رہینِ منت ہے اور زندگی کا سوزِ دروں اسی ساز سے نکلتا ہے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عورت علم وحکمت اور فہم وفراست سے آراستہ ہو۔

❁

تندرستی ہزار نعمت ہے

خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی تمام ارضی وسماوی مخلوقات پر فہم وفراست اور عقل ودانش کی بنا پر مشرف وممتاز کیا ہے اور انسان کو اس قدر نعمتوں سے نوازا ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ ان تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت آبرو اور تندرستی ہے اور یہی زندگی کا حاصل ہے۔ اسی بات کو نظیر اکبرآبادی نے اپنی ایک طویل نظم "تندرستی" کے ٹیپ کے شعر میں بیان کیا ہے، ان کا کہنا ہے:

جتنے سخن ہیں اُن میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

نظیر کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ جتنی بھی باتیں ہیں، ان سب میں تندرستی اور حرمت کی بات ہی دل پذیر ہے۔ کوئی مرد ہو یا عورت، جس رنگ اور جس حال میں بھی ہو، خوش گوار زندگی وہی گزارتا ہے جو تندرست ہو۔ تندرستی سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ تندرستی نہ ہو تو زندگی کی ساری رعنائیاں بے کار اور بے مصرف ہیں۔ نظیر نے ایک دوسری جگہ کیا خوب کہا ہے:

آبرو اور تندرستی جس کو حق نے کی عطا
پھر جہاں میں اس سا یارو کون سا ہے بادشاہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں جس کسی کے پاس روپیا پیسا ہے، اُس کو لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ دھن دولت آنی جانی چیز ہے، اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ آج یہ کسی کے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس، باغ وچمن اور جاہ و جائیداد پر کسی کا ہمیشہ قبضہ نہیں رہا مگر تندرستی سے بڑھ کر کوئی جائیداد نہیں۔ یوں سمجھ لیجیے جس کے پاس تندرستی اور حرمت ہے، وہ سب سے بڑا جاگیردار ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کے بل بوتے پر سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ فرض کر لیجیے کسی شخص کے گھر میں دولت کے انبار لگے ہیں مگر وہ بیمار ہے تو اس کی دولت کس کام کی؟ اصل دولت اس کی صحت ہے۔ دولت مند بیمار روپے پیسے کے زور پر جائیداد تو خرید سکتا ہے، حویلیاں تو تعمیر کر سکتا ہے، کارخانے تو بنا سکتا ہے مگر وہ بیمار ہے، اس کو صحیح سانس نہیں آتی یا وہ کھانا ہضم نہیں کر سکتا یا چلنے پھرنے سے معذور ہے یا اُسے نیند نہیں آتی اور رات آنکھوں میں کٹتی ہے، تو سب چیزیں اس کے لیے بیکار ہیں۔ دوسری طرف ایک مفلس و نادار ہے مگر ہے وہ صحت مند تو اُسے کسی قسم کا خوف نہیں۔ وہ اپنی نیند سوتا ہے اور اپنی نیند اٹھتا ہے۔ اسی لیے تو کسی نے سچ کہا ہے:

قدرِ صحت مریض سے پوچھو　　تندرستی ہزار نعمت ہے

تندرستی قائم رکھنے کے لیے سب سے ضروری چیز مناسب غذا ہے۔ غذا انسانی مشین کے لیے ایندھن کی حیثیت رکھتی ہے۔

لقمان حکیم کا قول مشہور ہے کہ چھتیس سو بیماریاں ایسی ہیں جو انسانی جسم کو لاحق ہو سکتی ہیں، ان میں سے دو تہائی یعنی چوبیس سو بیماریاں غلط غذا سے پیدا ہوتی ہیں۔ چناں چہ لازم ہے کہ زیادہ کھانے سے اجتناب کیا جائے۔ کسی دانا کا قول ہے: ''بعض لوگ دانتوں سے اپنی قبر کھودتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حدِ اعتدال سے بڑھ کر کھانا جسمانی صحت کو برباد کر دیتا ہے۔ ثقیل اور مرغن غذائیں بھی صحت کو تباہ کر دیتی ہیں، اس لیے غذا کے لیے میانہ روی سے کبھی تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

شیخ سعدی ؒ کی ایک حکایت ہے کہ باپ نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ: ''بیٹا! جو لوگ ٹھونس ٹھونس کر کھاتے ہیں، انھیں غم و آلام گھیر لیا کرتے ہیں۔'' بیٹا بھی بڑا تیز تھا، کہنے لگا: ''لیکن ابا جان! گرسنگی (بھوک) بھی تو ہلاک کر ڈالتی ہے۔'' باپ نے جواب دیا: ''بیٹا! نہ تو اتنا ٹھونس ٹھونس کر کھاؤ کہ تمھیں غم و آلام گھیر لیں اور نہ اتنا بھوکا رہو کہ بھوک تمھارا گلا گھونٹ دے۔ راہِ اعتدال باید دارید۔ یعنی میانہ روی اختیار کرو کہ یہی عین اسلام ہے۔''

اس حکایت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ کھانے پینے میں اعتدال سے کبھی تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ اعتدال کا راستہ ہی صحت کا ضامن ہے۔

غذا ہمیشہ عمر اور موسم کے مطابق کھانی چاہیے۔ صاف ستھری غذا، صاف ہوا اور صاف پانی بھی تندرستی کے لیے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام بھی اچھی صحت کا راز ہے۔ بُری صحبت اور بد اطوار لوگوں کی دوستی صحت کے لیے تباہ کن ہے۔ خدا پر بھروسا کرنے، صابر شاکر اور خوش و خرم رہنے اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے سے بھی صحت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

❁

اطاعتِ والدین

اللہ تعالیٰ کے بعد والدین ہی اولاد کے سب سے بڑے مُربی و محسن ہیں۔ جس طرح کسی بھی مذہب میں اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی جائز نہیں، اسی طرح والدین کی نافرمانی بھی روا نہیں۔ اسی بنا پر خدا اور رسول ﷺ کے بعد سب سے زیادہ احترام بھی والدین کا کیا جاتا ہے۔

دنیاوی رشتے داروں میں والدین کی قدر و منزلت سب سے اہم ہے اور ماں باپ کا سایہ اولاد کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اولاد کو دنیا کی ہر نعمت مُیسّر آ سکتی ہے مگر ان کے سر سے والدین کا سایہ اٹھنے کے بعد والدین کی محبت اور شفقت کسی قیمت پر نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سمجھ دار لوگ اپنے والدین کی درازیِ عمر کی دعا مانگتے، اُن کی عزّت و تکریم کرتے اور ان کا ہر حکم، فرمانِ الٰہی سمجھ کر، سر آنکھوں پر لیتے ہیں۔

ماں باپ دونوں ہی واجب الاحترام ہیں مگر ان میں سے بڑا درجہ ماں کا ہے، اس کی وجہ ادنیٰ سے تامّل کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ماں بچوں کو اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہے، ان کو دو ڈھائی سال تک دودھ پلاتی ہے، اپنی گود میں لیے رہتی ہے، انھیں لوریاں سناتی ہے اور اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ بچہ کسی وجہ سے رونے لگے تو بے چین ہو جاتی ہے اور امکان بھر بچے کے رونے کا مداوا کرتی ہے۔ روایت ہے کہ کسی صحابی نے رسولِ کریم ﷺ سے سوال دریافت کیا: ''میری خدمت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟'' تو رحمتِ دو عالم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ''تمھاری ماں'' پوچھا: ''اس کے بعد؟'' ارشاد ہوا: ''تمھاری ماں'' صحابی نے پوچھا: ''اس کے بعد؟'' پھر ارشاد ہوا: ''تمھاری ماں'' اور چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا: ''تمھارا باپ۔'' اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ ماں کی خدمت کا حق اتنا فائق ہے کہ کوئی بھی شخص کماحقہٗ اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ بچے کی پرورش کے ضمن میں ذرا ماں کی ذمہ داریوں پر غور کیجیے: ماں اپنے بچے کی خاطر جو تکلیفیں اٹھاتی ہے، اُن کا تصور بھی محال ہے، خدانخواستہ بچہ بیمار پڑ جائے تو ماں کی جان پر بن آتی ہے اور جب تک وہ اپنے بچے کو صحت یاب نہ دیکھ لے؛ سکھ کا سانس نہیں لیتی اور کھانا پینا بھول جاتی ہے۔ بچہ ماں کی نظروں کے سامنے ہنستا کھیلتا رہتا ہے تو اس کے دل کی کلی کھلی رہتی ہے۔ بچے کی خوشی ماں کی خوشی اور بچے کی غمی ماں کی غمی ہے۔ اگر بچہ کسی شے کے حصول کے لیے ضد کرنے لگتا ہے تو ماں ہزار جتن کرتی ہے اور بچے کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے، چہ جائیکہ اسے بھوکا رہنا پڑے۔ جس خلوص اور محبت کے ساتھ ماں بچے کی تعلیم و تربیت کرنے کا فریضہ نبھاتی ہے، یہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ اس لیے ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔'' لیکن یہ جنت اولاد میں سے اُسی کے حصے میں آئے گی جو دل و جان سے ماں کی فرماں برداری کرے گا لیکن ماں باپ کا سایہ اولاد کے سروں پر ہمیشہ قائم نہیں رہتا، اس لیے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے سروں پر ماں کا سایہ ہے اور بد قسمت ہیں وہ لوگ جو ماں کے سائے کے ہوتے اُن کی دعاؤں سے محروم ہیں۔ علامہ اقبال ؒ کی ماں کا سایہ اُس وقت اٹھ گیا تھا جب وہ حصولِ علم کی غرض سے جرمنی میں مقیم تھے، چنانچہ انھوں نے کس حسرت سے کہا:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ ! میرا انتظار　　کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا　　اب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا!

ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے خواب بنتا ہے اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر وہ کام کرتا ہے جو اس کے امکان میں ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

''والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو اور نہ ان کو جھڑک کر جواب دو بلکہ احترام کے ساتھ بات کرو اور

ان کے سامنے نرمی اور رحم کے ساتھ جھک کر رہو۔"

اطاعتِ والدین کے موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ہم طوالت کے خوف سے زیادہ نہیں لکھتے البتہ اب تک لکھی گئی سطور کا لب لباب یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بعد سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو اور اس کی روزی میں کشادگی ہو، اس کو چاہیے کہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔"

چنانچہ اولاد پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی مطیع و فرماں بردار اور خدمت گزار رہے کہ اولاد کے لیے دین و دنیا کی بھلائی اسی میں ہے۔

❁

کمپیوٹر۔ عہدِ حاضر کی اہم ضرورت

کمپیوٹر انگریزی لفظ ہے۔ جو Compute سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی گننا، بچارنا یا حساب کتاب کرنا کے ہیں۔ مگر فی زمانہ جب کمپیوٹر کا نام زبان پر آتا ہے تو اس سے مراد اُس حیرت انگیز ایجاد کے ہیں جو نہ صرف وپیچیدہ سے وپیچیدہ حساب کتاب پلک جھپکتے میں کر دیتی ہے بلکہ جس میں حسبِ ضرورت ہر طرح کی معلومات بھی رکھی جا سکتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے یہ ایک ایسی جادوئی ایجاد ہے، جس کو "کھل جا سم سم" کہہ دیں تو خزانے کا مُنھ کھل جاتا ہے اور نئی دنیا سامنے آ جاتی ہے۔

دراصل انسان مدّت سے کسی ایسی ایجاد کی دُھن میں لگا ہوا تھا جس سے اس کے وقت کی بچت ہو اور جو اس کی مرضی کے تابع ہو، چناں چہ کمپیوٹر انسان کی اسی لگن کا نام ہے۔ یہ ایک انسانی کرشمہ ہے۔ جدید دور کے ہر شعبے میں کمپیوٹر کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کمپیوٹر عہدِ حاضر کی اہم ضرورت بن گیا ہے۔ ہوا بازی ہو یا میڈیکل سائنس، انجینئر نگ ہو یا ارضیات کا علم، بحریات ہو یا خلائی تحقیق کا شعبہ، معاشیات کا مضمون ہو یا کاروباری دنیا کی باتیں، تاریخ ہو یا جغرافیہ، شعر و ادب کا چرچا ہو یا مابعد الطبیعات کی باتیں، ہر جگہ اور ہر حال میں کمپیوٹر کا استعمال ناگزیر ہے۔ بلا شبہ کمپیوٹر نے دنیا کو Global Village بنا دیا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؒ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آج کمپیوٹر کا دور ہے۔ ہر جگہ اسی کی لہر بہر ہے۔ کسی قوم کی ترقی کا دارومدار کمپیوٹر کی تعلیم پر ہے اور فی زمانہ فقط وہی قوم ترقی کی راہ پر گام زن ہے، جس نے اپنے تعلیمی نظام میں کمپیوٹر کے استعمال کو فوقیت دی ہے اور مصافِ زندگی میں کمپیوٹر کا استعمال سب

سے آگے رکھا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے لیکن اس کے عوام اور حکومت کو شدت سے اس بات کا احساس ہے کہ جب تک ملک میں کمپیوٹر کی تعلیم عام نہیں ہوگی، ہم اقوامِ عالم کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اسی حکمت کے تحت حکومتِ پنجاب نے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کو ہزاروں لاکھوں کمپیوٹر مفت فراہم کیے ہیں تاکہ وہ اپنی تعلیم میں جدید ٹیکنالوجی سے مدد لیں، کیوں کہ کمپیوٹر نے طلبہ کو وہ سہولیات فراہم کردی ہیں، جن کے بارے میں اُن کے آباؤاجداد نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اندریں حالات اگر کوئی طالب علم کمپیوٹر سے بے بہرہ ہے تو اس کو اس کی بدقسمتی ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

آج دنیا میں کمپیوٹر کی مدد سے دھڑا دھڑ ایجادات ہو رہی ہیں۔ ٹیلی فون ہی کو لے لیجیے، ایک زمانہ تھا جب صرف امیر امرا ہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ آج امیر کیا اور غریب کیا، مرد کیا اور عورت کیا، ہر کس و ناکس موبائل لیے پھرتا ہے جو ٹیلی فون ہی کی جدید صورت ہے۔ آپ کے ہاتھ میں موبائل ہے تو آپ چلتے پھرتے اور کام کاج کے دوران میں، دنیا کے کسی بھی حصے میں رہائش پذیر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب سے دوبدو انداز میں باتیں کر سکتے ہیں۔ آج انسان کی ہر جدتِ طبع اور نت نئی ایجاد میں:

ع　　　جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

کے مصداق کمپیوٹر کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ بلامبالغہ کمپیوٹر عہدِ حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس نے انسانی زندگی کو بے حد آسان بنا دیا ہے لیکن اس کے منفی استعمال سے انسانیت کے لیے خطرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے، چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کا استعمال انسان کی ترقی کے اعلیٰ مدارج کے لیے کیا جائے نہ کہ ایک وقت ایسا آئے جب انسان کمپیوٹر کے ہاتھوں تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے۔

❁

لائبریری

لائبریری انگریزی کا ایسا زبان زدِ خاص و عام لفظ ہے جس کا مفہوم ہر کوئی جانتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ کتب خانہ یا کتاب گھر ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کے لیے تقریباً ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں مختلف مضامین کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ موجود ہوتا ہے جہاں طلبہ اور اساتذہ لائبریری پیریڈ یا اپنے فارغ اوقات میں جاتے ہیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے لائبریری میں ایک آدھ ایسا کنجِ عافیت ہوتا ہے، جہاں وہ سکون سے پڑھ سکتے ہیں اور کوئی ان کے مطالعے میں حارج نہیں ہوتا، اسے ریڈنگ روم یا دارالمطالعہ کہتے ہیں۔ بعض طلبہ یا اساتذہ کو اپنی مطلوبہ کتاب زیادہ وقت کے لیے درکار ہوتی ہے تو وہ اسے لائبریری کلرک سے اپنے نام پر چند دنوں کے لیے ایشو کروا لیتے ہیں اور مقررہ دنوں کے بعد لائبریری کو بحفاظت

تمام واپس کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

کسی شخص کو یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں کالج یا یونیورسٹی کس سطح کی ہے تو وہ وہاں کی لائبریری دیکھ لے۔ ایک عمدہ لائبریری ہی کسی تعلیمی ادارے کے معیار کی کسوٹی ہوتی ہے۔ لائبریری میں کم وبیش ہر مضمون کی کتابیں موجود ہوتی ہیں، جنھیں لائبریری کے ارباب اختیار شعبہ وار خاص ترتیب سے رکھتے ہیں۔ منظم طریقے سے کتابیں رکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مطلوبہ کتاب کی تلاش میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ کتابوں کو منظم و منضبط طریقے سے رکھنا ایک باقاعدہ علم ہے جسے "لائبریری سائنس" کہا جاتا ہے۔ طلبہ یا اساتذہ کشاں کشاں لائبریری میں آتے ہیں، اپنے ذوق کے مطابق کتاب مستعار لیتے ہیں اور اپنے علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ بعض طلبہ یا اساتذہ اپنے خاص مضمون کے علاوہ اپنے علم میں اضافے کے متمنی ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو شعروادب کا ذوق ہے، کوئی افسانے یا ناول پڑھنا پسند کرتا ہے، بعض تاریخی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں، کچھ ایک کو جغرافیائی یا سائنسی معلومات بڑھانے کی دھن ہوتی ہے، جب کہ بعض دینی ذوق کے حامل اشخاص کو اپنی شخصیت میں نکھار کے لیے مذہب کے بارے میں معلومات درکار ہوتی ہیں، لائبریری میں ان سب کی تشفی کا وافر سامان موجود ہوتا ہے جہاں وہ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست" کے مصداق اپنی تشنگی دور کر سکتے ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر طلبہ لائبریری سے دوسروں کی دیکھا دیکھی یا اپنے ساتھیوں پر علمیت کا رعب بٹھانے کے لیے کتابیں تو اپنے نام ایشو کروا لیتے ہیں مگر کتاب کا پوری توجہی سے مطالعہ نہیں کرتے اور نہ کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے طلبہ پڑھائی میں دوسرے طلبہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کچھ طلبہ لائبریری کی کتاب کو حفاظت سے نہیں رکھتے، یا تو کتاب کے ورق پھاڑ دیتے ہیں یا پھر کتاب پر جا بجا نشان لگا دیتے ہیں، جس سے کتاب کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں بے ذوقی ظاہر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے طلبہ طالب علم نہیں ہوتے بلکہ انھیں "علم چور" کہنا چاہیے جو طلبہ کے لبادے میں تعلیمی اداروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ہونہار طلبہ لائبریری سے بڑے قرینے اور سلیقے سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کی طلب صادق ہے تو وہ اس ضمن میں اپنے اساتذہ کرام اور سینئر طلبہ سے بھی مشورہ لیتے رہتے ہیں۔ جو طالب علم کتابیں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، اُن کے لیے لائبریری ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اپنے کورس پر عبور حاصل کرنا تو کالج یا یونیورسٹی کے تمام طلبہ کا مقصد ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اکثر طلبہ بوجوہ اپنے مطالعے میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، چناں چہ وہ لائبریری کا رخ کرتے ہیں۔ لائبریری میں مخطوطات یا کچھ قیمتی کتابیں Not to be Issued ہوتی ہیں، ایسی کتابوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی بہتر صورت یہ ہے کہ طلبہ یک سوئی کے ساتھ مطالعہ کریں اور زیرِ مطالعہ کتاب میں سے ضروری نِکات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں یا انھیں نوٹ کرتے جائیں تا کہ وہ اپنی ذات اور اپنی تعلیم کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ ہر اچھی لائبریری میں تازہ ترین اخبارات اور متنوع قسم کے رسائل و جرائد بھی آتے ہیں، باشعور طلبہ ان سے بھی بقدرِ ظرف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

❁

اخباری ذرائع ابلاغ کے معاشرے پر اثرات

اخباری ذرائع ابلاغ کو انگریزی میں پرنٹ میڈیا (Print Media) کہا جاتا ہے، جو ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اصطلاحی معنوں میں اپنے خیالات و افکار اور احساسات و تاثرات کو دوسروں تک پہنچانے کا نام ابلاغ یا کمیونی کیشن (Communication) ہے۔ جس کی فی زمانہ دو صورتیں ہیں:

1- الیکٹرانک میڈیا (Electronic Media) نشریاتی ذرائع ابلاغ

2- پرنٹ میڈیا (Print Media) اخباری ذرائع ابلاغ

نشریاتی ذرائع ابلاغ دورِ جدید کے ایسے ذرائع ہیں جنھوں نے دنیا کو اپنے شکنجے میں بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ اس میں ریڈیو، ٹیلی گرام، ٹیلی فون، ٹیلی وژن، فیکس، ای میل، موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور آئی فون وغیرہ سب شامل ہیں اور ان کے اثرات شہری بلکہ دیہی زندگی پر بھی بہت زیادہ ہیں مگر اس وقت ہمارا روئے سخن اخباری ذرائع ابلاغ (Print Media) کی طرف ہے۔

اخباری ذرائع ابلاغ میں اخبارات، رسائل و جرائد، کتاب، کتابچے اور بروشر سب کچھ شامل ہے۔ مگر اطلاعات بہم پہنچانے کا سب سے قدیم، جامع اور موثر ذریعہ اخبارات ہیں۔

اخبارات کئی صدیوں سے چھپ رہے ہیں۔ چند ایک ہفت روزہ، بالعموم روزنامے ہیں۔ ہر چند الیکٹرانک میڈیا دنیا پر چھایا ہوا ہے تاہم اخبارات کی ضرورت آج بھی کم نہیں ہوئی بلکہ جوں جوں دنیا کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے، اس کی ضرورت بھی دوچند ہو گئی ہے۔ اخبار خبروں کا منبع تو ہوتا ہی ہے، خبروں کے علاوہ بھی دنیا و مافیہا کا ہر موضوع اخبار کی زینت بن سکتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں کثرت سے اخبارات چھپتے ہیں۔ اس طرح اخبارات کا چھپنا ایک صنعت کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کے ساتھ ہر ملک کے ہزاروں لاکھوں لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔

ہر انسان کے لیے تمام ملکوں اور شہروں کی سیاحت ممکن نہیں مگر اس کی ایک عمدہ صورت اخبار بینی ہے جو ہر ملک میں اور ہر زبان میں چھپتے ہیں۔ گویا اخبار ایک "جامِ جہاں نما" ہے، جس کے ذریعے ہم دنیا کے تمام ملکوں کی سیر کر لیتے اور ان کے حالات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اخبار کے اس قدر عادی ہوتے ہیں کہ جب تک وہ صبح سویرے اخبار نہیں پڑھ لیتے، انھیں چین نہیں آتا۔ ہر اچھا اخبار ہفتے میں دو ایک بار خصوصاً اتوار کو یا ملکی لحاظ سے اہم مواقع پر ضخیم ایڈیشن شائع کرتا ہے، جو ایک اہم دستاویز ہوتی ہے۔ مختلف ملکوں اور شہروں میں ہونے والی سیاسی و معاشرتی اور ثقافتی و ادبی سرگرمیوں اور کھیلوں کے مقابلوں کی تفصیلات بھی ہمیں اخبارات کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔ نت نئی مصنوعات اور تازہ مطبوعات کا حال بھی اخباروں کے توسط ہی سے

معلوم ہوتا ہے۔

اخبارات رائے عامہ کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں اور ان کے ذریعے عوام الناس کے جذبات و احساسات کا رخ موڑنے کی بھی عمدہ کوشش ہو سکتی ہے۔ مثلاً ماضی قریب میں پاکستان کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ''جنگ'' اور ''دی نیوز'' نے اور اُدھر انڈیا کے کچھ اہم اخباروں نے پاکستان اور انڈیا کے درمیان ''امن کی آشا'' کے ذریعے عوام کے رجحان کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ اخبارات ہی ہیں جو عوام کی مشکلات اور ان کے مسائل کو حکومت کے ارباب اختیار کے سامنے پیش کرتے ہیں اور حکومت کا نقطۂ نظر بھی عوام کے سامنے لاتے ہیں۔ اس طرح اخبارات کو عوام اور حکومت کے درمیان اہم رابطے کی حیثیت حاصل ہے، مگر بعض اخبار کچھ لوگوں بلکہ حکومت تک کو بلیک میل کرتے یا منفی روّیہ اپناتے ہیں، اسے اصطلاح میں ''زرد صحافت'' کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں علاقائی زبانوں اور انگریزی کے علاوہ زیادہ تر اخبار اردو میں چھپتے ہیں جن کا معیار کافی بلند ہے۔ ہمارے ہاں رسائل و جرائد اور کتابوں کی اشاعت بھی بہت زیادہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے اور یہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لیے سرِ دست ہم اتنی ہی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

❁

کیا آج کا نوجوان اقبال کا شاہین ہے؟

مفکرِ مشرق علامہ اقبال ؒ نے اپنی حکیمانہ شاعری میں بہت سی جگہوں پر شاہین، باز، چرہ اور عُقاب کے الفاظ کہیں تشبیہ، کہیں استعارہ، کہیں مجاز مرسل اور کہیں علامت کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ یہ چاروں ایک ہی نسل اور ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے کم یاب شکاری پرندے ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ بلند پرواز ہیں، مردار نہیں کھاتے بلکہ خود شکار کرتے ہیں، خلوت پسند اور اس حد تک بے تعلق ہیں کہ آشیانہ نہیں بناتے بلکہ بیابانوں کی تنہائیاں، صحراؤں کی وسعتیں اور سنگلاخ پہاڑوں کی چٹانیں ان کا مسکن ہوتی ہیں۔

علامہ اقبال ؒ کے ہاں شاہین بلند پروازی، تیز نگاہی اور خودداری کی علامت ہے۔ شاہین سے مراد وہ مردِ مومن خصوصاً اپنی قوم کے نوجوانوں کو لیتے ہیں۔ اب ہمارا موضوع یہ ہے کہ: ''کیا آج کا نوجوان اقبال کا شاہین ہے؟'' تو ہمارا جواب مثبت میں ہے۔ اقبال کو اپنے زمانے کے نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اگر وہ نوجوانوں کو راہِ راست سے بھٹکا ہوا دیکھتے تھے تو انھیں غیرت و حمیت کا درس دیتے تھے، چناں چہ وہ ایک جگہ استفسار کرتے ہیں کہ:

ع   تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

اور جب کبھی اقبال کو اپنے شاہینوں کی پرواز میں کوتاہی یا خرابی نظر آئی تو وہ ان سے مخاطب ضرور ہوئے۔ مثلاً وہ ایک جگہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

دُرّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیّاد، یہ شاہیں ہے کہ دُرّاج!

علامہ اقبال ؒ سمجھتے تھے کہ کسی بھی قوم کی تعمیر وترقی میں نوجوان بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔نوجوان جس نوعیت کی تعلیم وتربیت حاصل کرتے ہیں، وہ اس سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور حصولِ علم وفن کے بعد وہ جس شعبۂ زندگی میں جاتے ہیں، اپنے دائرۂ عمل سے وہی اثرات ڈالتے ہیں۔ قائداعظم ؒ کو بھی اپنے نوجوانوں سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔نوجوانوں نے بھی اُن کی آواز پر ہمیشہ لبیک کہا اور آزادی کی تحریک میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔اس پس منظر میں قائداعظم ؒ نے پشاور یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

"You are the builder of Pakistan and father of the future nation."

دراصل نوجوانوں خصوصاً نوجوان طلبہ کی سوچ بالعموم بے لاگ ہوتی ہے۔وہ مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتے اور نہ ہی سچی بات کہنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ دنیاداری کے بکھیڑوں سے بھی قدرے آزاد اور کچھ کر گزرنے کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وطنِ عزیز کی سلامتی درپیش ہوتی ہے تو وہ صفِ اوّل میں نظر آتے ہیں۔ 65اور 71 کی پاک بھارت جنگوں میں سب نے دیکھا تھا کہ دشمن کے ناپاک ارادوں کے خلاف اِن کی طرف سے شدید ردِعمل کا اظہار ہوا تھا۔ نوجوانوں نے حسبِ استطاعت خدمات انجام دیں۔ زخمیوں کے لیے خون دینے والوں کی اتنی لمبی قطاریں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ اسی طرح روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو نوجوان خصوصاً دینی مدارس کے طلبہ جذبۂ جہاد سے سرشار افغانستان پہنچ گئے۔تحریکِ آزادیِ کشمیر میں آج تک نوجوان ہی سب سے زیادہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔

آج ہمارا ملک اندرونی اور بیرونی بہت سے خطرات سے دوچار ہے۔کہیں اسے نظریاتی خطرات کا سامنا ہے تو کہیں اسلامی تشخص کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔علاوہ ازیں ملک توانائی، لوڈشیڈنگ، مہنگائی، دہشت گردی اور کرپشن کے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ایسے میں قوم کی نظریں اقبال کے شاہینوں کی طرف ہیں کہ وہی اپنے وطنِ عزیز کو ان خطرات سے باہر نکال سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے اندر یقینِ کامل پیدا کریں اور ملک وملّت کی تعمیر کے جذبے کو ماند نہ پڑنے دیں۔ بقول علامہ اقبال ؒ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

❀

دیہاتی اور شہری زندگی

کسی بھی ملک کا معاشرہ دیہاتوں اور شہروں سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ جن ممالک کا زیادہ انحصار زراعت اور فارمنگ پر ہے، ان کی کثیر آبادی دیہات پر مشتمل ہے اور جو ممالک صنعت و حرفت پر بھروسا کرتے ہیں، اُن کی زیادہ آبادی شہروں میں رہتی ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ پاکستانی عوام کا رجحان روز بروز صنعت و حرفت کی طرف ہو رہا ہے، مگر ابھی تک زرعی ملک ہونے کے ناتے ملک کی کم و بیش دو تہائی آبادی کا تعلق دیہی علاقہ جات سے ہے۔ چونکہ دیہات کی نسبت روزمرہ زندگی کی سہولتیں شہروں میں کہیں زیادہ میّسر ہیں، اس لیے ہمارے ملک کے دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ یا تو بڑے شہروں کا رُخ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں یا منصوبے باندھ رہے ہیں۔ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی نے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے، جس سے حکومتِ پاکستان عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کا اپنے قدیم مسکنوں کو چھوڑ کر بڑے شہروں کی جانب رُخ کیوں ہے؟ جب کہ میر انیس نے تو کہا ہے:

دشمن کو بھی اللہ چھڑوائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل، جو بچھڑ جائے چمن سے

تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایسا اپنے دلوں پر جبر کر کے کرتے ہیں کیوں کہ دیہات میں فقط چند ایک ایسے زمین دار گھرانے ہوتے ہیں جن کی زمین زیادہ ہوتی ہے جب کہ اکثریت ایسے مفلوک الحال لوگوں کی ہوتی ہے جن کی اول تو زمین نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم۔ دیہات میں انھیں ڈھنگ کا روزگار بھی نہیں ملتا اور ان کی عمر تنگ دستی میں گزرتی ہے۔ مزید برآں دیہات میں ان کی اولاد کے لیے تعلیمی اور طبّی سہولتوں کا فقدان ہے، اس لیے وہ قسمت آزمائی کے لیے شہروں کا رخ کرنے پر مجبور ہیں، جہاں ضروریاتِ زندگی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں، اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں بھی وافر ہیں اور اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے بروقت طبّی امداد بھی مل جاتی ہے۔ ان کے علاوہ آمد و رفت کی سہولتیں اور ملازمت یا کاروبار کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔ جب کہ شہری زندگی کا تاریک پہلو یہ ہے یہاں کا ماحول دیہات کی طرح پرسکون نہیں ہوتا اور شہروں کو تازہ ہوا اور خالص غذا بھی میسر نہیں ہوتی جب کہ شہری لوگ روزمرہ زندگی اور رہن سہن میں تکلف برتنے اور نمود و نمائش کے عادی ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی ضروریاتِ زندگی بڑھ جاتی ہیں اور یہی چیزیں ان کے سکون کو برباد کر دیتی ہیں جب کہ دیہات میں انسان فطرت کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ سرسبز و شاداب کھیت، کھلی فضا، ہرے بھرے سایہ دار درخت دیہاتیوں کے لیے قدرت کا عطیہ ہیں اور وہ فطرت کے تقاضوں کے تحت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں احسان دانش نے کیا خوب کہا ہے:

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

علاوہ ازیں دیہاتی لوگ عام طور پران پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ملنسار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی کے موازنے میں دیہات کا ماحول پرسکون ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ سکونِ قلب کی تلاش میں دیہات کا رُخ کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے شاعر احسان دانش کی خواہش ہے کہ:

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ سائنسی ترقی کے اس زمانے میں دیہات کو بھی ترجیح دی جانے لگی ہے اور دیہات کو شہروں کی مانند بنیادی سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں جن میں تعلیمی، طبی اور ذرائع آمدورفت کی سہولتیں شامل ہیں۔اب وہ دن دور نہیں جب یورپی ممالک، امریکہ اور آسٹریلیا کی طرح ہمارے ہاں بھی دیہاتی اور شہری زندگی میں خاص فرق باقی نہیں رہے گا۔

❁

کہتے ہیں جس کو عشق

عشق کے لغوی معنی محبت، شیفتگی یا چاہ کے ہیں مگر اصطلاح میں عشق ایک پاکیزہ احساس، طاقت ور جذبے اور مضبوط روحانی کیفیت کا نام ہے۔رشتوں کے درمیان مضبوطی عشق کی بدولت ہے۔ہوا و ہوس کو عشق سمجھنا اور اسے مرد اور عورت تک محدود رکھنا ہرگز روا نہیں بلکہ عشق معرفت کا ایک مقام ہے۔عشق وہ جذبۂ صادق ہے جو انسان کو اعلیٰ روحانی مقامات پر فائز کرتا ہے۔کتابوں میں آیا ہے کہ میر تقی میر کے والد ایک درویش منش، عاشق صالح اور شب بیدار صوفی تھے۔میر کے سر سے والد کا سایہ اس وقت ہی اٹھ گیا تھا جب میر کی عمر فقط گیارہ سال تھی مگر ان کی باتیں میر کے دل پر عمر بھر نقش رہیں۔میر اپنی خودنوشت ''ذکرِ میر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے بیٹے! عشق اختیار کر! کیوں کہ بے عشق زندگی وبال ہے۔دنیا میں جو کچھ ہے، عشق کا مظہر ہے۔ کائنات کی سب چیزیں عشق میں سرگرداں ہیں۔دنیا ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں۔کسی ایسے کا عاشق بن، جس کا یہ دنیا آئینہ ہے۔۔۔۔''

چنانچہ میر کی ساری عمر عشق سے عبارت ہے اور ان کے ہاں عاشقانہ مضامین اور سوز و گداز کی بہتات ہے، اس لیے ان کا کلام آفاقیت کا حامل ہے۔

عشق ایک ایسی اوگھٹ گھاٹی ہے، جس سے گزرنا محال ہے۔ عشق ایک کڑا امتحان ہے، جس میں کامیابی بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ عشق کی سطح بلند سے بلند تر اور بلند تر سے بلند ترین ہے۔ ربّ کائنات کا عشق، محمد مصطفیٰ ﷺ کا عشق، ماں سے محبت، باپ سے محبت، بہن بھائی سے محبت، اولاد سے محبت، عزیز و اقارب سے محبت اور حسنِ فطرت سے لگاؤ، یہ سب کی سب محبتیں انسان کی تشکیل اور تکمیل کرتی ہیں چناں چہ عشق ایک ایسے لطیف اور خوبصورت جذبے کا نام ہے، جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر آسانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا مگر اسے کسی طور پر بھی دماغ کا خلل قرار دینا درست نہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شاہکار نظم "مسجدِ قرطبہ" سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جو عشق کی عمدہ تشریح ہیں:

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ — عشق خدا کا رسول ﷺ، عشق خدا کا کلام!
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات! — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق دیوانگی نہیں، فرزانگی ہے، عشق دماغ کا خلل نہیں، دماغ کا عرفان ہے۔ یہ تفریح نہیں، روح کی آواز ہے اور عشق سود وزیاں سے ماورا ہے۔ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عشق نارمل کیفیت نہیں بلکہ ابنارمل کیفیت کا نام ہے، اس لیے یہ دماغ کا خلل اور ذہن کا فتور ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو دماغی کیفیت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے اور عشق کا وائرس دماغ کی شریانوں سے ہوتا ہوا دل وجگر پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس طرح عشق انسانی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے، چناں چہ ایسے عاشقوں کا مقام آبادیوں سے کہیں دور جنگل، ویرانہ یا صحرا ہے مگر ہم اس سے متفق نہیں۔ جس عشق کو دماغ کا خلل قرار دیا جاتا ہے، وہ عشق نہیں، ہوس ہے، حرص ہے یا طمع ہے جو عشق کے آفاقی اور لافانی جذبے کی توہین ہے۔ عشق تو وہ ہے جو وامق کو عذرا کے ساتھ، قیس کو لیلیٰ کے ساتھ، فرہاد کو شیریں کے ساتھ، رانجھے کو ہیر کے ساتھ، مہینوال کو سوہنی کے ساتھ اور مراد کو سہتی کے ساتھ تھا۔ چناں چہ جذبۂ عشق انسان کا وقار و افتخار اور اعزاز و امتیاز ہے۔ کسی بڑے مقصد کا حصول عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ تاریخ انسانی کے تمام غیر معمولی واقعات، تمام سائنسی ایجادات اور تمام بڑی بڑی تخلیقات عشق کا اعجاز ہیں۔

اردو ادب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ عشق کے استعارے بن چکے ہیں۔ ان محترم شخصیات نے عشق کے اعلیٰ معیارات قائم کر دیے ہیں۔ ہم ان معیارات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عشق کی مسلّمہ خوبیوں کا بخوبی تعین کر سکتے ہیں۔ (ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ماضی بعید میں اور کسی حد تک ماضی قریب میں بھی دنیا بھر میں زیادہ تر طرزِ حکومت بادشاہت رہی تھی یا پھر آمریت لیکن جُوں جُوں زمانے کی فہم وفراست اور عقل وشعور میں اضافہ ہوتا گیا، تُوں تُوں بادشاہت اور آمریت کی جگہ جمہوریت نے لے لی، یہاں تک کہ آج تمام دنیا میں چار دانگ جمہوریت کا غلغلہ ہے۔ اس جمہوریت سے مراد مغربی جمہوریت ہے جس کو انگریزی میں Democracy کہتے ہیں۔ ڈیموکریسی کے بارے میں امریکہ کے معروف صدر ابراہام لنکن کا قول مشہور ہے:

"Democracy is a form of Government of the people, by the pople, for the people."

یعنی جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے، جس میں بندوں کی حکومت، بندوں کے لیے، بندوں پر ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی اسی جمہوریت کا شوروغوغا سب سے بلند ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مشرق کے عظیم مفکر اور دانائے راز علامہ اقبال ؒ مغربی جمہوریت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس نوعیت کی جمہوریت کے حق میں تو نہیں ہیں، جسے مغربی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ آپ کا ایک شعر ہے:

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ؒ ماضی کی بادشاہت اور آمریت کے تو کسی صورت میں طرف دار نہیں مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مغربی جمہوریت ہی وہ جمہوریت یا طرزِ حکومت ہے جس کے وہ حامی رہے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں علامہ اقبال ؒ کی سیاسی زندگی اور اس کے پس منظر میں ان کے کلام کو روبرو رکھنا ہوگا۔

علامہ اقبال ؒ کی ایک طویل زندگی سیاست کی کشمکش میں گزری۔ سیاست میں مصلحت بینی و مصلحت کوشی آپ کے نزدیک جائز نہ تھی اور آپ سیاست کی عیاریوں اور شاطرانہ چالوں کو، جنھیں "فن" کہا جاتا ہے، قابلِ نفرین سمجھتے تھے۔ آپ نے یورپ میں کافی عرصہ قیام کیا۔ اس دوران میں آپ نے یورپ کی معاشرت، اقتصادی ترقی اور سیاسی نظام کو خوب دیکھا بھالا اور

پرکھا تولا تھا۔ آپ نے چوں کہ قرآن، حدیث اور اسلامی تعلیمات کا بھی بنظرِ غائر مطالعہ کر رکھا تھا، چناں چہ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں کے جادۂ کارواں کو مہمیز کرنا مغربی جمہوریت کے بس کی بات نہیں بلکہ مسلمان روحِ اسلام ہی سے صحیح معنوں میں راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور چوں کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا فلسفہ قرآن حکیم ہے، جس میں اسلامی معاشرے کے خدوخال اور بنیادی قواعد وضوابط اکمل طور پر موجود ہیں، اس لیے مسلمانوں کے ہاں سیرت وفرمانِ رسول کے مطابق ہی سیاسی نظام عمدہ اور پائیدار طور پر پنپ سکتا ہے اور مذہب کو کسی طور پر سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہگور

اس کے برعکس مغربی جمہوریت میں مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے جس کی بنا پر وہاں جمہوریت کی چکاچوند تو ہے لیکن حقیقی سکون اور فلاح کا فقدان ہے۔ جب کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کی زندگی میں سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا، جو ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی پودے کی جڑیں کاٹ دینے کے بعد اسے ایک تناور درخت دیکھنے کی حسرت رکھنا۔ اسی لیے تو آپ نے فرمایا:

تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن ، اندرون چنگیز سے تاریک تر

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ چوں کہ مغربی جمہوری نظام میں بندوں کی بندوں پر حکومت ہوتی ہے، اس لیے اس نظام میں شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت کا تصوّر محال ہے۔ اس نظام میں بندوں کو گنتے ہیں، انھیں تولتے نہیں۔ آج پاکستان میں جو جمہوریت ہے وہ اَن پڑھوں کے سر پر چل رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کسی دکان کے تھڑے پر پڑے ہوئے ایک ''جہاز'' کا ووٹ پاکستان کے مایۂ ناز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ووٹ کے برابر قیمت رکھتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ''پیامِ مشرق'' میں اس بات کا اظہار برملا کر دیا کہ:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

موضوع تو طویل ہے اور یہاں سیرِ حاصل بحث کی گنجائش نہیں مگر ہماری گفت گو کا حاصل یہ ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ایسا سیاسی نظام اپنائیں جس میں وہ قرآن حکیم اور سُنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیکو اپنا آئین بنائیں اور ان کی مملکت کا انداز وہی ہو جو خلافتِ راشدہ کا تھا:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

سیر و سیاحت، تفریح بھی، تعلیم بھی

فرمانِ الٰہی ہے: سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اس زمین پر گھومو پھرو۔ زمین پر گھومنے پھرنے کا دوسرا نام سیر و سیاحت ہے اور سیر و سیاحت بلاشبہ تفریح بھی ہے اور عمدہ تعلیم کا ذریعہ بھی۔ آدمی گھر سے نکلتا ہے تو اس کے علم میں طرح طرح سے اضافہ ہوتا ہے۔ وہ قسم قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اسے اشیا اور جگہوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی نظروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ یعنی "علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین جانا پڑے۔" آپ ﷺ نے یہ ارشاد اس لیے نہیں فرمایا تھا کہ اُس زمانے میں چین میں علم و حکمت کے دریا بہتے تھے اور چار دانگِ عالم سے تشنگانِ علم وہاں آ کر علم کی تشنگی دور کرتے تھے بلکہ فرمانِ نبوی ﷺ کے مفہوم یہ تھا کہ چین عرب سے ہزاروں میل دور تھا اور چین تک کے سفر کی تاب لانا بڑا محال تھا۔ اِس سفر میں وسیع سمندری فاصلے طے کرنے کے بعد دشوار گزار پہاڑ بھی آتے تھے، جنگل ویرانے بھی، لق و دق صحرا بھی اور دریا بھی اور ندی نالے بھی، پھر تیز و تند موسم کی سختیاں برداشت کرنا اس کے علاوہ تھا۔ دورِ رسالت ﷺ میں اکیلے دوکیلے شخص کا عازمِ سفر ہونا بھی بعید از تھا بلکہ لوگ کارواں در کارواں ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتے تھے اور اثنائے سفر میں مشکلوں کا پیش آنا لازمی امر تھا، جس کی تاب لانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا، چناں چہ آپ ﷺ کا فرمان اسی پس منظر میں ہے کہ راستے کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سیر و سیاحت اور علم و فن کے حصول کی افادیت عربوں کے ذہن نشین کرنا تھا۔

مثل مشہور ہے کہ: "پائے گدا لنگ نیست، ملکِ خدا تنگ نیست" یعنی انسان ہمت کرے تو جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ خدا کی سرزمین بہت وسیع ہے۔ دنیا میں پانچ بحرِ اعظم اور سات برِّ اعظم ہیں اور خدا تعالیٰ نے سیر و سیاحت کی جبلّت کم یا زیادہ ہر شخص کو دی ہے، چناں چہ کچھ لوگوں کو تو بوجوہ گھروں سے نکلنا محال ہوتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے سمندِ شوق کو نہیں روک سکتے اور وہ سفر کا سامان تیار کر کے گھروں سے شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں گھومنے پھرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں جن میں سے شاید راقم الحروف بھی ایک ہے۔ زیادہ تر سیاح تو سفر محض اس لیے کرتے ہیں کہ:

"تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے"

مگر کچھ لوگ سیر و سیاحت بڑے اہتمام سے کرتے ہیں، کچھ "سفر وسیلۂ ظفر" بنانے کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں جب کہ کچھ سیاح دنیا سے کچھ سیکھنے اور سکھانے کا جذبۂ فراواں لے کر دنیا کے دُور دراز گوشوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں ہر خطۂ زمین کا محض سفر ہی مرغوبِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ وہ وہاں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت کا بھی غائر مطالعہ کرتے اور اپنے

مشاہدات و تجربات کی روشنی میں سفرنامے بھی لکھ جاتے ہیں۔اس حوالے سے قدیم سفرنامہ نگاروں میں البیرونی، ابنِ بطوطہ، مارکو پولو، کولمبس، واسکوڈی گاما اور ناصرالدین شاہ قاچار کے نام خاصے نمایاں ہیں۔

جن لوگوں نے بہ رضا ورغبت اور ذوق وشوق کے ساتھ سفر اختیار کیے وہ ظفر اور فتح مندی سے ضرور بہرہ یاب ہوئے۔آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اِس زمانے میں سفر و سیاحت بہت آسان ہے۔ کچھ ملکوں نے تو سیر و سیاحت (Tourism) کو باقاعدہ صنعت کا درجہ دے رکھا ہے اور سیر و سیاحت کو آسان اور پرکشش بنا دیا ہے جہاں لوگ جُوق در جُوق جاتے ہیں۔ان ملکوں میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، سپین، امریکہ، آسٹریلیا، چین، جاپان، انڈیا، مصر، سعودی عرب، ترکی، یونان، شام اور ملائیشیا زیادہ اہم ہیں۔قدرت نے پاکستان کی سرزمین کو بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہاں گرم پانیوں کا آٹھ سو کلومیٹر طویل ساحل ہے، جس میں سمندری مخلوق کی کثرت ہے، یہاں سر بفلک پہاڑوں کے سلسلے ہیں اور دنیا کی گیارہ بلند ترین اور برف پوش چوٹیوں میں سے سات چوٹیاں، جن میں کے ٹو، نانگا پربت اور راکاپوشی شامل ہیں، پاکستان میں ہیں۔صحت افزا مقامات اور ایسی ایسی سرسبز و شاداب اور گل پوش وادیاں ہیں کہ:

ز فرق تا بقدم ہر کُجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

یعنی کسی منظر پر نگاہ جا پڑے تو وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ پاکستان میں ایسے میٹھے اور رسیلے پھل ہیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں پیدا نہیں ہوتے علاوہ ازیں بڑی اہمیت کی حامل تاریخی جگہیں ہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں سیر و سیاحت (ٹورازم) کو ابھی تک صنعت کا درجہ نہیں دیا گیا حالانکہ یہ وقت کی اشد ضرورت ہے اور اس صنعت سے خاطر خواہ زرمبادلہ بھی کمایا جا سکتا ہے۔

❁

دل کی مانیں یا دماغ کی

دل اور دماغ کا موازنہ ہمیشہ سے کیا جاتا رہا ہے۔دل انسانی جذبات واحساسات کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ دماغ منطق واستدلال کا نمائندہ ہے۔روحانیات اور تصوّف کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے جب کہ فکر و فلسفہ کو دماغ سے نسبت دیتے ہیں۔دنیا میں کچھ لوگ دل کی مانتے ہیں اور کچھ دماغ کی بات کو اہمیت دیتے ہیں۔دل کی بات کی پیروی کرنے والے صاحبانِ دل اور عقل و خرد کی بات کو اپنا راہبر و رہنما بنانے والے صاحبانِ عقل و دانش کہلاتے ہیں۔مصافِ زندگی میں ان دونوں رویّوں کے اپنے اپنے

فوائد اور نقصانات ہیں۔ جو لوگ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑے بڑے فیصلے کر گزرتے ہیں، اس دنیا میں اُن کی بھی کوئی کمی نہیں ہے اور وہ لوگ بھی تعداد میں کم نہیں ہیں جو صرف اور صرف عقل کی روشنی میں اپنے فیصلے کرتے ہیں، تاہم مفکرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دل کو دماغ پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

یا وہ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

عقل گو آستاں سے دُور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور دل کا نُور نہیں

''بانگِ درا'' میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نظم کا عنوان ہی ''عقل و دل'' ہے۔ اس نظم میں بڑی بصیرت ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دل سے مراد عشق لیا ہے اور انھوں نے جا بجا عقل اور دل (عشق) کا مقابلہ کیا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دل (عشق) کو عقل پر برتری حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عقل کے ذریعے انسان نئی نئی باتیں دریافت کرتا ہے اور دل (عشق) کے ذریعے اُن حقائق کا یقین اور عقیدہ حاصل کرتا ہے جن تک عقل اور حواسِ خمسہ کی رسائی نہیں ہوتی۔ ''ضربِ کلیم'' میں بھی ''عقل و دل'' کے عنوان سے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قطعہ کہا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ساری دنیا عقل کی غلام بنی ہوئی ہے لیکن دل (عشق) اس کی غلامی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس سے ہر آن برسرِ پیکار رہتا ہے۔

بیرونِ کائنات کی تسخیر کے لیے دماغ اور اندرونِ کائنات پر غلبے کے لیے دل کو کام میں لانا افضل ہے۔ ہر چند ان دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا آسان نہیں تاہم اگر ایسا ہو جائے تو اس کے بہترین اور مثبت نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بیشتر معاملات میں ہمیں دماغ کی بات مان لینا چاہیے مگر کبھی کبھی دل کی بات مان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ کسی ایک پر مکمل انحصار شاید عام انسان کے بس کی بات نہیں، انبیا و رسل ایسا کریں تو کریں۔

اردو شعری ادب میں دل امنگوں، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کی علامت ہے کہ یہ چیزیں دل میں پیدا ہوتی ہیں جب کہ دماغ سوچ بچار کی علامت ہے کہ دماغ مصافِ زندگی میں قدم اٹھانے سے پہلے منفعت اور نقصان کے پس منظر میں غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے یعنی دل کے فیصلے سود و زیاں سے ماورا ہوتے ہیں اور عقل سُود و زیاں کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلے کرتی ہے۔ دل کی دنیا وسیع بھی ہے اور عریض بھی۔ یہ من کی دنیا ہے، یہ باطن کی دنیا ہے، یہ بصیرت کی دنیا ہے جب کہ عقل کے مقابلے میں دماغ

بصارت کی دنیا ہے۔ یہ دنیاوی اور مادی چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔

دل کا آئینہ محبتِ الٰہی میں سرشار ہو کر جس قدر شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہے، اُسی قدر وہ رب کائنات کی پسندیدگی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال ؒ نے کیا خوب کہا ہے:

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں

اس کے موازنے میں صرف دماغ کو بروئے کار لانے والے ہر چیز کے حوالے سے مادیت پسندانہ (Materialistic) نقطۂ نظر اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی سوچ یک طرفہ اور جانب دارانہ ہو جاتی ہے، اس لیے راہِ اعتدال ہی بہتر ہے کہ یہی اسلام کی بھی تعلیم ہے۔ (ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

❁

ہمارے معاشرتی مسائل

کسی بھی منظم اور مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے افراد اور حکومتوں پر کچھ حقوق و فرائض لاگو ہوتے ہیں، جنھیں بہ حسن و خوبی ادا کرتے رہنے ہی سے زندگی کی گاڑی سلیقے اور سلامتی کے ساتھ رواں رہتی ہے، لیکن جوں ہی کسی معاشرے میں کوئی حکومت عوام کے بنیادی حقوق کی فراہمی سے اغماض برتنے لگتی ہے یا عوام اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ پورا نہیں کرتے تو معاشرے میں مختلف طرح کے مسائل سر اٹھانے لگتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کو اس وقت بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔

اس وقت ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ عدمِ مساوات ہے، باقی تمام مسائل اسی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ہم پاکستان کو مملکتِ اسلامیہ قرار دیتے نہیں تھکتے اور دوسری جانب مغربی جمہوریت ہماری نظروں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے ہزاروں اختلاف رکھنے کے باوجود سماجی مساوات کے نقطے پر اتفاق کرتے ہیں۔ ایک طرف گورے، کالے، عربی، عجمی، خلیفہ و بدو، محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب بڑی بڑی سپر پاوروں کے حکمران سائیکل پہ سواری کرتے اور بازار سے سبزی خریدتے نظر آتے ہیں، لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ساڑھے سات دہائیوں سے کسی ایک نظام کو مکمل طور پر متعارف یا نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، جس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے ہاں کی نسل در نسل منتقل و مضبوط ہوتی وڈیرہ شاہی اور غریبوں کے خون پہ پلتی سرمایہ داری ہے۔

ایک کہاوت ہے: ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں''، یعنی جو وتیرہ کسی گھر یا ریاست میں بڑے اپنائیں گے، چھوٹوں کو بھی اسی پر عامل پائیں گے۔ ہمارے بڑوں یعنی حکمرانوں میں چونکہ حصولِ دولت و جائیداد کی دوڑ جاری ہے، اس لیے ان کی دیکھا

دیکھی عوام نے بھی پیسے کے حصول کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا لیا ہے، جس کے نتیجے میں رشوت، سفارش، اقربا پروری، بدعنوانی، مہنگائی، اخلاقی اقدار کی تباہی، چوری، ڈکیتی حتیٰ کہ قتل و غارت گری جیسے مسائل ہمارے ہاں عام ہو چکے ہیں۔

انصاف میں تاخیر یا انصاف کی عدم فراہمی بھی ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے ہاں دولت منداور بااثر طبقہ چونکہ خود کو ہر قانون سے بالا سمجھتا ہے، پیسے کے بل بوتے پر انصاف کو خریدنے، موخر کرنے اور قانونی و عدالتی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی روش بھی عام ہے۔ یہاں تک کہ حاکم کے راستے میں حائل ہونے والے قانون کی شکل ہی مسخ کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح تعلیم کسی بھی قوم کی ترقی کا پہلا زینہ ہوا کرتی ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا تناسب شرم ناک حدوں کو چھوتا ہے۔ ملک میں طرح طرح کے تعلیمی نظام نافذ ہیں، غیر ملکی زبان میں تعلیم دینے سے، زبان کی اجنبیت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حکمرانوں اور بااثر افراد کے بچے یا تو بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرتے ہیں یا ان کے لیے الگ سے ادارے قائم ہیں اور عوام الناس کے بچے، حالات، چوں چوں کا مربہ قسم کے نصابات، خستہ حال تعلیمی اداروں اور جہالت پر مبنی تعلیمی پالیسیوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

لوڈ شیڈنگ بھی اس وقت وطنِ عزیز کا بہت بڑا مسئلہ ہے جو روز بہ روز گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتا جا رہا ہے بلکہ پٹرولیم، گیس اور بے شمار دیگر اشیائے ضروریہ کے سلسلے میں بھی قوم کو بحران کا سامنا ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ نااہل حکمران اور توانائی کے سلسلے میں کی جانے والی ناکام اور ناکافی منصوبہ بندی ہے۔ توانائی کے بحران کی وجہ سے ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی زراعت بھی مشکلات سے دوچار ہے اور انڈسٹری تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں تک دیہاتوں کا تعلق ہے وہاں عام آدمی کو پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں، علاج معالجے کی بنیادی سہولت کو لوگ ترس رہے ہیں۔ سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ اس وقت ہمارے مسیحا وہ لوگ ہیں جنھیں مسائل کی شدت کا اندازہ ہے نہ ان کے حل کا ادراک اور ظرف۔ صورتِ حال عین مین وہی ہے:

الجھا ہوں کچھ ایسے پیچ و خم میں
منزل تو ہے راستہ نہیں ہے

(ڈاکٹر اشفاق احمد ورک)

زلزلہ - ارضیاتی تبدیلی یا انتقامِ قدرت

زلزلے کو ہندی میں بھونچال اور انگریزی میں Earth Quake کہتے ہیں۔ ناگہانی طور پر کسی ارضیاتی تبدیلی کی وجہ سے زمین کانپتی ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ زمین کا کانپنا کبھی تو اس قدر کم ہوتا ہے کہ زمین کے مکینوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی زمین اس زور سے کانپتی ہے کہ عمارتیں لرز کر رہ جاتی ہیں۔ گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے بجنے لگتے ہیں، شیشے ٹوٹ

جاتے ہیں اور بعض اوقات عمارتیں منہدم ہو جاتی ہیں اور عمارتوں کے مکین ملبے تلے دب کر مر جاتے ہیں۔ زمین شق ہو جاتی ہے اور سڑکوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ماہرینِ ارضیات نے ایسی تجربہ گاہیں بنا دی ہیں جہاں زلزلے کی شدت کی پیمائش ہو جاتی ہے۔ امریکہ نے تو اس سلسلے میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کیسا ہی زلزلہ کیوں نہ آئے، وہاں اس کی شدت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اصطلاح میں زلزلے کی پیمائش کو "ریکٹر سکیل" (Richter Scale) کہا جاتا ہے۔ اگر زلزلہ پانچ ریکٹر سکیل کے لگ بھگ ہے تو شدید ہے۔ پانچ سے ساڑھے چھے ریکٹر سکیل ہے تو شدید تر ہے اور اس سے زیادہ ہے تو شدید ترین اور تباہ کن ہے۔

ماہرینِ ارضیات اب اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ زلزلہ آنے کی پیش گوئی کی جا سکے، جس میں وہ تادمِ تحریر تو کامیاب نہیں ہو سکے مگر کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیاب ہو جائیں۔ زلزلے کیوں آتے ہیں؟ اس بارے میں جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام برِاعظم مختلف پلیٹوں پر واقع ہیں جو انتہائی گرم سیال مادوں پر تیر رہے ہیں۔ ان پلیٹوں کے باہمی ٹکراؤ سے جو توانائی پیدا ہوتی ہے، اسی کی لہریں زمین میں ارتعاش پیدا کرتی ہیں، جس کی وجہ سے زمین کانپنے لگتی ہے، جسے زلزلے کا نام دیا جاتا ہے۔

دنیا کے کچھ ممالک ایسے خطوں میں واقع ہیں، جہاں ارضیاتی طور پر زمین میں ہلچل پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ان ممالک میں جاپان، میکسیکو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، اٹلی، ایران، انڈونیشیا اور چین شامل ہیں۔ ان ممالک میں زلزلے آتے رہتے ہیں اور یہاں کے لوگ زلزلوں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے گھر بھی تعمیر کرتے ہیں تو ان کی بنیادیں اتنی مضبوط رکھتے ہیں کہ وہ زلزلے کی صورت میں زمین بوس نہ ہوں، پھر بھی زلزلے متذکرہ ممالک کے علاوہ چند اور ممالک میں بھی کبھی کبھی تباہی و بربادی پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ 8/ اکتوبر 2005ء کے زلزلے نے پاکستان کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں جو قیامت برپا کی، اُس کا تصور کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس زلزلے نے مظفر آباد، بالاکوٹ، باغ، مانسہرہ، راولاکوٹ اور گرد و نواح کے علاوہ ایک وسیع و عریض سرزمین کو تباہ و برباد کر دیا، پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گئے، چٹانیں ٹوٹ پھوٹ گئیں، ندی نالوں کے رُخ بدل گئے، بشمول عطا آباد کئی نئی جھیلیں بن گئیں، عمارتیں زمین پر آ رہیں، اسی ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے، لاکھوں معذور ہو گئے اور جو مالی ضرر پہنچا، اس کا شمار محال ہے۔ اس زلزلے سے چند سال پہلے جاپان کے شہر کوبے، ہندوستان کے شہر احمد آباد اور ایران کے قدیم شہر بام میں انتہائی خوفناک زلزلے آئے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے 1935ء میں کوئٹہ کے شدید ترین زلزلے سے پورا شہر برباد ہو گیا تھا اور پچاس ہزار سے زیادہ افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زلزلوں کو کسی ریکٹر سکیل پر نہیں بلکہ غیرت و حمیت اور شرم و حیا کے پیمانے سے ناپنے کی ضرورت ہے کیوں کہ زلزلہ کسی زیرِ زمین کا نہیں بلکہ بالائے زمین انتشار کا نتیجہ ہے اور قہار و جبار و قادرِ مطلق کا انتقام ہے اور اُن انسانوں کے لیے ایک طرح کی وارننگ ہے جو خدا کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔

اس موقع پر زلزلے کے حوالے سے ہندوؤں کے اس دل چسپ مگر مضحکہ خیز عقیدے کا ذکر کرنا بے محل نہیں، جس کے مطابق ''زمین گائے'' نے زمین کو اپنے ایک سینگ پر ٹکا رکھا ہے جب اس کا وہ سینگ بوجھ کے مارے تھک جاتا ہے تو گائے زمین کو دوسرے سینگ پر منتقل کر لیتی ہے جس کے سبب زلزلہ آتا ہے اور جہاں تک اردو شعری ادب کا تعلق ہے تو کسی شاعر نے زلزلے کی کیا خوب صورت توضیح کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا ہے
کوئی بے تاب تہِ خاک تڑپتا ہو گا

❁

تعمیرِ ملک میں طلبہ کا کردار

زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے والا ہر شخص اپنی جگہ خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مستقبل کا انحصار اگر اکابرینِ سیاست پر ہے تو مزدور اور کارخانہ دار بھی مستقبل کے لیے امید کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ علمائے دین قوم کے مستقبل کو سنوارتے ہیں تو ایک افسر ملکی نظام چلاتا ہے۔ استاد علم کی ضیا سے طالب علموں کی راہیں منور کرتا ہے۔ سب شعبوں کے لوگ اپنی جگہ ٹھیک سہی مگر غور سے دیکھا جائے تو طالب علم کسی قوم کے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ قوم کا مستقبل ان سے وابستہ ہوتا ہے۔ کوئی قوم اپنے نوجوانوں سے صرفِ نظر کر کے تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ مستقبل کی تعمیر و تشکیل کا انحصار انھی کے عزم و عمل پر ہے۔

طلبہ کا سب سے بڑا مقصد تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ ہمیشہ وہی قومیں ترقی کی معراج پر پہنچتی ہیں جن کے نوجوان بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوں۔ دورانِ تعلیم میں انھیں چاہیے کہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے محنت کو اپنا شعار بنائیں، مثبت انداز میں سوچیں، بزرگوں اور اساتذہ کے نقشِ قدم پر چل کر ذہنی تعمیر کے مرحلے طے کریں۔ طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ حصولِ علم میں زیادہ سے زیادہ کوشاں رہیں کیوں کہ وہ علم کے زور پر ہی اپنے وطن کے لیے کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔

ہمارے نوجوانوں کو اعلیٰ سیرت و کردار کا مالک ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے نوجوان، راست بازی اور ایثار و قربانی جیسے اعلیٰ اوصاف سے متصف ہوں گے، تو وہ ارفع مقاصد کی تکمیل کر سکیں گے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

اعلیٰ سیرت وکردار کی تشکیل کے لیے جہاں علم حاصل کرنا طلبہ کے لیے ضروری ہے، وہاں ان پر یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ علم کو پھیلانے کے لیے بھرپور کردار ادا کریں۔ طلبہ ملک کے ناخواندہ لوگوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے قومی ترقی واستحکام میں قابلِ قدر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ناخواندگی کی وجہ سے معاشرے میں بہت سے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ہمت سے کام لے کر خواندگی کا تناسب بڑھا سکتے ہیں۔ ناخواندگی کی وجہ سے معاشرے میں بہت سی غلط رسوم جڑ پکڑ چکی ہیں، جن پر اندھا دھند عمل کرنا ہمارے عوام کا شعار بن چکا ہے۔ طلبہ ان رسوم کے نقائص سے عوام کو روشناس کرا کے معاشرے کو پاک کر سکتے ہیں۔

طلبہ کی ذمہ داریاں گوناگوں ہیں۔ طلبہ کی ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی قومی تاریخ سے واقف ہوں۔ طلبہ کو اپنی روایات سے رشتہ استوار رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو وراثت میں ملنے والی تاریخ کے اثرات ونتائج سے واقف ہوں گے اور اس طرح وہ اپنا کردار زیادہ فعال طریقے سے ادا کر سکیں گے۔

ہماری قوم کو آزادی حاصل کیے ہوئے پون صدی گزر چکی ہے اور یہ ایک طویل عرصہ ہے۔ قوم کو ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ عوام میں آزادی کا شعور مکمل طور پر بیدار کیا جائے کہ آزاد قوم کی حیثیت سے اگر وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر قدم ملا کر چلنا چاہتے ہیں، تو طلبہ کو ایک آزاد شہری کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے انتھک محنت کرنا ہوگی اور اپنے فرائض جانفشانی سے ادا کرنا ہوں گے۔ یہ احساس پوری قوم میں جدوجہد کی ایک نئی روح پھونک دے گا اور ترقی کی شاہراہ پر سالوں کے فاصلے دنوں میں طے ہوں گے۔

طلبہ ایک ایسا طبقہ ہے جو صحیح معنوں میں قوم کی بے لوث خدمت کر سکتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی ملک میں انقلاب کی ضرورت ہو تو طالبِ علم اپنی کتابوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑتے ہیں۔ ان حالات میں اگر کوئی طاقت سب سے زیادہ فعال ہوتی ہے تو وہ طلبہ کی طاقت ہے جس پر قوم ناز کر سکتی ہے۔ بقول شاعر:

اے جواں تو قوم کی دولت بھی ہے تو قیر بھی — تجھ سے وابستہ ہے ملّت کی ہر اک تقدیر بھی
تیری پیشانی کے قطرے قوم کا آبِ حیات — تیری گردِ رہ کے آگے ہیچ ہے اکسیر بھی

تحریکِ پاکستان میں طلبہ کی قربانیاں، سیلاب کے دنوں میں ہم وطنوں کی چارہ گری، جنگوں میں زخمی ہونے والے بھائیوں کے لیے خون کے عطیات کی فراہمی، زلزلہ زدگان اور سماوی آفات کے متاثرین کی امداد، یہ سب چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ طلبہ نے منظم ہو کر ہمیشہ آڑے وقت میں قوم کی معاونت کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت بھی قائداعظم ؒ طلبہ کی قوت پر گہرا یقین رکھتے تھے۔ بابائے قوم ؒ نے جب انھیں تحریکِ پاکستان میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آواز دی تو ہمارے جیالے نوجوان میدانِ عمل میں کود پڑے۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے میں مسلمانوں کو نظریۂ آزادی سے روشناس کرایا۔ ان پر ایک ہی ذھن سوار تھی کہ وہ قائداعظم ؒ کا پیغام ایک ایک مسلمان تک پہنچا دیں۔ ان کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پوری قوم

قائداعظم ؒ کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوئی اور پاکستان کا خواب حقیقت پذیر ہوا۔ قائداعظم ؒ طلبہ کو قوم کا بیش قیمت سرمایہ سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے فرمایا:

''پاکستان کو اپنے جوانوں بالخصوص طلبہ پر فخر ہے، جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صفِ اوّل میں رہے ہیں۔ آپ مستقبل کے معمارِ قوم ہیں۔''

غرض طلبہ ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے معاشرے کے لیے ہر طرح سے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ اپنی فطری صلاحیتوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ فرض شناسی کے جواہر اپنے اندر پیدا کریں۔ اپنے آپ کو اسلامی سیرت و کردار کے سانچے میں ڈھالیں۔ خلوص، محنت اور لگن سے اپنی صلاحیتوں کو ابھاریں۔ اس صورت میں وہ ستاروں پر کمند ڈال سکیں گے اور ایام کے راکب بن سکیں گے۔

❁

میری پسندیدہ کتاب

مشاغل فارغ اوقات میں انسانی دلچسپی کا سامان ہوا کرتے ہیں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی مشغلہ رکھتا ہے۔ بعض لوگ تفریح پسند کرتے ہیں۔ وہ نت نئی سیرگاہوں میں وقت گزارنا پسند کرتے ہیں۔ بعض فلموں اور موسیقی کے پروگراموں کے رسیا ہوتے ہیں۔ کئی مختلف کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے کتابوں کے سوا کچھ نہیں بھاتا۔ مجھے مطالعہ بہت عزیز ہے۔ مطالعہ کے بغیر مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ میرے تکیے کے قریب اکثر کتابیں دھری نظر آتی ہیں۔ میں زیادہ تر مزاحیہ تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔ یوں تو کئی مزاح نگار دل کو چھوتے ہیں مگر مجھے سب سے زیادہ پطرس بخاری نے متاثر کیا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ میری پسندیدہ کتاب کون سی ہے؟ تو میں برجستہ یہی جواب دوں گا کہ مجھے ''پطرس کے مضامین'' بے حد پسند ہے۔

اگرچہ یہ مختصر سی کتاب ہے مگر اس کا مطالعہ شروع کیا جائے تو کتاب ختم کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک مزاحیہ تحریر آپ پر مسکراہٹوں کی بوچھاڑ کرتی نظر آتی ہے۔ ہر چند پطرس بخاری انگریزی کے استاد تھے مگر انھوں نے اپنی مختصر سی کتاب تخلیق کر کے دنیائے ادب میں خود کو امر کر لیا ہے۔

''پطرس کے مضامین'' پطرس بخاری کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے اردو کی مزاحیہ نثر میں بلاشبہ بلند مقام حاصل ہے۔ کتاب میں شامل ہر تحریر میں بے ساختہ شگفتگی عروج پر نظر آتی ہے۔ پطرس کے مزاح کا سرچشمہ خود مصنف کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ انھیں مزاح تخلیق کرنے کے لیے روایتی قسم کے مزاحیہ موضوعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ گھسے پٹے لطائف، چٹکلوں اور ظریفانہ واقعات قلم بند کر کے شگفتگی پیدا نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے اردگرد سے، اپنے ماحول، اور ذاتی مشاہدے سے مزاح تخلیق کرتے ہیں۔

پطرس بخاری کا مشاہدہ اس قدر گہرا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پُر مزاح کیفیات پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

کتاب کے مضامین میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

ہاسٹل میں پڑنا، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، کتے، اردو کی آخری کتاب، میں ایک میاں ہوں، مرید پور کا پیر، انجام بخیر، سینما کا عشق، میبل اور میں، مرحوم کی یاد میں اور لاہور کا جغرافیہ۔

''ہاسٹل میں پڑنا'' میں طلبہ کے ہاسٹل کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور ہاسٹل کی سرگرمیاں اور طلبہ کی رات دن کی مصروفیات کو بہت پرلطف انداز میں پیش کیا گیا۔

''کتے'' پطرس بخاری کا شاندار مضمون ہے جس میں ہلکے پھلکے انداز میں کتوں کے حوالے سے ان کا گہرا مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ اردو کی آخری کتاب ہو یا مرید پور کا پیر، مرحوم کی یاد میں یا لاہور کا جغرافیہ، پطرس بخاری ہر مضمون میں اپنے فن کی معراج پر دکھائی دیتے ہیں۔ پطرس کے مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' سے یہ چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں، جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخرِ بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔''

پطرس ایک نہایت خوش فکر اور زندہ دل فنکار تھے۔ ان کا مزاح ان کی اس خوش فکری اور زندہ دلی کا مرقع ہے۔ ان کے یہ مضامین معاشرے کی اصلاح کی منصوبہ بندی پر مبنی نہیں تھے۔ وہ تو روزمرّہ زندگی کے حوالے سے ہنسی ہنسی میں بعض تلخ حالات و واقعات کو بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی تحریروں سے ان کی ذہانت اور گہرا مشاہدہ جھلکتا ہے جس سے قاری کے لبوں پر بے اختیار تبسم پھوٹ بہتا ہے۔ وہ حالات و واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں نکتہ آفرینی ایک رنگارنگی سی پیدا کرتی ہے۔ وہ واقعات کی مضحک کیفیتوں کو شگفتہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ''پطرس کے مضامین'' کے تمام کردار ہمارے معاشرے ہی سے لیے گئے ہیں۔ ان کے کرداروں میں زندگی کی حرارت دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام ناقدینِ ادب نے ان کے مزاح کو نہایت جاندار اور توانا قرار دیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں دوسروں کے ساتھ خود پر بھی ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ''پطرس کے مضامین'' جیسی شہرہ آفاق تصنیف کی تحریریں دوستی، بے تکلفی اور اعتماد کی ایسی فضا اور ماحول پیدا کرتی ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر قاری کے دل و دماغ میں مسرت و انبساط کی ہلکی ہلکی لہریں تموج آشنا ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب قلب و ذہن کو تازگی، شادابی، بالیدگی اور فرحت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ انسان کتنا ہی اداس اور دلگیر کیوں نہ ہو ''پطرس کے مضامین'' جیسی تصنیف کے مطالعے سے اس کے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے۔

پاکستان چین اقتصادی راہداری

CPEC (China Pakistan Economics Corridon)

پاکستان اور چین کے تعلقات باہمی مفادات پر مبنی ہونے کے باوجود درحقیقت دونوں ممالک کے مابین محبت بھرے گہرے جذبات کے ترجمان ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان چین تعلقات بحرا کاہل سے زیادہ گہرے اور کوہِ ہمالیہ سے زیادہ بلند ہیں، تو یہ بالکل بجا ہے۔

پاکستان چین اقتصادی راہداری 46 ارب ڈالر مالیت کا دوطرفہ منصوبہ ہے۔ گمان غالب ہے کہ منصوبہ تکمیل پذیر ہونے کے بعد خطے کے لیے کایا پلٹ ثابت ہوگا۔ یہ اقتصادی منصوبہ تین ہزار کلومیٹر شاہرات کے ذریعے جس کا بیشتر حصہ دمِ تحریر مکمل ہو چکا ہے، چین کے شہر کاشغر کو پاکستان کی جدید بندرگاہ گوادر سے منسلک کردے گا۔ کاشغر چین کی اکثریت مسلم آبادی کے صوبے سنکیانگ کا دارالحکومت ہے اور یہ وہی شہر ہے جو قدیم زمانے میں شاہراہ ریشم پر اہم ترین پڑاؤ رہا ہے اور جس کے بارے میں مفکرِ مشرق علامہ اقبال ؒ نے خواب دیکھا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

پاکستان اور چین دونوں ملکوں کے اقتصادی ماہرین کا بڑے وثوق کے ساتھ کہنا ہے کہ اس ربط ضبط کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی شاہراہ کے ساتھ ساتھ بالائی ڈھانچے کے طور پر دوسرے ترقیاتی منصوبے بھی شروع کیے جارہے ہیں جن میں سے زیادہ تر تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ جب پاکستان چین اقتصادی راہداری منصوبہ 2030ء میں ہر لحاظ سے مکمل ہوجائے گا تو یہ یقیناً دونوں ملکوں کے تابناک مستقبل کا ابتدائیہ ہوگا۔

ظاہر بات ہے کہ سی پیک منصوبے کی وجہ سے چین کو بحرِ ہند کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل ہوجائے گی اور اسے مشرق وسطیٰ (مڈل ایسٹ) سے تیل (توانائی) کی درآمدات میں سہولت میسر آجائے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی چند اقدامات اٹھانے سے توانائی کے بحران سے نجات مل جائے گی۔ اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان میں واٹر، سولر اور تھرمل پاور پلانٹس کی یکے بعد دیگرے تنصیب ہورہی ہے، جس کی وجہ سے پاکستان کو 34 ارب ڈالر کی بچت ہوگی۔ اس منصوبے میں ایران، روس اور سعودی عرب کی شمولیت کی شدید خواہش نے اس کی اہمیت وافادیت دوچند کردی ہے۔ یہ اقتصادی منصوبہ ترقی پذیر پاکستان کے لیے امکانات کی ایک وسیع کائنات ہے۔ پاکستان کی ہمہ جہت اقتصادی ترقی کے سوتے اسی منصوبے سے پھوٹیں گے۔

اس معجز نما اقتصادی کرشمے کا ایک بڑا حصہ کوہِ قراقرم کے سنگلاخ اور دشوار گزار ترین پہاڑی سلسلے کے دروں سے گزرتا ہے۔ ان راستوں سے سڑک گزارنے میں بے شائبہ اور بلا مبالغہ خونِ جگر شامل ہوا ہے۔ جس کسی نے ان راستوں پر سفر کیا ہے، اسے علامہ اقبال ؒ کا یہ شعر ضرور یاد آیا ہوگا:

نقش ہیں سب نا تمام ، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام ، خونِ جگر کے بغیر

سی پیک کے منصوبے کا، جسے ہم نے معجز نما کہا ہے، ایک دوسرا پہلو، جواب تک پوری توجہ حاصل نہیں کر سکا، یہ ہے کہ اس کی بدولت پاکستان کی بحری قوت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ سی پیک کے تحت چین پاکستان کو آٹھ ایٹمی آبدوزیں دے رہا ہے، جو ہماری بحریہ کی صلاحیت کو مزید فعال اور مستحکم بنا دیں گی۔

فی زمانہ گوادر کی بندرگاہ کو تجارتی مقاصد کے لیے ترقی دی جا رہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب اسے دفاعی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکے گا۔ سی پیک منصوبے سے پاکستان کے پانچوں صوبوں: گلگت بلتستان، خیبر پختونخوا، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کو معاشی فوائد حاصل ہوں گے اور اس سے یقیناً وطنِ عزیز میں مجموعی طور پر خوشحالی کے دور کا آغاز ہوگا۔

بفضلِ تعالیٰ گوادر دنیا کے سب سے بڑے، بحری تجارتی راستے پر واقع ہے جو اپنے قدرتی شاندار محلِ وقوع اور زیرِ تعمیر جدید ترین گہرے پانیوں کی بندرگاہ کے باعث عالمی سطح پر معروف ہے۔ آنے والے وقت میں نہ صرف پاکستان بلکہ چین، افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک کی بحری تجارت کا دارومدار اسی بندرگاہ پر ہوگا اور ہمیں یہ معجزہ دکھانا ہوگا کیونکہ بقول علامہ اقبال ؒ:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا ، وہ ہنر کیا

❁

ڈینگی بخار اور سدِ باب

ایک زمانہ تھا جب ملیریا، چیچک اور طاعون جیسی بیماریاں بھی لاعلاج سمجھی جاتی تھیں لیکن حضرتِ انسان نے تحقیق و تجربات کے ذریعے ان بیماریوں کا علاج دریافت کر لیا۔ جوں جوں سائنس میں ترقی ہو رہی ہے۔ نت نئی بیماریاں اور امراض بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ابھی کچھ برس قبل ''ڈینگی بخار'' کے مرض نے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلایا۔ نسبتاً یہ ایک نئی وبا تھی اور اس ''بخار'' نے اَن گنت جانیں لیں۔ 2011ء میں خاص طور پر لاہور میں ڈینگی بخار کی وبا نے لوگوں کو بہت پریشان کیے رکھا۔

میڈیکل تحقیق کے مطابق یہ بیماری مادہ مچھروں کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے مادہ مچھر سے وجود میں آتی ہے جو

صاف اور گندے پانی میں جنم لیتا ہے۔ یوں تو ملیریا کے مریض چند ہفتوں بخار میں مبتلا رہ کر صحت مند اور تندرست ہو جاتے ہیں لیکن ڈینگی بخار کی جب تک ویکسین ہمارے ہاں دستیاب نہ تھی اس سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ کوئی وائرس نہیں ہے بلکہ ڈینگی مچھر کے کاٹنے سے انسان بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب تک ایک تحقیق کے مطابق گزشتہ نصف صدی سے اس کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ 1994ء میں اس وبا نے پہلے پہل کراچی شہر میں سر اٹھایا تھا۔ 2011ء سے پہلے 2006ء میں لاہور میں ڈینگی بخار نے تباہی مچائی۔ بہت سے افراد ڈینگی بخار سے لقمۂ اجل بن گئے۔ شہر میں ایک دہشت اور خوف و ہراس کا سماں رہا۔ کئی روز تک باقاعدہ تعلیمی اداروں کو بند رکھا گیا۔ اس وقت کی پنجاب حکومت نے اس وبا کے تدارک کے لیے بہت محنت کی۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اس کے سدِ باب اور روک تھام کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ لوگوں کو ڈینگی مچھر کی افزائش روکنے کے لیے گھر گھر ٹیمیں بھیجی گئیں اور گھروں میں مختلف جگہوں پر سپرے کیے گئے۔

ڈینگی کے اسباب اور علامات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈینگی مچھر (Aedes) کی مادہ کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ اس مچھر میں ایسا زہر ہوتا ہے جو جسم میں منتقل ہونے سے انسان شدید بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مریض کو کاٹنے والا مچھر جب یہ زہر صحت مند مریض میں داخل کرتا ہے تو وہ بھی بخار کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھروں میں پائے جانے والے ڈینگی کے جسم پر کالی اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں اور یہ مچھر عموماً سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے کے بعد زیادہ فعال ہوتا ہے۔

ڈینگی بخار کی علامت چار قسم کی ہوتی ہے۔ ان علامات میں سے جب بھی کوئی علامت ظاہر ہو تو فی الفور ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔

یہ مادہ مچھر جسے کاٹتا ہے سات روز میں وہ شخص بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سر اور بدن میں شدید درد محسوس ہوتا ہے اور جوڑ جوڑ دکھنے لگتا ہے۔ ڈینگی بخار میں مبتلا مریض کی توانائی کسی حد تک ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بھوک کم اور پیاس زیادہ لگتی ہے۔ بعض اوقات جی متلانے لگتا ہے۔ قے بھی آ جاتی ہے۔ مریض جسم میں تھکن اور دل میں گھبراہٹ محسوس کرتا ہے۔ یہی نہیں آنکھیں سرخ اور بدن پر سُرخ دانے (دھپڑ) نمایاں ہو جاتے ہیں جن کے سبب خارش بڑھ جاتی ہے۔ ایسا مریض عام طور پر سُستی اور بے چینی کے علاوہ پیٹ میں درد محسوس کرتا ہے۔

ڈینگی کی سب سے خطرناک قسم DHF سے جسے یہ مرض لگ جائے اس کے مسوڑھوں اور جسم کے بعض حصوں سے خون رستا دکھائی دیتا ہے اور پلیٹ لٹس کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

علاج: اس مرض میں مبتلا شخص کو فوری طور پر اپنے معالج سے رجوع کر کے اس کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے اس مرض کے علاج کے لیے مختلف تجاویز جاری کی ہیں۔ اب تو اس کی ویکسین بھی دریافت ہو گئی ہے۔

ڈاکٹروں کے مطابق اس کے لیے خوراک اور احتیاطی تدابیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ خون کا ٹیسٹ ضروری ہوتا ہے۔

مریض کا ہر گھنٹے بعد بخار چیک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر خون کی کمی ہو تو ڈرپ کے علاوہ خون بھی لگایا جاتا ہے۔

ایسے مریضوں کے لیے جوس، پھل اور یخنی (سوپ) وغیرہ زیادہ سودمند ہوتے ہیں۔ حکومت اور عوام مل کر اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس کی احتیاطی تدابیر پر عمل ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو ہر شخص کو خود کو مچھروں سے بچانا چاہیے۔ مچھر دانی کا استعمال لازمی ہے۔ انھیں اپنے بازوؤں، ٹانگوں اور ہاتھ پاؤں کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ مچھر کا سپرے باقاعدگی سے گھروں میں کیا جائے۔

گھروں میں بعض خالی برتنوں، پرانے ٹائروں میں بارش وغیرہ کا پانی جمع نہ ہونے دیا جائے کہ اس سے مچھروں کی افزائش ہوتی ہے۔ مچھر مار دوائیں چھڑکائی جائیں، ماحول کو صاف ستھرا رکھا جائے۔

گھریلو سطح پر گملوں، بوتلوں، برتنوں اور کچرے کے ڈرموں، روم کولرز میں کسی بھی جگہ پانی کھڑا نہیں رکھنا چاہیے۔ حکومت ڈینگی بخار کے لیے بہت سی تدابیر کر رہی ہے۔ عوام کا حکومتی کارندوں سے تعاون ضروری ہے۔

❁

کووِڈ۔19، اسباب، محرکات اور تدارک

ہم اس وقت کووڈ۔19 کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ یہ ایک وبائے عام ہے۔ جس نے تقریباً پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ وبائیں اس سے پہلے بھی انسانی معاشرے پر گزرتی رہی ہیں۔ ان کے پیدا کردہ مسائل اور شرح اموات کا حساب تاریخ کے اوراق میں درج ہے لیکن یہ وبا جس کا سامنا اس وقت اکناف عالم میں پھیلی آبادی کر رہی ہے، اپنی کیفیات اور اثرات میں ایک بالکل الگ تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے پھیلنے والی کسی وبا نے اس طرح پورے خطۂ ارض کو اپنے حصار میں نہیں لیا تھا۔ اب سے پہلے وباؤں میں شرح اموات بے شک اس وبا سے زیادہ ہی رہی ہو لیکن متاثرین کی تعداد یہ نہیں تھی اور وحشت وخوف کی افزونی کا تناسب بھی یہ نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ کرونا سے پہلے وقت تین ادوار میں منقسم تھا: ماضی، حال اور مستقبل۔ اب یہ قبل از کورونا، دورانِ کورونا اور بعد از کورونا ادوار میں تقسیم ہو گیا ہے گویا ہم ایک نئی تقویم میں داخل ہو گئے ہیں۔ دورانِ کورونا میں ہمیں کون سی حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہیں اور بعدِ کورونا ہمیں معاشرے، معیشت، انسانی نفسیات، تعلیم وتدریس اور ادب پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ بھی انھی سطور میں مختصراً مگر جامعیت سے لینا ہے۔

مرض اور وبا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مرض کے ساتھ جینا ممکن ہے مگر وبا کے ساتھ نہیں۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ بنی نوع انسان کا بن بلایا یہ مہمان زیادہ دیر مہمان نہ رہے، گھر کا مستقل فرد بن جائے اور ہمیں اس کے ساتھ جینا مرنا پڑے۔

Covid-19 کورونا وائرس Disease کا مخفف ہے چونکہ یہ وبا 2019ء میں سامنے آئی اس لیے اسے Covid-19

کا نام دے دیا گیا۔ سب سے پہلے نومبر 2019ء میں چین کے صوبے ووہان میں اس مہلک وبا کا ظہور ہوا۔ چین نے سخت لاک ڈاؤن کی موثر حکمت عملی سے اس خوفناک وبا کو ووہان شہر تک محدود کر دیا تاہم چین کے کچھ دوسرے شہر بھی اس وبا سے جزوی طور پر متاثر ہوئے۔ 2019ء کے اواخر اور 2020ء کے شروع میں اس وبا نے دنیا کے مختلف ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سنگاپور، نیوزی لینڈ اور جنوبی کوریا نے اس وبا پر قابو پا لیا مگر اٹلی، برطانیہ اور امریکا نے اس وبا کی طرف بے توجہی برتی تو اس کا انھیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے 26۔ فروری 2020ء کو پاکستان میں کورونا کا پہلا مریض سامنے آیا پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ بالخصوص پاکستانی زائرین جو ایران کے بارڈر تفتان سے بلوچستان میں داخل ہوئے۔ پاکستان میں اس وبا کو تیزی سے پھیلانے کا باعث بنے پھر ہمارا معاشرتی منظر نامہ کچھ اس طرح بنتا چلا گیا کہ بقول حسن عباسی:

کٹ گئی ہیں محفلیں سب، چھن گئے تہوار بھی ہو گئے گھر میں قید یار بھی اغیار بھی
ایسی خاموشی کہ جیسے شہر ساکت ہو گئے بے صدا ہیں کوچے گلیاں بے صدا بازار بھی
ایسی تنہائی کہ منظر بھی اکیلے پڑ گئے ایسا سناٹا کہ گھبرا جائے ہے دیوار بھی

کورونا وائرس یقیناً ایک خوف ناک وبا ہے۔ یاد رہے کہ وبا ہر اُس مرض کو کہتے ہیں جو کسی علاقے یا ملک میں بہت تیزی سے پھیلے اور مرگِ انبوہ کا باعث بنے۔

اس وبائی مرض کی تین اقسام ہوتی ہیں:

1۔ سپوراڈک (Sporadic) 2۔ اپی ڈیمک (Epidemic) 3۔ پینڈیمک (Pandemic)

پہلی قسم کسی خاص گاؤں تک محدود رہتی ہے اور اس پر جلد قابو پا لیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کسی خاص ملک یا معاشرے تک محدود ہوتی ہے اور اسے وہیں تک محدود رکھتے ہوئے ختم کر دیا جاتا ہے۔ تیسری قسم جو ایک خاص معاشرے اور ملک میں پیدا ہوتی ہے اور پھر پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے مثلاً کورونا، سو کورونا ایک Pandemic ہے اور اس کے اثرات کسی بھی وبائی مرض کے پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ یہ وبا اپنا Host تلاش کرے مثلاً کورونا وائرس کا اصل ہوسٹ (Host) چمگادڑ ہے۔ یہ وائرس چمگادڑوں سے انسانوں میں آتا ہے۔ انسان جب کسی ایسی چیز کو مَس کرتا ہے جو چمگادڑوں کے فُضلے سے آلودہ ہوتی ہے یا جب چمگادڑ کا فُضلہ ہوا میں اڑتا ہے تو ارد گرد بسنے والے انسانوں کے نظامِ تنفس میں شامل ہو کر اپنی افزائش نسل کا آغاز کرتا ہے۔

اس طرح ایک Chain Reaction کا آغاز ہوتا ہے اور یہ وائرس ایک سے دوسرے متنفس کے سانس لینے کے نظام میں شامل ہوتا چلا جاتا ہے اور صورت حال جون ایلیا کے الفاظ میں کچھ یوں بنتی چلی جاتی ہے:

اب نہیں کوئی بات خطرے کی
اب سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے

دراصل کورونا وائرس انفیکشن سے پیدا ہونے والا نمونیا ہے۔ اس کی عمومی علامات میں نظامِ تنفس کے مسائل (خشک کھانسی، سانس لینے میں دشواری) نظام انہضام کے مسائل (قے، اسہال) تھکاوٹ شامل ہیں۔ بیماری کی شروعات میں سانس لینے میں دشواری پیش آنا شروع ہو جاتی ہے۔ نظامِ تنفس میں ظاہر ہونے والی ابتدائی علامات ہیں: کھانسی، متلی، قے، اسہال دل کی دھڑکن میں تیزی، سینے میں تکلیف البتہ کچھ مریضوں میں کسی قسم کی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ اس سے بچنے کے لیے ایس او پی پر عمل درآمد ضروری ہے اور لازم ہے کہ ہم ہتھیلی، ہاتھوں کی پشت، انگلیوں اور انگلیوں کے درمیان کے حصے کو کم از کم 15 سیکنڈ تک جراثیم کش صابن سے دھوئیں۔ علاوہ ازیں گھر سے باہر نکلنے پر سرجیکل ماسک کا استعمال ناگزیر ہے۔ مارکیٹ میں فروخت ہونے والے غیر معیاری ماسک کی جگہ N-95 کا استعمال سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم ہجوم میں جانے سے مکمل طور پر گریز کریں اور اگر جانا پڑے تو سماجی فاصلہ کم از کم چھ فٹ رکھیں۔ اپنے گھر کے کمروں کو ہوادار رکھیں، بھری ہوئی لفٹ میں جانے سے Avoid کریں۔ اپنے ہاتھ اور موبائل، چابیاں، کی بورڈ، دروازے کے ہینڈل وغیرہ صاف کرنے کے لیے Sanitizer کا خوب استعمال کریں۔ ان حفاظتی تدابیر پر عمل نہ کرنے سے سمارٹ یا مکمل لاک ڈاؤن کا نفاذ ضروری ہو جائے گا جس کی وجہ سے معاشی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوں گی۔

امریکا، چین، پاکستان اور دیگر ممالک میں اس مہلک مرض کی ویکسین پر تحقیق جاری ہے۔ پاکستان میں چینی ویکسین لگنا شروع ہو گئی ہے۔ امید ہے اس کے مثبت اثرات نکلیں گے۔ بہرکیف موزوں ویکسین کے حصول تک ان حفاظتی تدابیر پر سختی سے عمل درآمد ہی ہمیں اس وائرس سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ کورونا اگر طویل عرصہ رہتا ہے تو یہ یقیناً انسانی معمولات اور عادات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب تجارت اور تعلیم جزوی طور پر آن لائن ہو چکی ہے۔ بعد از کورونا ٹیکنالوجی کی وہ صورت غالب رہے گی جس کا تعلق سائبر سپیس سے ہے۔ انسانی آمد و رفت کم ہوگی تو روایتی نقل و حمل کے پھیلاؤ میں کمی آ جائے گی۔ اب ہوٹلز اور شادی ہالز کے کاروبار پر اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

ہمیں یقینِ کامل ہے کہ کووڈ۔19 کی پیدا کردہ صورتِ حال انسانی احساس اور شعور پر ایسے اثرات مرتب کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے جس کے نتیجے میں اس عہد کے ادب کو کوئی بنیادی سوال فراہم ہو سکے گا۔ کوئی ایسا بنیادی سوال جس کی تفتیش دراصل انسانی کائنات کی معنویت کو نئے سرے سے دیکھنے، اس پر غور کرنے اور اس کو تہ در تہ دیکھنے کا ہمیں موقع فراہم کر سکے۔

اس تحریر کا اختتام ڈاکٹر عمران ظفر کی اس پیروڈی پر کرنا مناسب اور موزوں رہے گا۔

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر میں رہا کرو
یہ وبائے عام کے یوم ہیں، بڑی احتیاط کیا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا، تمھیں دور ہی سے بھگائے گا
کہیں لگ نہ جائے یہ وائرس، ذرا فاصلے سے ملا کرو

یہ جو نزلہ، کھانسی، زکام ہیں یہ علامتیں بڑی عام ہیں
کہیں بڑھ نہ جائے معاملہ ارے جلد ان کی دوا کرو

❁❁

چودھواں باب

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 1

درست جواب پر دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

-1 ''اسلام وعلیکم کے بعد عرض ہے۔'' اس جملے میں:

A املا کی غلطی ہے B واحد جمع کی غلطی ہے C تذکیر و تانیث کی غلطی ہے D محاورہ غلط استعمال ہوا ہے

-2 ''میں نے ہر ممالک کی سیر کی ہے۔'' اس جملے میں کیا غلط ہے؟

A اضافت کا استعمال B واحد جمع کا استعمال C تذکیر و تانیث کا استعمال D محاورے کا استعمال

-3 ''میں نے آج کی اخبار نہیں پڑھی۔'' یہ جملہ غلط ہے، اعتبار سے:

A تذکیر و تانیث کے B امدادی فعل کے C واحد جمع کے D محاورے کے

-4 ''دیکھنے و سننے میں بڑا فرق ہے۔'' یہ جملہ درست ہو سکتا ہے، صحیح استعمال سے:

A ضرب المثل کے B روزمرہ کے C محاورے کے D حرف عطف کے

-5 ''میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔'' یہ جملہ غلط ہے، اعتبار سے:

A اضافت کے B تذکیر و تانیث کے C روزمرہ کے D محاورے کے

-6 ''یہ ہمارے..................صاحب ہیں۔'' درست تلفظ ہے:

A چوہدری B چودھری C چودہری D چوھدری

-7 ''ایک انار ہزار بیمار۔'' یہ جملہ غلط ہے:

A محاورے کے اعتبار سے B روزمرہ کے اعتبار سے C ضرب المثل کے اعتبار سے D مطابقت کی غلطی کی وجہ سے

-8 ''جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار'' اس مصرعے میں امدادی فعل کون سا ہے؟

A ہزار B بار C جانا D پڑا

-9 حیدر آباد، اسلام آباد میں ''آباد'' کس حیثیت میں استعمال ہوا ہے؟

A سابقہ کے طور پر B لاحقہ کے طور پر C مترادف کے طور پر D متضاد کے طور پر

-10 ''بارش آیا چاہتی ہے۔'' اس جملے میں امدادی فعل کون سا ہے؟

A ہے B چاہتی C بارش D آیا

-11 اَن پڑھ، اَن گنت میں ''اَن'' کس حیثیت سے استعمال ہوا ہے؟

A متضاد کے طور پر B مترادف کے طور پر C سابقہ کے طور پر D لاحقہ کے طور پر

12- "صدا عیش دوراں دکھاتا نہیں" اس مصرعے میں:

A املا کی غلطی ہے B واحد جمع کی غلطی ہے C محاورے کی غلطی ہے D روزمرہ کی غلطی ہے

13- "نیکی کا راہ بہت کٹھن ہے۔" اس جملے میں:

A محاورے کی غلطی ہے B حرف عطف کی غلطی ہے C مطابقت کی غلطی ہے D املا کی غلطی ہے

14- "آپ جھوٹ مت بولیں۔" اس جملے میں استعمال ہوا ہے:

A فعل امر B فعل نہی C فعل مضارع D فعل ماضی

15- "ہم آیندہ ہفتے سیر کا پروگرام بنائیں گے۔" اس جملے میں استعمال ہوا ہے:

A فعل ماضی B فعل حال C فعل امر D فعل مستقبل

16- "شاباش! آپ نے نیکی کا کام کیا ہے۔" اس جملے میں استعمال ہوا ہے:

A حرفِ تحسین B حرفِ تشبیہ C حرفِ استفہام D حرفِ تاکید

17- "عزیز طلبہ!" اس جملے میں رموز اوقاف کی علامت استعمال ہوئی ہے:

A سکتہ کی B وقفہ کی C رابطہ کی D ندائیہ کی

18- "امام" کا متضاد ہوتا ہے:

A پیشوا B مقلد C رہبر D راہنما

19- "حرص" کے مترادف کے طور پر لفظ استعمال ہوا ہے:

A طمع B روپیا پیسا C دولت D شہرت

20- "علم اور نیک چلنی انسان کا درجہ بڑھا دیتا ہے۔" اس جملے میں غلطی ہے:

A امدادی فعل کی B محاورے کی C مطابقت کی D حرفِ اضافت کی

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	A	5	C	9	B	13	C	17	D
2	B	6	B	10	B	14	B	18	B
3	A	7	C	11	C	15	D	19	A
4	D	8	D	12	A	16	A	20	C

❀❀

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 2

درست جواب پر دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1- تلخیص (Precis) کیا ہے؟
(A) اقتباس کی تشریح (B) تشریح کا متضاد عمل (C) اقتباس کا بالفاظِ دیگر بیان (D) کوئی بیان درست نہیں

2- ''پیٹ کاٹنا'' محاورہ ہے۔اس کا مفہوم ہے:
(A) پیٹ کا آپریشن کرنا (B) پیٹ میں چھرا گھونپنا (C) خون بہانا (D) اخراجات میں کمی کرنا

3- ''دھان پان ہونا'' محاورہ ہے،اس کے معنی ہیں:
(A) کمربستہ ہونا (B) فربہ اندام ہونا (C) دبلا پتلا ہونا (D) تیز طرار ہونا

4- ''آنکھیں سفید ہونا'' محاورہ ہے۔اس کا مطلب ہے:
(A) سنگ دل ہونا (B) بینائی جاتے رہنا (C) بے حیا ہونا (D) ضعیف العمر ہونا

5- روزمرّہ کے ضروری ہے کہ وہ:
(A) محاورہ بھی ہو (B) اپنے حقیقی معنی دے (C) اپنے مجازی معنی دے (D) قواعد کے مطابق ہو

6- اصنافِ نظم میں رباعی کتنے مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے؟
(A) صرف دو مصرعوں پر (B) چار مصرعوں پر (C) پانچ مصرعوں پر (D) چھے مصرعوں پر

7- کس ڈراما نگار کو انڈین شیکسپیر (Indian Shakespear) کہا جاتا ہے؟
(A) امتیاز علی تاج کو (B) میرزا ادیب کو (C) آغا حشر کو (D) امانت لکھنوی کو

8- ''نعت'' ایسی صنفِ نظم ہے،جس میں تعریف وتوصیف ہو:
(A) صحابہ کرام ؓ کی (B) اللہ تعالیٰ کی (C) رسول اکرم ﷺ کی (D) کوئی بیان درست نہیں

9- اردو میں سب سے زیادہ سرمایہ کس صنفِ نظم کا ہے؟
(A) قصیدہ کا (B) مرثیہ کا (C) مثنوی کا (D) غزل کا

10- کون سا جملہ درست ہے؟
(A) دنیا کے ہر ممالک میں یہی دستور ہے۔
(B) دنیا کے ہر ایک ممالک میں یہی دستور ہے۔
(C) دنیا کے ہر ملک میں یہی دستور ہے۔
(D) دنیا کے ایک ایک ممالک میں یہی دستور ہے۔

11- کون سا جملہ درست ہے؟
(A) محنت کرو ورنہ فاقے مرو گے۔
(B) محنت کرو ورنہ فاقوں مرو گے۔
(C) محنت کرو ورنہ فاقے سے مرو گے۔
(D) محنت کرو ورنہ فاقے کے ساتھ مرو گے۔

bdul Rauf Khokher M.Phil Urdu

12- درست جملے کی نشان دہی کیجیے۔

(A) بخیریت سے ہوں۔ (B) بعافیت سے ہوں۔ (C) بخریت وعافیت سے ہوں۔ (D) بخیریت وعافیت ہوں۔

13- اردو میں حروف تہجی (Alphabet) بشمول ہمزہ تعداد کتنی ہے؟

(A) 26 (B) 32 (C) 37 (D) 40

14- ابلاغ(Communication) کا لفظ "بَلَغَ" سے ماخوذ ہے اس کے معنی کیا ہیں؟

(A) بھیجنا یا پہنچانا (B) صبر وشکر کرنا (C) آواز دینا (D) اشارے کنائے کرنا

15- رموز اوقاف(Punctuation) میں سب سے کم توقف کے لیے علامت استعمال ہوتی ہے:

(A) سکتہ کی (B) وقفہ کی (C) رابطہ کی (D) ختمہ کی

16- ضرب المثل درست کیجیے:

(A) ایک انار ہزار بیمار (B) ایک انار لاکھ بیمار (C) ایک انار ایک ہی بیمار (D) ایک انار سو بیمار

17- کون سی ضرب المثل درست ہے؟

(A) وہی ڈھاک کا ایک پات (B) وہی ڈھاک کے تین پات (C) وہی ڈھاک کے دو پات (D) وہی ڈھاک کے چار پات

18- ہجوں کے اعتبار سے کون سا لفظ درست ہے؟

(A) چوہدری (B) چوھدری (C) چودھری (D) چودہری

19- خیراندیش، بداندیش، مصلحت اندیش، دوراندیش، غلط اندیش میں "اندیش" کی علامت کو قواعد کی رو سے کیا کہتے ہیں؟

(A) سابقہ (B) لاحقہ (C) سابقہ اور لاحقہ دونوں (D) کوئی جواب درست نہیں

20- بلندمرتبہ، بلندنظر، بلندہمت، بلنداقبال، بلندفطرت میں "بلند" کون سی علامت ہے؟

(A) سابقہ (B) لاحقہ (C) سابقہ اور لاحقہ دونوں (D) کوئی جواب درست نہیں

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	B	5	B	9	D	13	C	17	B
2	D	6	B	10	C	14	A	18	C
3	C	7	C	11	B	15	A	19	B
4	B	8	C	12	D	16	D	20	A

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 3

درست جواب پر دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

-1 کسی عبارت کی تلخیص کرنے کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ تلخیص اصل عبارت کے:

(A) ایک چوتھائی کے قریب ہو (B) ایک تہائی کے قریب ہو (C) نصف کے قریب ہونی چاہیے (D) برابر ہونی چاہیے

-2 ''شیطان کی آنت ہونا'' محاورہ ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟

(A) بھوکا رہنا (B) شرارتی ہونا (C) طویل ہونا (D) ہر وقت سر پر مسلط رہنا

-3 ''قدم لینا'' محاورہ ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟

(A) خوب خبر لینا (B) لمبے لمبے ڈگ بھرنا (C) قدم اٹھانے کا آغاز کرنا (D) تعظیم کی خاطر جھکنا

-4 ''سبز قدم ہونا'' محاورہ ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟

(A) مبارک ہونا (B) چاروں طرف سبزہ ہونا (C) سنسان ہونا (D) منحوس ہونا

-5 ''اردو'' کس زبان کا لفظ ہے؟

(A) سنسکرت کا (B) عربی کا (C) فارسی کا (D) ترکی کا

-6 علامہ اقبال کی معروف نظموں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کی ہیئت کیا ہے؟

(A) مربع (B) مخمس (C) مسدّس (D) مثمن

-7 کون سی شخصیت ''بابائے اردو'' کے لقب سے ملقب ہے؟

(A) سر سید احمد خاں (B) ڈاکٹر سید عبداللہ (C) خواجہ الطاف حسین حالی (D) مولوی عبدالحق

-8 ٹیپ کا شعر کسے کہتے ہیں؟

(A) نظم کا پہلا شعر (B) نظم کا آخری شعر (C) نظم کا دل آویز شعر (D) بار بار دہرایا جانے والا شعر

-9 ''حمد'' ایسی صنفِ نظم ہے جس میں:

(A) رسول کریم کی تعریف ہو (B) صحابہ کرامؓ کی تعریف ہو (C) اللہ تعالیٰ کی تعریف ہو (D) بندوں کی خدا سے حاجت طلبی

-10 کون سا جملہ درست ہے؟

(A) میں آپ کا شکر گزار ہوں (B) میں آپ کا مشکور ہوں (C) میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں (D) میں آپ کا شاکر ہوں

-11 کون سا جملہ درست ہے؟

(A) آپ بمع اہل و عیال تشریف لائیں (B) آپ مع اہل و عیال تشریف لائیں
(C) آپ بمع اہلِ عیال تشریف لائیں (D) آپ مع اہلِ عیال تشریف لائیں

12- کون سا جملہ درست ہے؟
(A) وہ یہ خبر سن کر گم سم ہو گیا (B) وہ یہ خبر سن کر سم گم ہو گیا (C) وہ یہ خبر سن کر گم صم ہو گیا (D) وہ یہ خبر سن کر صم گم ہو گیا

13- محاورہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ:
(A) اپنے مجازی معنی دے (B) اپنے حقیقی معنی دے (C) فقط ایک لفظ پر مشتمل ہو (D) فقط دو لفظوں پر مشتمل ہو

14- ابلاغ کی اہم ترین قسم ہے؟
(A) ذاتی ابلاغ (B) دوطرفہ ابلاغ (C) گروہی ابلاغ (D) ابلاغ عامہ

15- رموز اوقاف کے اعتبار سے لفظِ معترضہ یا جملہ معترضہ کے لیے علامت استعمال ہوتی ہے:
(A) وقفہ (B) رابطہ (C) واوین (D) قوسین

16- کسی قائل کا قول من و عن اُسی کے الفاظ میں درج کرنے کے لیے رموز اوقاف کی علامت استعمال ہوتی ہے:
(A) تفصیلیہ (B) فجائیہ (C) قوسین (D) واوین

17- کون سا جملہ درست ہے؟
(A) دنیا کے ہر مما لک میں یہی دستور ہے (B) دنیا کے ہر ایک مما لک میں یہی دستور ہے۔
(C) دنیا کے ہر ملک میں یہی دستور ہے (D) دنیا کے ایک ایک ملک میں یہی دستور ہے۔

18- ضرب المثل میں خالی جگہ پُر کیجیے: ''روزے رکھے غریبوں نے تو دن..........ہو گئے۔''
(A) آسان (B) بھاری (C) بڑے (D) چھوٹے

19- کم نظر، کم ظرف، کم ہمت، کم عقل، کم گو میں ''کم'' کو کیا کہیں گے؟
(A) سابقہ (B) لاحقہ (C) سابقہ اور لاحقہ دونوں (D) کوئی جواب درست نہیں

20- حیرت انگیز، عبرت انگیز، درد انگیز، فکر انگیز، فتنہ انگیز میں ''انگیز'' کون سی علامت ہے؟
(A) لاحقہ (B) سابقہ (C) سابقہ اور لاحقہ دونوں (D) کوئی جواب درست نہیں

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	B	5	D	9	C	13	A	17	C
2	C	6	C	10	A	14	D	18	C
3	D	7	D	11	B	15	D	19	A
4	D	8	D	12	C	16	D	20	A

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 4

درست جواب پر دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1- ابلاغ کی بالعموم اقسام بیان کی جاتی ہیں:

(A) چار (B) پانچ (C) دو (D) آٹھ

2- مطلع کے معانی ہیں:

(A) دروازے کا پٹ (B) طلوع ہونے کی جگہ (C) قطع ہونے کی جگہ (D) موتیوں کو لڑی میں پرونا

3- تشبیب ابتدائی حصہ ہے:

(A) مرثیے کا (B) نظم کا (C) قصیدے کا (D) منقبت کا

4- مخمس کے معانی ہیں:

(A) چار (B) دو (C) تین (D) پانچ

5- "مرآۃ العروس" ناول کے مصنف کا نام ہے؟

(A) سرسید احمد خاں (B) ڈپٹی نذیر احمد (C) مولانا الطاف حسین حالی (D) مولانا عبدالحلیم شرر

6- اردو ڈرامے کی تاریخ میں یہ نام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے:

(A) آغا حشر کاشمیری (B) اشفاق احمد (C) حسینہ معین (D) انتظار حسین

7- اپنی زندگی کے حالات و واقعات کا بیان کہلاتا ہے:

(A) خاکہ (B) سفرنامہ (C) سوانح عمری (D) آپ بیتی

8- مکتوب سے مراد ہے:

(A) ہنسنا ہنسانا (B) ڈھانچہ (C) خط (D) کاتب

9- "آنکھیں سفید ہونا" سے مراد ہے:

(A) اندھا ہو جانا (B) نظریں بچانا (C) شرمندہ ہو جانا (D) بے وفائی کرنا

10- "خدا لگتی کہنا" سے مراد ہے؟

(A) مطمئن رہنا (B) انصاف کی بات کہنا (C) بہت جستجو کرنا (D) تسلی دینا

11- "آپ کاج مہا کاج" قواعد کی رُو سے ہے:

(A) محاورہ (B) ضرب المثل (C) روزمرہ (D) اقوالِ زریں

12- ضرب المثل میں خالی جگہ پُر کریں۔ "یہ مُنھ اور .... کی دال"

(A) چنے (B) ماش (C) مسور (D) مونگ

13- درج ذیل میں درست جملے کی نشاندہی کیجیے:

(A) ہم ہردن سیر کو جاتے ہیں
(B) ہم روزروز سیر کو جاتے ہیں
(C) ہم آئے دن سیر کو جاتے ہیں
(D) ہم ہرروز سیر کو جاتے ہیں

14- "سکتہ" کو انگریزی میں کہا جاتا ہے:

Colon & Dash(A) Semi Colon (B) Comma(C) Colon (D)

15- تلخیص اصل اقتباس کے............سے زیادہ ہرگز نہیں ہونی چاہیے؟

(A) ایک تہائی (B) ایک چوتھائی (C) نصف (D) کوئی جواب درست نہیں

16- خبر سے مراد ہے:

(A) تازہ ترین واقعہ کی رپورٹ
(B) واقعات کا تسلسل سے بیان
(C) اظہار کا مؤثر ترین ذریعہ
(D) علم وفن کا سرمایہ

17- خبر کی ترتیب کے عام طور پر..........طریقے استعمال کیے جاتے ہیں:

(A) چار (B) دو (C) چھے (D) تین

18- تشہیر کا مقصد ہے:

(A) عوام کو تفریح بہم پہنچانا (B) رسم ورواج کی ترویج (C) عوام کو معلومات پہنچانا (D) واقعات کی خبر دینا

19- کہانی کے بنیادی مآخذ ہیں:

(A) چار (B) پانچ (C) دو (D) تین

20- ڈراما کے معانی ہیں:

(A) کچھ کرکے دکھانا (B) کہانی سنانا (C) ناچ گانا کرنا (D) موسیقی سنانا

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	A	6	A	11	B	16	A
2	B	7	D	12	C	17	A
3	C	8	C	13	D	18	C
4	D	9	A	14	C	19	D
5	B	10	B	15	A	20	A

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 5

درست جواب پر دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1- ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان تھی

(A) اردو (B) فارسی (C) ہندی (D) عربی

2- اردو کے معنی ہیں:

(A) لشکر (B) جماعت (C) گروہ (D) ریاست

3- ابلاغ ماخوذ ہے:

(A) عربی زبان سے (B) فارسی زبان سے (C) ہندی زبان سے (D) اردو زبان سے

4- ابلاغ کی اقسام ہیں:

(A) تین (B) پانچ (C) چار (D) دو

5- مصرع سے مراد ہے:

(A) کھڑکی (B) دروازہ (C) چھت (D) دروازے کا ایک پٹ

6- مقطع کے لغوی معنی ہیں:

(A) قطع ہونے کی جگہ (B) طلوع ہونے کی جگہ (C) گھوڑے پر سوار کے پیچھے والا آدمی (D) آدھا شعر یا بیت

7- نظم ....زبان کا لفظ ہے:

(A) فارسی زبان کا (B) عربی زبان کا (C) اردو زبان کا (D) ہندی زبان کا

8- مرثیے کے حصے ہوتے ہیں:

(A) نو (B) آٹھ (C) چار (D) پانچ

9- مُسدس کا لفظ "سُدس" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں:

(A) چھے (B) پانچ (C) چار (D) سات

10- نظمِ مُعرّیٰ کو انگریزی میں کہا جاتا ہے:

(A) Blank Verse (B) Free Verse (C) Sonnet (D) Blank Poem

11- کہنے کی چیز کو کہتے ہیں:

(A) ڈراما (B) تمیز (C) ارادہ (D) کہانی

-12 ناول کے معنی ہیں:

(A) نیا یا اچھوتا (B) پُرکشش (C) انسان (D) دلچسپ

-13 سوانح کا لفظ جمع ہے:

(A) مرثیہ کی (B) قصیدے کی (C) سانحہ کی (D) خاکے کی

-14 ''آب آب ہونا'' کے معانی ہیں:

(A) خوش ہونا (B) شرمندہ ہونا (C) ذلیل کرنا (D) عزت کرنا

-15 ''بات رہ جانا'' کے معانی ہیں:

(A) حیلے بہانے کرنا (B) امید پوری کرنا (C) عزت رہ جانا (D) بے حد خوش ہونا

-16 کون سا جملہ درست ہے:

(A) یہ چیخ وپکار کیسی ہے؟ (B) یہ چیخ پکار کیسی ہے؟ (C) یہ چیخنا وپکارنا کیسا ہے (D) یہ چیخ اور پکار کیسی ہے؟

-17 تلخیص میں الفاظ استعمال کرنے چاہئیں:

(A) عام فہم (B) مشکل (C) جامع (D) غیر واضح

-18 خبر کے ابتدائی حصے کو کہتے ہیں:

(A) ابتدائیہ (B) متن (C) مغز (D) خبر

-19 خبر بنیادی طور پر مشتمل ہوتی ہے:

(A) تین حصوں پر (B) دو حصوں پر (C) ایک حصے پر (D) چار حصوں پر

-20 تشہیر کے معنی ہیں:

(A) خبر دینا (B) انوکھی بات کرنا (C) نئی بات کرنا (D) مشہور کرنا

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	B	6	A	11	D	16	B
2	A	7	B	12	A	17	C
3	A	8	A	13	C	18	A
4	C	9	A	14	B	19	B
5	D	10	A	15	C	20	D

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 6

سوال نمبر (ا): درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1۔ ''آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔'' اس جملے میں غلطی ہے:

A زائد لفظ کی B واحد جمع کی C تذکیر و تانیث کی D محاورے کی

2۔ ''لاہور سے سیالکوٹ سو میلوں کا فاصلہ ہے۔'' اس جملے میں غلط استعمال ہوا ہے:

A اضافت B روزمرہ C تذکیر و تانیث D محاورہ

3۔ ''میں نے زخم پر مرہم لگائی۔'' یہ جملہ غلط ہے، اعتبار سے:

A تذکیر و تانیث کے B امدادی فعل کے C واحد جمع کے D مترادف کے

4۔ ''حساب و کتاب ٹھیک رکھو۔'' یہ جملہ درست ہو سکتا ہے، صحیح استعمال سے:

A ضرب المثل کے B روزمرہ کے C محاورے کے D حرف عطف کے

5۔ ''گھر عورت کی سلطنت ....'' مطابقت کے اعتبار سے جملہ درست کرتے ہوئے خالی جگہ پُر کیجیے۔

A ہوتی ہے۔ B ہوتے ہیں۔ C ہوتا ہے۔ D ہوتیں ہیں۔

6۔ ''وہ میری .... ہے۔'' میں درست لفظ ہے:

A ہمشیرہ B ہمشیر C ہمشیراں D ہمشیرگان

7۔ ''ان دونوں بہنوں میں بس اٹھارہ انیس کا فرق ہے۔'' یہ جملہ غلط ہے، اعتبار سے:

A محاورے کے B روزمرہ کے C ضرب المثل کے D مطابقت کے

8۔ ''سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔'' اس مصرعے میں امدادی فعل کون سا ہے؟

A سنگ B شخص C اٹھا D رکھا

9۔ ''شاہ رُخ، ماہ رُخ، میں ''رُخ'' کس حیثیت میں استعمال ہوا ہے؟

A سابقہ کے طور پر B لاحقہ کے طور پر C مترادف کے طور پر D متضاد کے طور پر

10۔ ''کسی شام گھر بھی رہا کرو'' اس مصرعے میں امدادی فعل کون سا ہے؟

A کسی B شام C کرو D رہا

11۔ ''پیش لفظ، پیش بندی، پیش کش، میں ''پیش'' کس طور پر استعمال ہے:

A متضاد کے طور پر B مترادف کے طور پر C سابقہ کے طور پر D لاحقہ کے طور پر

12۔ ''شرافت اس خاندان کا خاصا ہے۔'' اس جملے میں:

A املا کی غلطی ہے B واحد جمع کی غلطی ہے C محاورے کی غلطی ہے D روزمرہ کی غلطی ہے

13۔ ''زیادہ چار پانچ مت کرو، بس اپنے کام سے کام رکھو۔'' اس جملے میں غلطی ہے:

A محاورے کی B حرف عطف کی C مطابقت کی D املا کی

14۔ ''ماں باپ کی خدمت کیا کرو۔'' اس جملے میں فعل استعمال ہوا ہے:

A فعل امر B فعل نہی C فعل مضارع D فعل ماضی

15۔ ''ایک دفعہ کا ذکر ہے۔'' اس جملے میں فعل استعمال ہوا ہے:

A فعل مستقبل B فعل حال C فعل امر D فعل ماضی

16۔ ''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔'' اس مصرعے میں حرف استعمال ہوا ہے:

A حرف تحسین B حرف تشبیہ C حرف استفہام D حرف تاکید

17۔ ''لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟'' اس مصرع میں رموز اوقاف کی علامت استعمال ہوئی ہے:

A سکتہ کی B وقفہ کی C سوالیہ کی D ندائیہ کی

18۔ ''عوام'' کا متضاد ہے:

A رہنما B امرا C سیاست دان D خواص

19۔ ''آرزو'' کے مترادف کے طور پر لفظ استعمال ہوا ہے:

A آبرو B خواہش C اداکارہ D شہرت

20۔ ''قلم دوات یہاں رکھے ہیں۔'' اس جملے میں غلطی ہے:

A امدادی فعل کی B محاورے کی C مطابقت کی D حرف اضافت کی

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	A	5	B	9	B	13	A	17	C
2	B	6	A	10	C	14	A	18	D
3	A	7	B	11	C	15	B	19	B
4	D	8	C	12	A	16	B	20	C

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 7

سوال نمبر (ا): درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1۔ "مجھے ایک ضروری کام پڑھ گیا ہے۔" اس جملے میں غلطی ہے:

A املا کی　B واحد جمع کی　C تذکیر و تانیث کی　D محاورے کی

2۔ "دونوں فریقین کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔" اس جملے میں غلط ہے:

A اضافت کا استعمال　B زائد لفظ کا استعمال　C تذکیر و تانیث کا استعمال　D محاورے کا استعمال

3۔ "مرض بڑھتی گئی جوں جوں دوا کی۔" یہ مصرع غلط ہے، اعتبار سے:

A تذکیر و تانیث کے　B امدادی فعل کے　C واحد جمع کے　D مترادف کے

4۔ "یہ چیخ و پکار کیسی ہے؟" یہ جملہ درست ہو سکتا ہے، صحیح استعمال سے:

A ضرب المثل کے　B روزمرہ کے　C محاورے کے　D حرفِ عطف کے

5۔ "زندگی کھیل اور تماشا۔۔۔" مطابقت کے اعتبار سے جملہ درست کرتے ہوئے خالی جگہ پُر کیجیے۔

A ہوتی ہے　B ہوتے ہیں　C ہوتا ہے　D ہوتیں ہیں

6۔ خالی جگہ پُر کیجیے: ایک انار............بیمار

A سو　B ہزار　C ہزاروں　D لاکھ

7۔ "ان دونوں کی عمروں میں بس اٹھارہ انیس کا فرق ہے۔" یہ جملہ غلط ہے:

A محاورے کے اعتبار سے　B روزمرہ کے اعتبار سے　C ضرب المثل کے اعتبار سے　D مطابقت کی غلطی کی وجہ سے

8۔ "ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے" اس مصرعے میں امدادی فعل ہے:

A پا　B سکے　C ارض و سما　D کہاں تری وسعت کو

9۔ "اَن پڑھ، اَن گنت، اَن ہونی میں "اَن" کس حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

A سابقہ کے طور پر　B لاحقہ کے طور پر　C مترادف کے طور پر　D متضاد کے طور پر

10۔ "جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار" اس مصرعے میں امدادی فعل ہے:

A جانا　B پڑا　C ہزار بار　D رقیب کے در پر

11۔ خیر اندیش، بد اندیش، دُور اندیش میں "اندیش" کس حیثیت سے استعمال ہوا ہے؟

A متضاد کے طور پر　B مترادف کے طور پر　C سابقہ کے طور پر　D لاحقہ کے طور پر

12۔ رموزِ اوقاف (Punctuation) میں سب سے کم توقف کے لیے کون سی علامت آتی ہے؟

A سکتہ (Comma) B رابطہ (Colon) C ختمہ (Full stop) D وقفہ (Semi-colon)

13۔ ضرب المثل میں خالی جگہ پُر کریں: "یہ منہ اور .... کی دال"

A چنے B ماش C مسور D مونگ

14۔ تلخیص اصل اقتباس کی ہونی چاہیے:

A ایک تہائی B ایک چوتھائی C دوگنا D تین گنا

15۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے۔" اس جملے میں فعل استعمال ہوا ہے:

A فعل مستقبل B فعل حال C فعل امر D فعل ماضی

16۔ کسی قائل کا قول من و عن اسی کے الفاظ میں درج کرنے کے لیے رموز اوقاف کی علامت آتی ہے:

A رابطہ B فجائیہ C قوسین D واوین

17۔ محاورہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ:

A اپنے حقیقی معنی دے B اپنے مجازی معنی دے C فقط ایک لفظ پر مشتمل ہو D فقط دو لفظوں پر مشتمل ہو

18۔ دنیا بھر میں ابلاغ عامہ کا مؤثر ترین ہتھیار ہے

A ذاتی ابلاغ B دو طریقہ ابلاغ C گروہی ابلاغ D ابلاغ عامہ

19۔ "حرص" کے مترادف کے طور پر لفظ استعمال ہوا ہے:

A طمع B روپیا پیسا C دولت D شہرت

20۔ انگریزوں نے اپنے عمال اور حکام کو سکھانے کے لیے زبان کا انتخاب کیا تھا:

A ترکی کا B عربی کا C فارسی کا D اردو کا

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	A	5	A	9	A	13	C	17	B
2	B	6	A	10	B	14	A	18	D
3	A	7	B	11	D	15	B	19	A
4	D	8	B	12	A	16	D	20	C

معروضی طرز ماڈل پیپر نمبر 8

سوال نمبر (ا): درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔ کاٹ کر یا کسی بھی طریقے سے مٹا کر لکھا ہوا جواب غلط تصور کیا جائے گا۔

1- "اردو زبان کا ارتقا" کس کی تصنیف ہے؟
(A) ڈاکٹر مہر عبدالحق (B) شوکت سبزواری (C) ڈاکٹر طاہر تونسوی (D) سراج الدین خان آرزو

2- اردو کس زبان کا لفظ ہے؟
(A) عربی (B) سنسکرت (C) فارسی (D) ترکی

3- میر امن دہلوی کی مشہور تصنیف (داستان) کا نام ہے:
(A) باغ و بہار (B) قصہ چہار درویش (C) توتا کہانی (D) گل بکاؤلی

4- سراج الدین خان آرزو مشہور تھے بطور:
(A) نقاد (B) افسانہ نویس (C) لغت نویس (D) ناول نگار

5- ماسٹر رام چند کس کالج یونیورسٹی سے وابستہ تھے؟
(A) دہلی کالج (B) علی گڑھ یونیورسٹی (C) فورٹ ولیم کالج (D) گورنمنٹ کالج لاہور

6- "عرب اور ہند کے تعلقات" کس کی مشہور تصنیف ہے؟
(A) شبلی نعمانی (B) سرسید احمد خان (C) مولانا محمد حسین آزاد (D) مولانا سید سلیمان ندوی

7- "اردو سندھی کے لسانی روابط" کے مصنف کون ہیں؟
(A) ڈاکٹر اشرف الدین اصلاحی (B) شوکت سبزواری (C) حیدر بخش حیدری (D) ڈاکٹر جمیل جالبی

8- "گزشتہ لکھنؤ" مولانا عبدالحلیم شرر کی مشہور تصنیف کا موضوع ہے:
(A) لکھنؤ کا تمدن اور معاشرہ (B) لکھنؤ کی قدیم تاریخ (C) واجد علی شاہ کے زمانے کا لکھنؤ (D) تاریخ شاہان اودھ

9- "فسانہ عجائب" کی وجہ شہرت ہے:
(A) سہل اور آسان عبارت (B) مافوق الفطرت معاشرت (C) لکھنوی مجلسی زندگی کی رنگارنگی (D) مسجع مقفی اسلوب

10- "باغ و بہار" میں زمانے کی تہذیب نظر آتی ہے:
(A) میر امن سے قبل کے (B) مغلوں کے (C) شاہان اودھ کے (D) باغ و بہار کی تصنیف کے

11- اردو کے پہلے ناول نگار کا نام ہے:
(A) مرزا ہادی بیگ رسوا (B) راشد الخیری (C) ڈپٹی نذیر احمد (D) رشید احمد صدیقی

12- اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے:

(A) نکاتِ سخن (B) آبِ حیات (C) مقدمہ شعروشاعری (D) خم خانہ جاوید

13- ''دکن میں اردو'' کے مصنف ہیں:

(A) نصیرالدین ہاشمی (B) مولوی عبدالحق (C) ابواللیث صدیقی (D) محی الدین قادری زور

14- ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان تھی:

(A) اردو (B) فارسی (C) ہندی (D) عربی

15- اردو کے معنی ہیں:

(A) جماعت (B) لشکر (C) گروہ (D) ریاست

16- کون سی شخصیت کو ''بابائے اردو'' کہا جاتا ہے:

(A) سرسید احمد خاں (B) خواجہ الطاف حسین حالی (C) مولوی عبدالحق (D) مولانا شبلی نعمانی

17- ''مراۃ العروس'' ناول کے مصنف کا نام ہے:

(A) راشد الخیری (B) عبداللہ حسین (C) ڈپٹی نذیر احمد (D) مولانا عبدالحلیم شرر

18- ''آرائش محفل'' کے مصنف ہیں:

(A) حیدر بخش حیدری (B) خلیل خاں اشک (C) مظہر علی ولا (D) میرامن دہلوی

19- رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' لکھی:

(A) 1825ء میں (B) 1830ء میں (C) 1857ء میں (D) 1901ء میں

20- ''فردوس بریں'' کے مصنف ہیں:

(A) ڈپٹی نذیر احمد (B) مولانا عبدالحلیم شرر (C) شوکت صدیقی (D) مرزا ہادی بیگ رسوا

KEY

Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS	Q.NO	ANS
1	B	5	A	9	D	13	A	17	C
2	D	6	D	10	C	14	B	18	A
3	A	7	A	11	C	15	B	19	A
4	C	8	A	12	A	16	C	20	B

داغ دہلوی نے کس قدر درست کہا ہے:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

از روئے انصاف دیکھا جائے تو حقیقت بھی یہی ہے کہ بشمول اردو کسی بھی زبان کا سیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا، جتنا سمجھ لیا جاتا ہے، کیوں کہ ہر زبان کا اپنا مزاج اور اپنا رواج ہوتا ہے اور اُس سے صحیح معنوں میں شناسائی حاصل کرنے کے لیے اہل زبان کی تحریروں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان کی بنیادی گرامر اور دیگر لسانی لوازمات پر نظر کرنا بھی ضروری قرار پاتا ہے۔

زبان کسی بھی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم نہ صرف اپنی زبان پر فخر کرتی ہے بلکہ اس کے فروغ و ارتقا کے لیے ہر آن کوشاں بھی رہتی ہے۔ ہمیں اردو کو، جس کا شمار دنیا کی بڑی اور اہم ترین زبانوں میں ہوتا ہے، ایک قومی اثاثے کے طور پر اپنانے، سیکھنے اور بولنے میں فخر محسوس کرنا چاہیے۔

معروف ماہر تعلیم و لسانیات ڈاکٹر علی محمد خاں، ڈاکٹر اختر شمار اور ڈاکٹر نورین کھوکھر نے اپنے رفقائے کار کے تعاون سے اردو زبان کے قارئین خصوصاً ایف سی کالج (یونیورسٹی)، پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی اور ان سے ملحق اداروں کے علاوہ مرکز اور پنجاب بھر کی ان تمام یونیورسٹیوں کے بی ایس آنرز کے طلبہ و طالبات کے لیے اردو نصاب کی صورت میں جو تحفہ دیا ہے، قومی زبان سے محبت کرنے والے اسے یقیناً سرآنکھوں پر لیں گے۔ مزید برآں اس کتاب کو پی ایم ایس اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے مقابلوں کے دیگر سطح کے تمام امیدوار بھی بڑی مفید اور کارآمد پائیں گے۔

ڈاکٹر نجیب جمال

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

(پروفیسرز ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور)

ILMI KITAB KHANA

Kabir Street, Urdu Bazar, Lahore

www.ilmikitabkhana.com

042-37353510, 37248129

www.facebook.com/ilmikitabkhana

bdul Rauf Khokher M.Phil Urdu